اسلام اور ہماری زندگی

(مجموعہ خُطبات وتحریرات)

جلد نمبر ۱

اسلامی عقائد



شیخ الاسلام مفتی مُحمّد تقی عثمانی دامت برکاتہم

اِدارہ اِسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے ہم افراط و تفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کرسکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔



اسلام اور ہماری زندگی

اسلامی عقائد

جلد ۱

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خُطبات وتحریرات

جلد ۱

اسلامی عقائد

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا مُحمّد تقی عثمانی دامت برکاتہم

اِدارۂ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور ★ ۱۹۰، انارکلی، لاہور، پاکستان ★ موہن روڈ چوک اُردو بازار، کراچی
فون ۳۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۳۴۸۵ فون ۳۷۲۲۳۹۹۱، ۳۷۳۵۳۲۵۵ فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

نام کتاب

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات وتحریرات

جلد اول

اسلامی عقائد

اشاعت اول

جمادی الثانی ۱۴۳۱ھ — جون ۲۰۱۰ء

ادارہ اسلامیات

پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

۱۴۔دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور فون ۳۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۴۷۸۵+

۱۹۰- انارکلی، لاہور- پاکستان ــــــ فون ۳۷۲۲۳۹۹۱ - ۳۷۳۵۳۲۵۵

موہن روڈ، چوک اردو بازار، کراچی- پاکستان ــــ فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

www.idaraeislamiat.com

E-mail:idara.e.islamiat@gmail.com

ملنے کے پتے

ادارۃ المعارف، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر۱۴

مکتبہ معارف القرآن، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر۱۴

مکتبہ دار العلوم، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر۱۴

ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ اردو بازار، کراچی

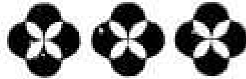
دار الاشاعت، اردو بازار، کراچی نمبر۱

بیت القرآن، اردو بازار، کراچی نمبر۱

بیت العلوم، نابھہ روڈ، لاہور

فہرست مضامین

ایمانِ کامل کی چار علامتیں



عرضِ مرتب

حضرت مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم کے نام نامی اور ذات گرامی کو نہ کسی تعارف کی ضرورت ہے اور نہ ان کے علمی اور عملی کارنامے کسی سے ڈھکے چھپے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی شخصیت میں جو کشش رکھی ہے اور آپ کے علمی اور عملی فیوض کے جو چشمے عالم اسلام میں جاری ہیں وہ محض اللہ تعالیٰ ہی کی دین ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی باتیں زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچیں اور ان سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا جائے۔ کچھ عرصے قبل ادارہ اسلامیات کے جناب سعود عثمانی صاحب نے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ مولانا مدظلہم کے وہ خطبات اور تحریریں جو عام اور روزمرہ زندگی سے متعلق ہیں اور جن کو اصلاح ذات اور اصلاح معاشرہ میں خاص اہمیت حاصل ہے اور جن کی بدولت ہزاروں لوگوں کی زندگیوں میں انقلاب بپا ہوا ہے، اضافوں کے ساتھ موضوعاتی ترتیب سے یکجا ہو جائیں تو ان سے استفادہ بہت آسان ہو جائے گا۔ ان کی تحریک پر میں نے بنام تعالیٰ اس کام کا آغاز کر دیا اور سال ہا سال کی محنت کے بعد الحمدللہ یہ کام آپ کے سامنے ہے۔ جس کی چند نمایاں خصوصیات درج ذیل ہیں۔

''اسلام اور ہماری زندگی'' شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کی ''تحریرات اور خطبات'' کا مجموعہ ہے، جس میں تمام شعبہ ہائے زندگی سے متعلق آپ کی لازوال علمی تحریرات اور پرسوز خطبات کو خاص ترتیب اور سلیقہ سے جمع کیا گیا ہے اور اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ مجموعہ درج ذیل خصوصیات کا حامل ہو:

1- موضوعات کی جلدوں میں تحدید، یعنی ہر موضوع سے متعلق مواد ایک جلد میں یکجا کر دیا گیا ہے، جس کی وجہ سے قاری کے لئے اپنے مطلوبہ مضامین تک رسائی اور اس سے استفادہ انتہائی آسان ہو گیا ہے۔ بعض اوقات قاری کو ایک ہی موضوع پر معلومات درکار ہوتی ہیں، اب اس کی ضرورت آسانی سے پوری ہو سکے گی۔

2- قرآن مجید کی تمام آیات کے حوالے درج کئے گئے اور ان پر مکمل اعراب لگا دیئے گئے ہیں۔

3- احادیث نبویہ کے مکمل حوالے درج کر دیئے گئے ہیں۔ نیز اس مجموعہ میں موجود احادیث کی تمام عربی عبارتوں پر اعراب لگا دیئے ہیں۔ اس امر کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ اس مجموعہ میں مذکور تمام عربی عبارتوں پر اعراب لگائے گئے ہیں تاکہ اس سے استفادہ کرنے والے حضرات عربی عبارات کو درست طریقے سے پڑھ سکیں۔

5- پہلے نسخوں میں موجود اردو اشعار میں خاطر خواہ اغلاط موجود تھیں، جنہیں رفع کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

4- اس بات کی بھرپور کوشش کی گئی ہے کہ صرف وہ تحریرات اور تقریرات شامل کی جائیں جو عام فہم ہوں، دقیق علمی مباحث کو اس مجموعہ میں شامل کرنے سے حتی الوسع اجتناب کیا گیا ہے۔

6- پہلے سے طبع شدہ مواد میں موجود لفظی اغلاط کو دور کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔

7- اس بات کا دھیان رکھا گیا ہے کہ ضبط شدہ خطبات پر مشتمل عبارتوں کی تراکیب اور رموز و اوقاف پہلے سے بہتر ہوں۔

8- اس مجموعہ میں بہت سے ایسے بیانات کو بھی سپرد قرطاس کیا گیا ہے جو اب تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئے تھے۔

9- تاریخی واقعات اور آثار صحابہ و تابعین میں سے اکثر کو تلاش کر کے ان کے حوالے درج کر دیئے گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کاوش کو قبول فرمائے اور اسے حضرت اقدس مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم، ناشر کتاب ادارہ اسلامیات، ان کے جملہ معاونین اور راقم کے لئے فلاح کا ذریعہ بنائے۔ آمین ثم آمین۔

محمد اویس سرور

عرضِ ناشر

یوں تو ہر ناشر کے لیے کسی ایسے مصنف کی کتاب شائع کرنا، جس کی مقبولیت خواص و عوام میں بے پناہ ہو، فخر اور فضیلت کا درجہ رکھتی ہے۔ چنانچہ اگر حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم کا ہمارے ادارۂ اسلامیات کے ساتھ رشتہ محض مصنف اور ناشر کا ہوتا تب بھی یہ ادارۂ اسلامیات کے لیے باعثِ افتخار ہوتا کہ اس نے ایک ایسے عالم بے بدل کی کتب شائع کی ہیں جس کا شہرہ اور جس کے علمی فیض و برکت کا دائرہ دنیا کے کونے کونے میں پہنچ رہا ہے۔ تنہا یہی بات ادارۂ اسلامیات کے لیے باعثِ سعادت اور اس کی شناخت کے لیے کافی ہوتی۔

لیکن عمِ مکرم مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم کا رشتہ ہمارے ادارۂ اسلامیات سے جس مضبوط اور غیر معمولی محبت پر استوار ہے، وہ ناشر اور مصنف سمیت دیگر ہر تعلق سے بدر جہا بلند اور برتر ہے۔ وہ ادارے کے سرپرست بھی ہیں اور ادارہ اپنے معاملات میں ان سے رہنمائی کا بھی طالب اور خواستگار رہتا ہے۔ عمِ مکرم نے ہمیشہ ہماری درخواستوں کو شرفِ پذیرائی بھی بخشا ہے اور بے بدل محبت اور شفقت سے بھی نوازا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چچا جان محترم مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم (اللہ تعالیٰ ان کا سایۂ شفقت ہم پر تادیر قائم رکھے) کی کتب شائع کرتے ہوئے عقیدت و عظمت کے دھاروں میں محبت، اپنائیت اور انسیت کے پھوٹتے ہوئے چشمے بھی شامل ہوتے جاتے ہیں۔

خواص و عوام اس دل سوزی، تاثیر اور خیر خواہی سے بہت اچھے انداز میں واقف ہیں جن سے مولانا تقی عثمانی صاحب کی تحریریں، خطبات اور تقاریر لبریز ہیں۔ ان کا ایک طرۂ امتیاز وہ عام فہم انداز بھی ہے جو مخاطب کی رعایت سے ہر دل میں جا گزین ہوتا جاتا ہے اور اہل محفل علمی اور عملی طور پر مالا مال ہو کر محفل سے اٹھتے ہیں۔ بہت عرصے سے خواہش تھی کہ ان تحریروں بیانات، خطبات، تقاریر کا ایک ایسا مجموعہ موضوعاتی انداز میں میسر آ سکے جس سے استفادہ آسان ہو اور گھر بیٹھے یہ خزانہ دستیاب رہے۔

زیر نظر کتاب ''اسلام اور ہماری زندگی'' ہمارے اس خواب کی ایک تعبیر بھی ہے اور ادارۂ اسلامیات کے شرف و سعادت کے اس سلسلے میں ایک اہم اضافہ بھی۔ ہمیں خوشی ہے کہ چچا جان محترم نے اس سلسلے میں ہماری درخواست قبول فرماتے ہوئے اس ارادے کو بروئے کار لانے کی اجازت مرحمت فرمائی اور اس طرح دینی و دنیوی کامیابیوں کا یہ لازوال نسخہ آپ کے سامنے ہے۔ اس کتاب کے

مطالعے کے دوران یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ مولانا دامت برکاتہم کی بے پایاں مصروفیات کے باعث انہیں اس مجموعے پر نظرِ ثانی کا موقعہ نہیں مل سکا ہے۔ اگر دورانِ مطالعہ کوئی بات قابلِ استفسار محسوس ہو تو براہ کرم مرتب اور ناشر کے علم میں لا کر ممنون فرمائیں۔

دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عمِ مکرم کو ہر طرح کے خطرات اور آفات، حسد و کینہ سے محفوظ و مامون فرماتے ہوئے ان کے فیوض و برکات کا سلسلہ دیر تک اور دور تک قائم و دائم رکھیں اور اس کتاب کی تکمیل میں جن جن حضرات نے حصہ لیا ہے انہیں بھی اس کی برکات سے بہرہ مند فرمائیں۔ آمین

اشرف برادران (سلمہم الرحمٰن)

کارکنان ادارۂ اسلامیات

(لاہور۔ کراچی)

۶ رجب ۱۴۳۱ھ - ۱۷۔ جون ۲۰۱۰

توحیدِ باری تعالیٰ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ، وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَنَبِيَّنَا وَحَبِيْبَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا۔

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ، عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ﴾ (۱)

اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ صَدَقَ اللّٰهُ مَوْلَانَا الْعَظِيْمُ، وَصَدَقَ رَسُوْلُهُ النَّبِيُّ الْكَرِيْمُ، وَنَحْنُ عَلٰى ذٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِيْنَ وَالشَّاكِرِيْنَ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

بزرگانِ محترم اور برادرانِ عزیز! آج کی محفل میں ہمیں اسلام کے سب سے بنیادی عقیدے یعنی ''توحید'' کے بارے میں کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں، ہر مسلمان جانتا ہے کہ اسلام کی بنیاد کلمۂ توحید پر ہے، جو شخص بھی اسلام کے دائرے میں داخل ہوتا ہے، وہ کلمۂ توحید پڑھ کر یعنی ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' کا اقرار کر کے داخل ہوتا ہے، اس کلمۂ توحید کی انقلابی حیثیت بھی ہر مسلمان کو معلوم ہے، اور اس کا یہ عجیب نتیجہ بھی کہ اس ایک کلمہ کو پڑھ لینے کے بعد انسان کی زندگی میں ایک عظیم الشان انقلاب رونما ہو جاتا ہے، یعنی جو شخص کہ اس کلمہ کے پڑھنے سے پہلے کافر تھا، وہ اس کلمہ کے پڑھ لینے کے بعد مسلمان ہو جاتا ہے، پہلے جو شخص اللہ تعالیٰ کا مبغوض تھا، اس کلمہ کے پڑھنے کے بعد اللہ تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے، پہلے جو شخص جہنم اور دوزخ کا مستحق تھا، اس کلمہ کے پڑھنے کے بعد جنت کا اور اللہ کی رحمتوں کا سزاوار بن جاتا ہے، اور اگر میں یہ کہوں تو اس میں مبالغہ نہیں ہوگا کہ یہ ایک ایسا کلمہ ہے جو انسان کو ایک ہی لمحہ میں جہنم کے ساتویں طبقے سے نکال کر جنت الفردوس کے اعلیٰ ترین درجے میں

☆ نشری تقریریں، ص:۵-۱۶ (۱) الحشر:۲۲

داخل کر دیتا ہے اور یہ کوئی شاعرانہ مبالغہ نہیں، بلکہ ایک نا قابلِ انکار واقعہ ہے، جس کی بے شمار مثالیں تاریخِ اسلام میں ملتی ہیں۔

ذرا سی تشریح کے لئے ایک واقعہ آپ حضرات کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں، غزوۂ خیبر کا واقعہ جس میں نبی کریم سرکارِ دو عالم ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت کے ساتھ یہودیوں کے سب سے بڑے قلعے خیبر پر حملہ آور ہوئے تھے، اور وہاں کا محاصرہ کیا تھا، کیونکہ ان یہودیوں کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف طرح طرح کی سازشیں کی جاتی تھیں، نبی کریم سرکارِ دو عالم ﷺ نے جب اس قلعے کا محاصرہ کیا تو یہ محاصرہ کئی روز تک جاری رہا۔

اس محاصرہ کے دوران خیبر کے شہر کا ایک چرواہا جس کا نام تاریخ میں اسود راعی ہے، وہ ایک روز اپنے شہر سے باہر نکلا، اور اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ میں ذرا یہ معلوم کروں کہ یہ محمد رسول اللہ ﷺ جو اتنا بڑا لشکر لے کر اتنا بڑا فاصلہ طے کر کے اور مشقتیں اٹھا کر اس خیبر پر حملہ آور ہو رہے ہیں ان کی بنیادی دعوت کیا ہے؟ اور ان کا پیغام کیا ہے؟ وہ کیا چاہتے ہیں؟ یہ معلوم کرنے کی غرض سے وہ چرواہا باہر نکلا، اور مسلمانوں کے پڑاؤ کی طرف بڑھا، مسلمانوں کے پڑاؤ میں ایک شخص سے ملاقات ہوئی، اس سے اس نے پوچھا کہ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم لوگ خیبر پر حملہ کرنے کے لئے کیوں آئے ہو؟ اور کیا وجہ ہے کہ ہمارے شہر کے رہنے والے تمہارے دشمن ہیں؟ اور تمہاری بنیادی دعوت اور تمہارا بنیادی پیغام کیا ہے؟ وہ ایک صحابی تھے، انہوں نے خود اسلام کے عقائد کی تشریح کرنے کے بجائے اسود چرواہے سے کہا کہ تم ہمارے سردار یعنی محمد رسول اللہ ﷺ سے جا کر خود مل لو، اور انہی سے یہ سوال کرو، وہ جواب میں تمہیں تفصیل کے ساتھ اپنی بنیادی دعوت اور پیغام بتا دیں گے۔

اسود راعی کے لئے یہ بات انتہائی حیرت انگیز تھی اس لئے کہ وہ کبھی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کسی لشکر کا سپہ سالار، کسی فوج کا بڑا افسر، یا کسی مملکت کا فرمانروا، اسے بنفسِ نفیس اپنے دربار میں حاضر کرے، اور باریابی کا شرف بخشے، وہ تو ساری عمر یہ دیکھتا آیا تھا کہ وہ تو ایک چرواہا ہے، جس کے ساتھ کوئی بھی معزز انسان، کوئی بھی دولت مند انسان، کوئی بھی صاحبِ منصب انسان بات کرنے کو بھی ذلت اور حقارت سمجھتا ہے۔

اس لئے اسود راعی نے کہا کہ میں تمہارے سردار کے پاس کیسے جا سکتا ہوں، جبکہ وہ تمہاری مملکت کے فرمانروا ہیں، تمہاری فوج کے سپہ سالار ہیں، اور میں ایک ادنیٰ چرواہا ہوں۔ ان صحابی نے جواب میں کہا کہ ہمارے سردار نبی کریم سرکارِ دو عالم محمد مصطفیٰ ﷺ غریبوں کے انتہائی ہمدرد اور غمگسار ہیں، اور ان کی بزم اور محفل میں غریب و امیر کے درمیان، حاکم محکوم کے درمیان اور راعی و رعیت کے درمیان کوئی فرق، امتیاز نہیں ہوتا۔ وہ حیرانی کے عالم میں نبی کریم ﷺ کی طرف بڑھا، اور آپ کی

خدمت میں حاضر ہوا، اور ڈرتے ڈرتے یہ سوال کیا کہ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کی بنیادی دعوت کیا ہے؟ اور آپ کیوں اس جگہ پر تشریف لائے؟

نبی کریم ﷺ نے جواب میں مختصراً اس کو عقیدۂ توحید سمجھایا، اور یہ بتایا کہ ہم بار بار اس عقیدے کی وضاحت کر چکے ہیں، اسود راعی نے جب اس عقیدہ توحید کی تشریح سنی تو نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ اگر کوئی شخص اس عقیدہ کا قائل ہو جائے، اور آپ کے ساتھ شامل ہو جائے تو اس کا انجام کیا ہوگا؟ آپ نے فرمایا کہ اگر تم اس عقیدہ کو قبول کر لو، اور اسلام کے دائرے میں داخل ہو جاؤ تو تم ہمارے بھائی ہو گے، ہم تمہیں اپنے سینے سے لگائیں گے، اور تمہیں وہی حقوق حاصل ہونگے جو تمام مسلمانوں کو حاصل ہیں۔

اسود راعی نے بڑی حیرانی کے عالم میں کہا کہ مجھے کیسے وہ حقوق حاصل ہو سکتے ہیں جبکہ میں ایک معمولی درجے کا چرواہا ہوں، میرا رنگ سیاہ ہے، میں سیاہ فام ہوں، میرے جسم سے بدبو اٹھ رہی ہے، میرے جسم پر میل کچیل جمع ہے، ایسی حالت میں آپ لوگ مجھے کیسے سینے سے لگائیں گے؟ اور مجھے اپنے برابر کا درجہ اور مقام کیسے دیں گے؟ نبی کریم ﷺ نے اسے یقین دلایا تو اس نے کہا کہ اگر یہ واقعہ ہے کہ آپ مجھے اپنے برابر حقوق دینے کے لئے تیار ہیں، اور آپ کے اس عقیدۂ توحید کے پیغام میں بھی اتنی کشش ہے کہ میں اپنے دل میں اس کی طرف ایک غیر معمولی انسیت محسوس کر رہا ہوں، میں اتنی بات اور پوچھنا چاہتا ہوں کہ میری اس سیاہ فامی اور میرے جسم کے میل کچیل اور بدبو کا کیا علاج ہوگا؟

نبی کریم ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اگر تم اس عقیدۂ توحید کو قبول کر لو تو چاہے دنیا میں تمہارے اس چہرے کی سیاہی کا کوئی علاج نہ ہو سکے، لیکن جب آخرت میں تم اٹھائے جاؤ گے تو تمہارا چہرہ چمک رہا ہوگا، اور اللہ تعالیٰ تمہارے اس چہرے کی سیاہی کو نور سے بدل دے گا، اور تمہارے جسم کی بدبو کو خوشبو سے بدل دے گا، اس نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو پھر ''اشہد ان لا الہ الا اللہ واشہد ان محمداً رسول اللہ'' یہ کہہ کر مسلمان ہو گیا۔ پھر پوچھا کہ اب مجھے بتایئے کہ میرے ذمے کیا فریضہ عائد ہوتا ہے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ یوں تو اسلام کے بہت سے فرائض ہیں، لیکن اس وقت نہ تو نماز کا وقت ہے کہ تمہیں نماز کا حکم دیا جائے، نہ روزہ کا مہینہ ہے کہ روزہ رکھوایا جائے، نہ زکوٰۃ تم پر واجب ہے کہ تم سے زکوٰۃ دلوائی جائے، نہ حج کا موسم ہے کہ تم سے حج کرایا جائے، اس وقت تو ایک ہی عبادت اللہ کے لئے انجام دی جا رہی ہے، وہ یہ کہ خیبر کے میدان میں حق و باطل کا معرکہ برپا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں دینِ اسلام کے جان نثار اپنی جانیں قربان کر رہے ہیں، اس وقت تو تمہارا فریضہ یہ ہے کہ اس جہاد میں شامل ہو جاؤ۔ اسود راعی نے کہا کہ اگر

میں اس جہاد میں شہید ہوگیا تو میرا انجام کیا ہوگا؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں اس بات کی ضمانت دیتا ہوں کہ اگر تم جہاد میں شہید ہوگئے تو اللہ تبارک وتعالیٰ تمہیں سیدھا جنت الفردوس میں پہنچائے گا، تمہارے چہرے کی سیاہی نور سے تبدیل ہو جائے گی، تمہارے جسم سے بدبو کے بجائے خوشبوئیں مہکیں گی، میں اس کی ضمانت دیتا ہوں۔

یہ سن کر اسود راعی نے بکریوں کو شہر کی طرف ہنکایا، اور لشکرِ اسلام میں شامل ہوگیا، لڑائی کافی دیر تک جاری رہی، جب جنگ کا اختتام ہوگیا، اور خیبر فتح ہوگیا اور نبی کریم ﷺ شہدا کی لاشوں کا معائنہ کرنے کے لئے نکلے، تو انہی لاشوں میں سے ایک لاش اسود راعی کی بھی تھی، جب وہ آپ کی خدمت میں لائی گئی تو آپ کی مبارک آنکھوں میں آنسو آگئے، اور آپ نے فرمایا کہ یہ عجیب وغریب شخص ہے، یہ ایک ایسا شخص ہے جس نے اللہ کے راستے میں کوئی ایک سجدہ نہیں کیا، یہ وہ شخص ہے جس نے اللہ کے راستے میں کوئی ایک پیسہ خرچ نہیں کیا، یہ وہ شخص ہے جس نے اللہ کے راستے میں کوئی اور عبادت انجام نہیں دی، لیکن میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ یہ شخص سیدھا جنت الفردوس میں پہنچ گیا ہے، اور میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے چہرے کی سیاہی کو نور سے بدل دیا ہے، اس کے جسم کی بدبو اور میل کچیل کو خوشبو سے مہکا دیا گیا ہے۔ (۱)

یہ جو میں نے عرض کیا تھا کہ یہ کلمہ ''لا الٰہ الا اللہ'' ایک لمحہ میں انسان کو جہنم کے ساتویں طبقے سے نکال کر جنت الفردوس کے اعلیٰ ترین درجے میں پہنچا دیتا ہے، یہ کوئی مبالغہ نہیں ہے، بلکہ اس واقعے سے اس کا ایک عملی ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ صرف ایک ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' نے اس شخص کے انجام میں اتنا حیرت انگیز انقلاب برپا کر دیا۔

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ زبردست انقلاب جو انسان کی زندگی میں بھی اور اس کے انجام میں بھی اس کلمہ کی بدولت پیدا ہوتا ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا یہ کلمہ کوئی منتر ہے، یا کوئی طلسم ہے کہ اس کے پڑھ لینے کے بعد انسان جہنم سے، اللہ کے عذاب سے اور اللہ کے غضب سے محفوظ ہو جاتا ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ یہ کوئی منتر نہیں، کوئی طلسم نہیں، حقیقت یہ ہے کہ کلمہ ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' ایک معاہدہ ہے، ایک اقرار ہے جو انسان اپنے پروردگار سے کرتا ہے۔ جب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ ''لا الٰہ الا اللہ'' تو اسکے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، میں اللہ کے سوا ہر معبود سے بری ہوتا ہوں، اور ہر معبود کی معبودیت سے انکار کرتا ہوں، اور محمد رسول اللہ ﷺ کو اللہ کا سچا پیغمبر مانتا ہوں، اس معاہدہ کا مطلب یہ ہے کہ میں پوری زندگی جو گذاروں گا وہ تمام تر اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق، اسکے

(۱) البدایہ والنہایۃ (۴/۶۰۹-۶۱۱)

احکام کے مطابق اور اس کی خوشنودی کے مطابق گذارنے کی کوشش کروں گا، یہی معاہدہ کرنے کی بدولت اس کی زندگی میں یہ انقلاب برپا ہوتا ہے کہ پہلے وہ اللہ کا مبغوض تھا تو اب محبوب بن گیا، پہلے کافر تھا تو اب مسلمان بن گیا، پہلے جہنمی تھا تو اب جنتی بن گیا، یہ سارا انقلاب اس معاہدہ کی بدولت پیدا ہوتا ہے، اسی معاہدہ کا نام شریعت میں ''توحید'' ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے لے کر سرکار دو عالم ﷺ کے زمانے تک جتنے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے، ان سب نے ایک ہی بنیادی دعوت دی، وہ ''توحید'' کی دعوت تھی، جتنی قوموں پر عذاب نازل ہوئے وہ اسی ''توحید'' سے رُوگردانی کی بنیاد پر نازل ہوئے، انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے جو مشقتیں اور صعوبتیں اٹھائیں، وہ اسی ''توحید'' کی نشر و اشاعت کے لئے اٹھائیں، یہ ایک ایسا بنیادی عقیدہ ہے جو اسلام اور اللہ تعالیٰ کے دین کا بنیادی پتھر کہلانے کا مستحق ہے، اور اسلام کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو معبود قرار دے کر اس کے سوا ہر معبود کی نفی کی جائے، ہر معبود سے براءت کا اظہار کیا جائے، اور اللہ کے سوا کسی کے حکم کی تعمیل نہ کی جائے۔

علماء نے لکھا ہے کہ توحید کی دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک توحید اعتقادی، دوسری توحید عملی۔ توحید اعتقادی کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس بات پر یقین رکھے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اس کائنات کا نہ کوئی خالق ہے نہ کوئی معبود ہے، اور نہ کوئی عبادت کے لائق ہے، اور اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے، اللہ کی ذات میں کسی کو شریک نہ ٹھہرانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو معبود قرار نہ دے، اور صفات میں شریک نہ ٹھہرانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی جتنی ایسی صفات ہیں جو اسی کے ساتھ مخصوص ہیں ان میں کسی اور کو اس کا شریک نہ بنائے۔

مثلاً اللہ تعالیٰ رزق دیتا ہے، وہ رزّاق ہے، اس رزّاقیت کی صفت میں کسی اور کو شامل نہ کرے، اللہ تبارک وتعالیٰ کے قبضہ وقدرت میں ہر انسان کا نفع اور نقصان ہے، اس نفع ونقصان کو اللہ تعالیٰ ہی کے قبضۂ قدرت میں سمجھے، اسکے سوا کسی اور کو نفع ونقصان کا ذمہ دار قرار نہ دے، اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں شفا اور مرض ہے، تو شفا اور مرض کو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف منسوب نہ کرے، لہٰذا جتنی بھی اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں ان میں سے کسی میں بھی دوسرے کو شریک نہ ٹھہرائے۔

اس بات کی وضاحت اس لئے ضروری ہے کہ جہاں تک اللہ تعالیٰ کی ذات میں شریک ٹھہرانے کا تعلق ہے، دنیا کے بیشتر مذاہب اسکے قائل رہے ہیں، وہ کافر اور مشرک لوگ جن کی طرف نبی کریم ﷺ کو مبعوث کیا گیا، اور آپ نے ان کو توحید کی دعوت دی، وہ بھی اس بات کو مانتے تھے کہ پیدا کرنے والا اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ وہ بھی اس بات کو مانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پوری کائنات کو پیدا کیا ہے، اور ہمیں بھی اسی نے پیدا کیا ہے، لیکن ان کا شرک یہ تھا کہ وہ اللہ کی صفات میں کچھ

دیوتاؤں کو شریک مانتے تھے، وہ کہتے تھے کہ رزق کا شعبہ اللہ تعالیٰ نے فلاں دیوتا کے سپرد کر رکھا ہے۔ بارش کا شعبہ اللہ تعالیٰ نے فلاں دیوتا کے حوالے کر دیا ہے۔ شفا کا شعبہ اللہ تعالیٰ نے فلاں دیوتا کو سونپ دیا ہے، اس طرح وہ صفاتِ باری تعالیٰ کے اندر دوسرے دیوتاؤں کو شریک ٹھہرانے کے مجرم تھے۔ اس وجہ سے ان کو مشرک قرار دیا گیا، ورنہ خود قرآن کریم کہتا ہے کہ:

''اگر آپ ان سے پوچھئے کہ کس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا، تو وہ جواب میں کہیں گے کہ اللہ نے پیدا کیا''

اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

﴿أَإِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ﴾ (۱)

کہ تم مانتے ہو کہ اللہ کے سوا کوئی خالق نہیں اسکے باوجود اسکی صفات میں تم دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہو؟ یہ تو کوئی عقلمندی اور دانش مندی کی بات نہیں۔

اسی لئے توحید اعتقادی اس وقت کامل ہوتی ہے جب اللہ تعالیٰ کی ذات میں بھی کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے، اس کی صفات میں بھی کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے، یعنی عبادت کرے انسان تو صرف اللہ کی کرے، معبود مانے تو اللہ کو مانے، پوجے تو اللہ کو پوجے، مانگے تو اللہ سے مانگے، اور مشکل کشا، رزّاق اور تمام بیماریوں کو دور کرنے والا اللہ کے سوا کسی اور کو نہ سمجھے، یہ ہے توحید کامل جس کی دعوت حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے لے کر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک تمام انبیاء نے دی ہے۔

توحید کی دوسری قسم ''توحیدِ عملی'' ہے، توحید عملی کا مطلب یہ ہے کہ یہ اعتقاد کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے یہ انسان کی عملی زندگی میں اس طرح رچ بس جائے کہ ہر آن اس کو یہ حقیقت مستحضر رہے کہ اللہ کے سوا کوئی شخص مجھ کو نہ نقصان پہنچا سکتا ہے، اور نہ نفع پہنچا سکتا ہے، اور نہ اللہ کے سوا کوئی واجب الاطاعت ہے، مجھے اللہ کے حکم کی اطاعت کرنی ہے، اللہ کے حکم کی اطاعت میں کوئی بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے سے بھی دریغ نہیں کروں گا، یہ اعتقاد جب انسان کی زندگی میں رچ بس جاتا ہے تو اس کو صوفیاء کی اصطلاح میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس کو توحید عملی کا مقام حاصل ہو گیا۔

اس توحید عملی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی زندگی کے ہر شعبے میں ہر موقع پر اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام کو پیشِ نظر رکھتا ہے، وہ یہ دیکھتا ہے کہ میرے اس قدم سے اللہ راضی ہو گا یا ناراض ہو گا، کہیں ایسا تو نہیں کہ میرے اس عمل سے اللہ کی نافرمانی ہو جائے، اگر نافرمانی کا اندیشہ ہو تو وہ اس قدم سے باز رہتا ہے، اور اللہ کے سوا کسی سے خوف نہیں کھاتا، کسی سے اُمید نہیں رکھتا، اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف اگر کوئی شخص اس کے قدموں میں ساری دنیا جہاں کی دولت لا کر ڈھیر کر دے تو بھی وہ دولت

(۱) النمل: ۶۰

اس کے پائے استقامت کو لغزش میں نہیں لاسکتی، وہ اللہ تعالیٰ کے احکام سے رُوگردانی نہیں کرسکتا۔ کوئی شخص زور اور زبردستی کی انتہا کردے، اور اس کو اپنے سامنے موت ناچتی نظر آرہی ہو، لیکن اسکے باوجود وہ جانتا ہے کہ موت اور زندگی، شفا اور مرض سب کچھ اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہے، اگر اس نے میرے لئے یہی وقت مقرر کیا ہے تو اسکو کوئی نہیں ٹال سکتا، اور اگر میری زندگی باقی ہے تو کوئی شخص مجھے موت کے حوالے نہیں کرسکتا، اس لئے وہ کبھی بھی کسی ڈر اور خوف کی بنا پر اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم سے رُوگردانی پر آمادہ نہیں ہوتا۔

اسی کو شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

موحد چہ برپائے ریزی زرش
چہ شمشیر ہندی نہی برسرش
امید و ہراسش نباشد نہ کس
بریں است بنیاد توحید و بس (۱)

موحد کا مقام یہ ہوتا ہے کہ اگر تم اس کے پاؤں پر دنیا جہاں کا سونا ڈھیر کردو، یا اس کے سر پر ہندی تلوار لٹکادو، اس کو خدا کے سوا نہ کسی اور سے امید قائم ہوتی ہے، نہ خدا کے سوا کسی کا خوف ہوتا ہے، اور یہی توحید کی بنیاد ہے۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا واقعہ آپ نے سنا ہوگا کہ ایک غزوہ کے موقع پر آپ ایک جگہ دوپہر کے وقت ایک درخت کے سائے میں آرام فرمارہے تھے کہ اتنے میں دشمن کا ایک شخص ادھر آنکلا، آپ کی تلوار درخت سے لٹکی ہوئی تھی، اس نے اس تلوار پر قبضہ کیا، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جگایا، اور آپ سے کہا کہ اب تمہیں میری تلوار سے کون بچاسکتا ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نیند سے بیدار ہوئے، اچانک یہ منظر سامنے آیا کہ تلوار اس شخص کے ہاتھ میں ہے، ایسے موقع پر جبکہ موت نگاہ کے سامنے ناچتی نظر آرہی ہو، ظاہر ہے کہ وہ شخص دشمن ہے، آپ کے خون کا پیاسا ہے، اس کے ہاتھ میں تلوار بھی ہے، بازو میں طاقت بھی ہے، اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بُری نیت سے حملہ کرنے آیا ہے، لیکن اس کے باوجود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے اطمینان سے یہ جواب دیا کہ "مجھے بچانے والا اللہ ہے"، مطلب یہ تھا کہ اگر اللہ کو اس وقت مجھے مارنا منظور ہے تو دنیا کی کوئی طاقت مجھے نہیں بچاسکتی، اور اگر اللہ تعالیٰ نے میری زندگی اور لکھی ہے تو تمہاری یہ تلوار اور تمہاری یہ عداوت میرا بال بیکا نہیں کرسکتی۔ یہ جواب آپ نے اس اعتماد اور بھروسے کے ساتھ دیا کہ اس اعتماد اور بھروسے سے دشمن پر لرزہ طاری ہوگیا، اور اس حالت میں تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی، اب تلوار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں تھی، آپ نے تلوار اٹھا کر

(۱) گلستان، ص:۲۴۳

فرمایا کہ تمہیں اس تلوار سے اور میرے حملے سے کون بچا سکتا ہے؟ اس شخص کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، اس نے نبی کریم ﷺ کے اس اعتماد اور توکل کو دیکھ کر اسلام قبول کرلیا اور مسلمان ہوگیا۔ (۱)

عرض کرنے کا منشا یہ تھا کہ ''توحید عملی'' اس وقت کہلاتی ہے جب انسان اپنی زندگی کے ہر شعبے میں اس بات کو پیشِ نظر رکھے کہ میں نے ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' پڑھنے کے بعد اپنے پروردگار سے ایک معاہدہ کیا ہے، اور اس اقرار اور معاہدہ کا تقاضا یہ ہے کہ میں زندگی کے کسی بھی قدم پر اس کے کسی بھی حکم کی خلاف ورزی نہ کروں گا، جب یہ مقام انسان کو حاصل ہوجاتا ہے تو یہ ''توحید عملی'' کہلاتا ہے، اور یہی وہ مقام ہے جو درحقیقت انسان کی زندگی میں انقلاب برپا کرتا ہے، اور یہی وہ چیز ہے جو انسان کو جہنمی سے جنتی بناتی ہے، اور اللہ کے مبغوض سے محبوب بنا دیتی ہے۔

اس ''توحید عملی'' کو حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان سب سے پہلے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ اس معاہدہ کے بعد میرے اُوپر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے کیا احکام مجھے دیے ہیں، اور کن باتوں سے مجھے روکا ہے، سب سے پہلا مرحلہ انہی باتوں کو معلوم کرنے کا ہے، اس واسطے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰی كُلِّ مُسْلِمٍ)) (۲)

ہر مسلمان پر ایمان لانے کے بعد سب سے پہلا فریضہ یہ عائد ہوتا ہے کہ وہ علم کی طلب کرے، یعنی یہ معلوم کرے کہ اللہ کی مرضی کیا ہے؟ اور اس کی نافرمانی کیا ہے؟ جب یہ باتیں انسان کو معلوم ہوجاتی ہیں تو پھر اس بات پر اس کو قدرت حاصل ہوجاتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کے اندر اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی کرے، اور اس کی نافرمانی سے بچنے کی کوشش کرے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو توحید کے صحیح تقاضوں کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے، اور ان پر پوری طرح عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے، اور اس کے تمام ثمرات اور نتائج سے بہرہ ور فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.



(۱) صحیح البخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب من علق سیفه بالشجر فی السفر عند القائلة، رقم: ۲٦۹٤، صحیح مسلم، کتاب صلاة المسافرین وقصرها، رقم: ۱۳۹۱. مسند احمد، رقم: ۱۳۸۱٦.

(۲) سنن ابن ماجه، کتاب المقدمة، باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم، رقم: ۲۲۰

کلمہ طیبہ کے تقاضے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

اَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ط

﴿ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴾ (۱)

بزرگانِ محترم اور برادرانِ عزیز!

آج اس مبارک مدرسہ میں حاضر ہو کر ایک زمانہ دراز کی دِلی تمنا پوری ہو رہی ہے، عرصہ دراز سے اس مبارک درسگاہ میں حاضری کا شوق تھا اور میرے مخدوم بزرگ حضرت مولانا مفتی عبدالشکور صاحب ترمذی دامت برکاتہم العالیہ (۲) کی زیارت اور ان کی صحبت سے استفادہ کی غرض سے بار بار یہاں آنے کو دل چاہتا تھا، لیکن مصروفیات اور مشاغل نے اب تک مہلت نہ دی، اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ آج یہ دیرینہ آرزو اس نے پوری فرمائی۔ یہاں حاضری کا میرا اصل مقصد حضرت دامت برکاتہم کی زیارت اور ان کے حکم کی تعمیل تھی، جب میں یہاں حاضری کا ارادہ کر رہا تھا تو ذہن میں بالکل نہیں تھا کہ ماشاء اللہ اتنا بڑا مسلمانوں کا اجتماع موجود ہوگا اور ان سے خطاب کرنے کی نوبت آئے گی۔ بہرصورت یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ اس نے حضرت مولانا کی زیارت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے اتنے بڑے مجمع کی بھی زیارت کی توفیق عطا فرمائی جو خالصتاً اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی محبت اور اللہ کے دین کی طلب کی خاطر اس صحن میں جمع ہے۔

ان کا حسنِ ظن سچا ہو جائے

میرے بزرگ حضرت مولانا مشرف علی صاحب تھانوی، اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو دنیا اور

☆ اصلاحی خطبات (۹۱/۱۴ـ۱۱۸)

(۱) التوبۃ: ۱۱۹

(۲) مفتی عبدالشکور ترمذی صاحب وفات پا چکے ہیں، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

آخرت کی کامیابیاں عطا فرمائے اور ان کے فیوض سے ہمیں مستفید فرمائے، انہوں نے مجھ ناکارہ کے بارے میں جو تعارفی کلمات ارشاد فرمائے، وہ میرے لئے باعثِ شرم ہیں اور یہ ان کی شفقت ہے اور کرم فرمائی ہے کہ انہوں نے مجھ ناکارہ کے بارے میں ان خیالات کا اظہار فرمایا، میں سوائے اس کے اور کیا عرض کروں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے اس حسنِ ظن کو میرے حق میں سچا فرمادے، آپ حضرات سے بھی اسی دُعا کی درخواست ہے۔

سوچ رہا تھا کہ اس موقع پر آپ حضرات کی خدمت میں کیا عرض کروں؟ حضرت مفتی عبدالشکور صاحب مدظلہم العالی سے بھی پوچھا کہ کس موضوع پر بیان کروں؟ سمجھ میں نہیں آرہا تھا، یہاں بیٹھنے کے بعد دل میں ایک بات آئی اور اسی کے بارے میں چند مختصر گذارشات آپ حضرات کی خدمت میں عرض کروں گا۔

یہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی محبت کا نتیجہ ہے

میں دیکھ رہا ہوں کہ ماشاء اللہ مسلمانوں کا اتنا بڑا اجتماع ہے کہ چہروں پر مسرت کے آثار ہیں، شوق وذوق کے آثار ہیں، طلب کے آثار ہیں۔ یہ آخر کیوں؟

دل میں خیال پیدا ہوا کہ مجھ جیسا ایک ناکارہ مفلسِ علم بے عمل انسان ان کے سامنے بیٹھا ہے، اکثر حضرات وہ ہیں کہ جن سے اس سے پہلے ملاقات کی سعادت حاصل نہیں ہوئی، لیکن آخر وہ کیا بات ہے کہ اک اَن دیکھا شخص جس کو پہلے کبھی دیکھا نہیں، کبھی برتا نہیں، ایسے شخص کو دیکھنے کے لئے اتنا شوق وذوق! اس کی بات سننے کے لئے اتنا ذوق وشوق! یہ آخر کیا بات ہے؟ ذہن میں یہ آیا کہ میری حالت تو جو کچھ ہے وہ اللہ ہی جانتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اس کی اصلاح فرمائے۔ لیکن جو طلب اور جو ذوق وشوق لے کر یہ اللہ کے بندے یہ محمد رسول اللہ ﷺ کے اُمتی اس صحن میں جمع ہوئے ہیں یہ ہم سب کے لئے اتنی بڑی سعادت اور اتنی بڑی خوش نصیبی کی بات ہے کہ اس کا بیان الفاظ سے نہیں ہوسکتا۔ یہ درحقیقت محبت ہے، ایک شخص سے نہیں، ایک ذات سے نہیں، یہ محبت ہے اللہ کی اور اللہ کے رسول محمد مصطفیٰ ﷺ کی، اس محبت کی خاطر یہ سب نظارے دیکھنے میں آتے ہیں اور میں یہ نظارے آج پہلی مرتبہ نہیں دیکھ رہا ہوں، اس سے پہلے بھی ایسے ایسے مقامات پر دیکھے ہیں جہاں اس کا کوئی تصور بھی انسان کے ذہن میں نہیں آسکتا۔

کلمہ طیبہ نے ہم سب کو ملا دیا ہے

اللہ تبارک وتعالیٰ نے دنیا کے بہت سے ملکوں میں جانے کا موقع فراہم فرمایا، ایسے ایسے

کفرستانوں میں جہاں کفر کی ظلمت چھائی ہوئی ہے، اندھیرا چھایا ہوا ہے، ایسی ایسی جگہوں پر جہاں کے لوگ ہماری زبان نہیں جانتے، ایک جملہ ہم بولیں تو وہ اس کو سمجھ نہیں سکتے، وہ اگر کوئی جملہ بولیں تو ہم اس کو نہیں سمجھ سکتے۔ ابھی گزشتہ سال مجھے چین جانے کا اتفاق ہوا، آبادی کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے اور وہاں پر کافر اور غیر مسلم آباد ہیں، لیکن وہاں پر اللہ کے مسلمان بندے بھی ہیں، وہاں جا کر پہلی بار یہ بات تحقیق سے معلوم ہوئی کہ چین کے اندر مسلمانوں کی تعداد کم از کم آٹھ کروڑ ہے۔ جب گاؤں اور دیہات میں یہ اطلاع پہنچی کہ پاکستان سے کچھ مسلمان آرہے ہیں تو گھنٹوں پہلے سے دونوں طرف دورویہ قطاریں لگا کر انتظار میں کھڑے ہوگئے، حالانکہ برف باری ہورہی تھی، لیکن اس انتظار میں کہ پاکستان سے کچھ مسلمان آئے ہیں ان کو دیکھیں، چنانچہ جب ہم وہاں پہنچے اور انہوں نے ہمیں دیکھا تو کوئی جملہ وہ ہم سے نہیں کہہ سکتے تھے اور ہم کوئی جملہ ان سے نہیں کہہ سکتے تھے، کیونکہ وہ ہماری زبان نہیں جانتے اور ہم ان کی زبان نہیں جانتے، لیکن ایک لفظ ایسا ہے جو ہمارے دین نے ہمیں مشترک دے دیا ہے، خواہ کوئی زبان انسان بولتا ہو، اپنے دل کی ترجمانی وہ اس لفظ کے ذریعہ کرسکتا ہے، وہ ہے السلام علیکم ورحمۃ اللہ! تو ہر شخص دیکھنے کے بعد السلام علیکم کا نعرہ لگاتا اور یہ کہہ کر اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے۔ ایک رشتہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارے درمیان پیدا فرمادیا، چاہے وہ مشرق کا رہنے والا ہو یا مغرب کا، کوئی زبان بولتا ہو، بات اس کی سمجھ میں آتی ہو یا نہ آتی ہو، اس کی معاشرت، اس کی تہذیب اور اس کی قومیت کچھ بھی ہو، لیکن جب یہ پتہ چل گیا کہ یہ مسلمان ہے اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے رشتہ میں ہمارے ساتھ شریک ہے تو اس کے لئے دل کے اندر محبت کے جذبات اُبھرنے شروع ہوجاتے ہیں، ہمیں اور آپ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے بہت سے رشتوں میں جوڑا ہے، ان میں جو سب سے مضبوط رشتہ جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا، جو کبھی ختم نہیں ہوسکتا، جو کبھی کمزور نہیں پڑسکتا، وہ رشتہ ہے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا رشتہ۔

اس رشتے کو کوئی طاقت ختم نہیں کرسکتی

میرا بنگلہ دیش جانے کا اتفاق ہوا، جو کبھی بہر حال پاکستان ہی کا حصہ تھا، مشرقی پاکستان کہلایا کرتا تھا، وہاں لوگوں کے اندر یہ بات مشہور ہے کہ جب سے بنگلہ دیش الگ ہوا، اس وقت سے پورے بنگلہ دیش میں ڈھاکہ سے لے کر چٹا گام اور سلہٹ تک کسی جگہ اُردو سنائی نہیں دیتی، اس لئے کہ اُردو کا تو بیج مار دیا گیا، بلکہ اُردو کا لفظ سن کر لوگوں کو غصہ آتا ہے کہ اُردو زبان میں کیوں بات کی گئی؟ بنگلہ زبان میں بات کرو یا انگریزی میں۔

جب چٹا گام پہنچا تو وہاں یہ اعلان ہوگیا کہ فلاں میدان میں بیان ہوگا، چنانچہ وہ میدان پورا

بھر گیا، اس مجمع کے اندر میں نے اُردو میں بیان کیا۔ اس میں لوگوں کا اندازہ یہ تھا کہ کم از کم پچاس ہزار مسلمانوں کا اجتماع تھا اور لوگوں کا کہنا یہ تھا کہ بنگلہ دیش بننے کے بعد اتنا بڑا اجتماع ہم نے نہیں دیکھا، اور لوگوں کا کہنا یہ بھی تھا کہ اگر کوئی اتنے بڑے جلسے کے اندر اُردو زبان میں بیان کرے تو لوگ اس کے خلاف نعرے لگانا شروع کر دیتے ہیں، احتجاج شروع کر دیتے ہیں، لیکن لوگوں نے میری بات اتنی محبت سے، اتنے پیار سے اور اتنے اشتیاق سے سنی کہ لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ وہاں بھی میں نے یہ بات عرض کی کہ ہمارے درمیان سرحدیں قائم ہو سکتی ہیں، پولیس اور فوج کے پہرے حائل ہو سکتے ہیں، دریا اور سمندر اور پہاڑوں کے فاصلے حائل ہو سکتے ہیں، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک ایسے رشتے میں پرو دیا ہے کہ اس کو دنیا کی کوئی طاقت ختم نہیں کر سکتی، اور وہ ہے کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔

اس کلمہ کے ذریعہ زندگی میں انقلاب آجاتا ہے

یہ کلمہ جس نے ہمیں اور آپ کو جوڑا ہوا ہے، عجیب و غریب چیز ہے، عجیب و غریب مناظر دکھاتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ کلمہ ایسا ہے کہ انسان کی زندگی میں اس کلمے کے پڑھتے ہی اتنا بڑا انقلاب برپا ہوتا ہے کہ اس سے بڑا انقلاب کوئی ہو نہیں سکتا، ایک شخص جو اس کلمہ کے پڑھنے سے پہلے کافر تھا، کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک اس شخص نے یہ کلمہ نہیں پڑھا تھا، اس وقت تک وہ جہنمی تھا، اللہ کا مبغوض تھا، دوزخ کا مستحق تھا، اور اس کلمے کو پڑھنے کے بعد ایک لمحے کے اندر وہ شخص جنتی بن گیا اور اللہ تبارک و تعالیٰ کا محبوب بن گیا۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ)) (۱)

''جو شخص لا الٰہ الا اللہ کہدے بس جنتی ہے''

گناہوں کی سزا بھگتے گا اگر گناہ کئے ہیں، گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد آخر انجام اس کا جنت ہے۔ گناہ کیے، غلطیاں کیں، کوتاہیاں کیں، اگر اس نے توبہ نہیں کی تو سزا ملے گی، لیکن سزا ملنے کے بعد آخری انجام اس کا جنت ہے۔ یہ میری بات نہیں، یہ سرکارِ دو عالم ﷺ کا کلام ہے کہ اس سے زیادہ سچا اس کائنات میں کوئی اور کلام ہو نہیں سکتا کہ وہ جنتی ہے، اور کلمہ شریف پڑھنے کے بعد ایک شخص جہنم کے ساتویں طبقے سے نکل کر جنت الفردوس کے اعلیٰ ترین طبقے تک پہنچ جاتا ہے۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الایمان عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم، باب ما جاء فیمن یموت وھو یشھد ان لا الہ الا اللّٰہ، رقم: ۲۵۶۲

ایک چرواہے کا ایمان افروز واقعہ

غزوۂ خیبر کا واقعہ یاد آیا، غزوۂ خیبر وہ جہاد ہے جس میں نبی کریم ﷺ نے یہودیوں کے خلاف حملہ کیا تھا، آپ ﷺ خیبر تشریف لے گئے تھے، خیبر کے قلعے کے باہر پڑاؤ ڈالا ہوا تھا اور اس کا محاصرہ کیا ہوا تھا، اس میں کئی دن گزر گئے، لیکن قلعہ ابھی فتح نہیں ہوا تھا۔ اندر سے یہودیوں کا ایک چرواہا باہر نکلا، وہ بکریاں چرا رہا تھا، سیاہ فام تھا، کالی رنگت تھی اور کسی یہودی نے اس کو بکریاں چرانے کے لئے اپنا نوکر رکھا ہوا تھا، وہ بکریاں چرانے کی غرض سے خیبر کے قلعے سے باہر نکلا، تو دیکھا کہ مسلمانوں کا لشکر ٹھہرا ہوا ہے۔ اس نے یہ سن رکھا تھا کہ محمد رسول اللہ ﷺ حجاز سے یہاں پر حملہ کرنے کے لئے آئے ہیں، یثرب کے بادشاہ ہیں، اس کے دل میں خیال آیا کہ ذرا میں بھی دیکھوں، آج تک میں نے کوئی بادشاہ نہیں دیکھا، اور دیکھ کے آؤں کہ یثرب کا بادشاہ کیسا ہے اور وہ کیا بات کہتا ہے؟ لوگوں سے پوچھا کہ سرکارِ دو عالم محمد مصطفیٰ ﷺ کہاں تشریف فرما ہیں؟

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اشارہ کرکے بتادیا کہ فلاں خیمہ کے اندر تشریف رکھتے ہیں۔ اوّل تو وہ خیمے کو دیکھ کر ہی حیران رہ گیا، اس کے ذہن میں یہ تھا کہ جب یہ یثرب کے بادشاہ ہیں اور جن کی قوت اور طاقت کا ڈنکا بجا ہوا ہے تو ان کا جو خیمہ ہوگا وہ قالینوں سے مزین ہوگا، اس پر شاندار پردے پڑے ہوئے ہوں گے، باہر پہرے دار کھڑے ہوئے پہرہ دے رہے ہوں گے۔ وہاں جاکر دیکھا تو ایک معمولی کھجور کا بنا ہوا خیمہ نظر آرہا ہے، نہ کوئی چوکیدار ہے نہ کوئی پہرہ دار ہے، نہ کوئی مصاحب ہے نہ کوئی ہٹو بچو کے نعرے لگانے والا ہے۔ خیر وہ چرواہا اندر داخل ہوگیا، اندر سرکارِ دو عالم رحمت للعالمین ﷺ تشریف فرما تھے، اس نے حضور ﷺ کو دیکھا تو بڑی عجیب وغریب نورانی صورت نظر آئی، وہ جلوہ نظر آیا تو دل کچھ کھنچنا شروع ہوا، جاکر عرض کیا کہ آپ یہاں پر کیوں تشریف لائے ہیں؟ آپ کا پیغام اور آپ کی دعوت کیا ہے؟

نبی کریم سرورِ دو عالم محمد مصطفیٰ ﷺ نے فرمایا کہ میری تو ایک ہی دعوت ہے اور وہ یہ کہ اللہ کے سوا کسی کو اپنا معبود نہ مانو اور لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھ لو، کچھ نبی کریم سرورِ دو عالم ﷺ کے جلوہ جہاں آرا اور کچھ آپ ﷺ کے ارشادات ان دونوں کا طبیعت پر اثر ہونا شروع ہوا تو اس نے پوچھا: اچھا یہ بتایئے کہ اگر میں آپ کی اس دعوت کو قبول کرلوں اور لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھ لوں تو میرا انجام کیا ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمہارا انجام یہ ہوگا کہ تم تمام مسلمانوں کے برابر حقوق حاصل کرلوگے، ہم تمہیں سینے سے لگائیں گے اور جو ایک مسلمان کا حق ہے وہی تمہارا بھی حق ہوگا۔

اس نے کہا کہ آپ مجھے سینے سے لگائیں گے؟ ساری عمر کبھی یہ بات اس کے تصور میں بھی

نہیں آئی تھی کہ کوئی سردار یا کوئی بادشاہ یا کوئی سربراہ مجھے گلے لگا سکتا ہے۔ اس نے کہا کہ میرا حال تو یہ ہے کہ میں سیاہ فام ہوں، میری رنگت کالی ہے، میرے جسم سے بدبو اٹھ رہی ہے، اس حالت میں آپ مجھے کیسے سینے سے لگائیں گے؟

آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم یہ ایمان قبول کرلو گے تو پھر سب تمہیں سینے سے لگائیں گے، تمہارے حقوق تمام مسلمانوں کے برابر ہوں گے۔

بعض روایتوں میں آتا ہے کہ اس نے کہا کہ آپ اتنے بڑے بادشاہ ہو کر مجھ سے مذاق کی بات کرتے ہیں یہ کہہ کر کہ مجھے گلے سے لگائیں گے۔

نبی کریم سرورِ دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ نہیں، میں مذاق نہیں کرتا، واقعۃً میں اس دین کا پیغام لے کر آیا ہوں جو کالے اور گورے، امیر اور مامور، غریب اور سرمایہ دار کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتا، وہاں تو فضیلت اس کو حاصل ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ سے زیادہ ڈرتا ہو، اس واسطے تم ہمارے برابر ہو گے اور ہم تمہیں گلے سے لگائیں گے۔ اس نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو میں مسلمان ہوتا ہوں۔ پھر اشہد ان لا الٰہ الا اللہ واشہد ان محمداً رسول اللہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔

پھر اس نے کہا کہ یا رسول اللہ! اب میں مسلمان ہو چکا، اب مجھے بتائیے کہ مجھے کیا کرنا ہے؟ میرے ذمہ فرائض کیا ہیں؟

سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ تم ایسے وقت میں مسلمان ہوئے ہو کہ نہ تو یہ کوئی نماز کا وقت ہے کہ تمہیں نماز پڑھوائی جائے، نہ یہ رمضان کا مہینہ ہے کہ تم سے روزہ رکھوایا جائے، نہ تمہارے پاس مال و دولت ہے کہ تم سے زکوٰۃ دلوائی جائے۔ اس وقت تک حج فرض نہیں ہوا تھا۔ وہ عبادتیں جو عام مشہور ہیں ان کا تو کوئی موقع نہیں، البتہ اس وقت خیبر کے میدان میں ایک عبادت ہو رہی ہے اور یہ وہ عبادت ہے جو تلواروں کے سائے میں انجام دی جاتی ہے، وہ ہے جہاد فی سبیل اللہ، تو آؤ اور دوسرے مسلمانوں کے ساتھ اس جہاد میں شامل ہو جاؤ۔

اس نے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ! میں جہاد میں شامل تو ہو جاؤں لیکن جہاد میں دونوں باتیں ممکن ہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ فتح عطا فرمادے اور یہ بھی ممکن ہے کہ انسان اپنا خون دے کر آئے، تو اگر میں اس جہاد میں مر گیا اور شہید ہو گیا تو پھر میرا کیا ہوگا؟

سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم اس جہاد میں شہید ہو گئے تو میں تمہیں بشارت دیتا ہوں اس بات کی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ تمہیں سیدھے جنت الفردوس کے اندر لے جائیں گے، تمہارے اس سیاہ جسم کو اللہ تبارک وتعالیٰ منور جسم بنادیں گے، نورانی جسم بنادیں گے، اور تم کہتے ہو کہ میرے جسم سے بدبو اٹھ رہی ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ تمہارے جسم کی بدبو کو خوشبو میں تبدیل فرمادیں گے۔

اس نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو بس مجھے اور کسی چیز کی حاجت نہیں۔

وہ جو بکریاں لے کر آیا تھا ان کے بارے میں نبی کریم سرورِدو عالم ﷺ نے فرمایا کہ یہ بکریاں جو تم لے کر آئے ہو، یہ کسی اور کی ہیں، ان کو پہلے واپس کر کے آؤ۔

اندازہ لگائیے! میدانِ جنگ ہے، دشمن کی بکریاں ہیں، وہ چرواہا دشمن سے بکریاں باہر لے کر آیا ہے، اگر آپ چاہتے تو ان بکریوں کے ریوڑ کو پکڑ کر مالِ غنیمت میں شامل فرما لیتے، لیکن وہ چرواہا ان کو بطور امانت لے کر آیا تھا اور امانت کو واپس دلوانا یہ نبی کریم سرورِدو عالم ﷺ کی تعلیمات میں سرفہرست تھا، اس واسطے آپ ﷺ نے فرمایا کہ پہلے ان بکریوں کو قلعے کی طرف بھگا دو تا کہ یہ شہر کے اندر چلی جائیں اور جو مالک ہے اس تک پہنچ جائیں۔ تو پہلے نبی کریم ﷺ نے بکریاں واپس کروائیں پھر اس کے بعد وہ چرواہا جہاد میں شامل ہو گیا، کئی روز تک جہاد جاری رہا، جب جہاد ختم ہوا اور نبی کریم سرورِدو عالم ﷺ حسبِ معمول شہداء اور زخمیوں کا جائزہ لینے کے لئے نکلے تو جہاں بہت سی لاشیں پڑی ہوئی تھیں اور متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہوئے تھے، دیکھا کہ ایک لاش پڑی ہوئی ہے، اس کے گرد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جمع ہیں اور آپس میں یہ مشورہ کر رہے ہیں کہ یہ کس کی لاش ہے؟ اس واسطے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو پتہ نہیں تھا کہ یہ کون ہے؟ پہچانتے نہیں تھے۔ آنحضرت ﷺ تشریف لے گئے، جا کر دیکھا تو یہ وہی اسود راعی چرواہے کی لاش تھی، نبی کریم سرورِدو عالم ﷺ نے اس کو دیکھ کر ارشاد فرمایا کہ یہ شخص بھی عجیب وغریب انسان ہے، یہ ایسا انسان ہے کہ اس نے اللہ کے لئے کوئی سجدہ نہیں کیا، ایک نماز نہیں پڑھی، اس نے کوئی روزہ نہیں رکھا، اس نے ایک پیسہ اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کیا، لیکن میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ یہ سیدھا جنت الفردوس میں پہنچا ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کے جسم کی بدبو کو خوشبو سے تبدیل فرما دیا ہے، میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کا یہ انجام فرمایا۔[1] بہر حال! یہ جو میں عرض کر رہا تھا کہ ایک لمحے میں یہ کلمہ انسان کو جہنم کے ساتویں طبقے سے نکال کر جنت الفردوس کے اعلیٰ ترین طبقے تک پہنچا دیتا ہے، کوئی مبالغہ کی بات نہیں، درحقیقت اللہ تعالیٰ نے یہ کلمہ ایسا ہی بنایا ہے۔

کلمہ طیبہ پڑھ لینا، معاہدہ کرنا ہے

لیکن سوال یہ ہے کہ یہ کلمہ جو اتنا بڑا انقلاب برپا کرتا ہے کہ جو پہلے دوست تھے وہ دشمن بن گئے، جو پہلے دشمن تھے وہ اب دوست بن گئے، بدر کے میدان میں باپ نے بیٹے کے خلاف اور بیٹے نے باپ کے خلاف تلوار اٹھائی ہے اس کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی وجہ سے، تو اتنا بڑا

(۱) البدایة والنهایة (۶۰۹/۴-۶۱۱)

انقلاب جو برپا ہو رہا ہے، کیا یہ کوئی منتر ہے یا کوئی جادو ہے کہ یہ منتر پڑھا اور جادو کے کلمات زبان سے ادا کیے اور اس کے بعد انسان کے اندر انقلاب برپا ہو گیا۔ ان الفاظ میں کوئی تاثیر ہے یا کیا بات ہے؟ حقیقت میں یہ کوئی منتر یا جادو یا طلسم قسم کے کلمات نہیں، حقیقت میں اس کلمہ کے ذریعہ جو انقلاب برپا ہوتا ہے یا وہ اس واسطے ہوتا ہے کہ جب میں نے کہہ دیا کہ اشھد ان لا الٰہ الا اللہ میں گواہی دیتا ہوں اس بات کی کہ اس کائنات میں اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ میں نے ایک معاہدہ کرلیا اور ایک اقرار کرلیا اس بات کا کہ آئندہ حکم مانوں گا تو صرف اللہ کا مانوں گا، اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم کے آگے سر جھکاؤں گا اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے علاوہ کسی اور کو اپنا معبود قرار نہیں دوں گا، کسی اور کی بات اللہ کے خلاف نہیں مانوں گا۔ یہ ایک معاہدہ ہے جو انسان نے کرلیا اور جب اللہ کو الٰہ قرار دے لیا اور محمد رسول اللہ ﷺ کو اللہ کا رسول مان لیا، جس کے معنی یہ ہوئے کہ محمد رسول اللہ ﷺ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جو پیغام لے کر آئے ہیں، اس کے آگے سر تسلیم خم کردوں گا، چاہے سمجھ میں آئے یا نہ آئے، چاہے عقل مانے یا نہ مانے، دل چاہے یا نہ چاہے، لیکن اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کا جب حکم آگیا تو اس کے بعد پھر اس کی سرتابی کرنے کی مجال نہیں ہوگی۔ یہ ہے معاہدہ، یہ ہے اقرار، یہ ہے میثاق، یہ ہے اعلان اس بات کا کہ آج سے میں نے اپنی زندگی کو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی مرضی کے تابع بنالیا۔ انسان جب یہ اقرار کرلیتا ہے اور یہ معاہدہ کرلیتا ہے تو اس دن سے وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے اور اس کی زندگی میں اتنا بڑا انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔

کلمہ طیبہ کے تقاضے

اس سے پتہ چلا کہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ یہ محض کوئی زبانی جمع خرچ نہیں ہے کہ زبان سے کہہ لیا اور بات ختم ہو گئی، بلکہ آپ نے جس دن یہ کلمہ پڑھا، اس دن آپ نے اپنے آپ کو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے حوالے کر دیا اور اس بات کا وعدہ کرلیا کہ اب میری کچھ نہیں چلے گی، اب تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم کے تابع زندگی گزاروں گا۔ لہٰذا اس کلمہ لا الٰہ الا اللہ کے کچھ تقاضے ہیں کہ زندگی گزارو تو کس طرح گزارو، عبادت کس طرح کرو، لوگوں کے ساتھ معاملات کس طرح کرو، اخلاق تمہارے کیسے ہوں، معاشرت تمہاری کیسی ہو، زندگی کے ایک ایک شعبے میں ہدایات ہیں جو اس کلمے کے دائرہ کے اندر آتی ہیں، اور وہ ہدایات سرکارِ دو عالم ﷺ زبانِ مبارک سے بھی دے کر گئے ہیں اور اپنے افعال سے بھی، اپنی زندگی کی ایک ایک نقل وحرکت سے اور ایک ایک ادا سے آپ ﷺ دین کا طریقہ سکھا کر اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ اب مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے احکام کا علم حاصل کر کے اس کے مطابق اپنی زندگی گزارے، اور زندگی اس کے مطابق

گزارنے کا نام ہی درحقیقت تقویٰ ہے، تقویٰ کے معنی ہیں اللہ کا ڈر، کہیں ایسا تو نہیں کہ میں نے اللہ تبارک وتعالیٰ کے حضور معاہدہ تو کرلیا لیکن میں جب آخرت میں باری تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہوں تو مجھے شرمندگی اٹھانی پڑے کہ جو معاہدہ میں نے کیا تھا، میں نے اس معاہدہ کو پورا نہیں کیا، اس بات کا خوف اور اس بات کے ڈر کا نام ہے تقویٰ!

تقویٰ حاصل کرنے کا طریقہ

پورا قرآن کریم اس سے بھرا ہوا ہے کہ اے ایمان والو! تقویٰ اختیار کرو، سارے دین کا خلاصہ اس تقویٰ کے اندر آجاتا ہے۔

اور پھر فرمایا کہ:

﴿وَكُونُوا مَعَ الصَّدِقِينَ﴾ (۱)

اللہ تبارک وتعالیٰ کا کلام بھی عجیب وغریب ہے، کلام اللہ کے عجیب وغریب اعجازات ہیں، ایک جملہ کے اندر باری تعالیٰ جتنا کچھ انسان کے کرنے کا کام ہوتا ہے وہ بھی سارے کا سارا بتادیتے ہیں اور پھر اس پر عمل کرنے کا جو طریقہ ہے اور اس کا جو آسان راستہ ہے وہ بھی اپنی رحمت سے اپنے بندوں کو بتادیتے ہیں کہ ویسے کرنا تمہارے لئے مشکل ہوگا، ہم تمہیں اس کا راستہ بتائے دیتے ہیں۔ فرمایا کہ اے ایمان والو! تقویٰ اختیار کرو، تقویٰ اختیار کرلیا تو اب اس کے بعد کسی چیز کی ضرورت نہیں رہتی، تقویٰ میں سبھی کچھ آگیا، لیکن سوال پیدا ہوا کہ تقویٰ کیسے اختیار کریں؟ تقویٰ تو بڑا اونچا مقام ہے، اس کے لئے بڑے تقاضے ہیں، بڑی شرائط ہیں، وہ کیسے اختیار کریں، کہاں سے اختیار کریں؟ اس کا جواب اگلے جملے میں باری تعالیٰ نے دے دیا کہ ویسے تقویٰ اختیار کرنا تمہارے لئے مشکل ہوگا لیکن آسان راستہ تمہیں بتائے دیتے ہیں، وہ یہ ہے کہ كُونُوا مَعَ الصَّدِقِينَ سچے لوگوں کے ساتھی بن جاؤ، صادقین کے ساتھی بن جاؤ۔ سچے کے معنی صرف یہی نہیں کہ وہ سچ بولتے ہوں اور جھوٹ نہ بولتے ہوں، بلکہ سچے کے معنی یہ ہیں کہ جو زبان کے سچے، جو بات کے سچے، جو معاملات کے سچے، جو معاشرت کے سچے، جو اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ اپنے کیے ہوئے معاہدے میں سچے ہیں، ان کے ساتھی بن جاؤ اور ان کی صحبت اختیار کرو، ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا شروع کرو، جب اُٹھنا بیٹھنا شروع کروگے تو اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے تقویٰ کی جھلک تمہارے اندر بھی پیدا فرمادیں گے۔ یہ ہے تقویٰ حاصل کرنے کا طریقہ اور اسی طریقہ سے دین منتقل ہوتا چلا آیا ہے، نبی کریم سرکارِ دوعالم محمد مصطفیٰ ﷺ کے وقت سے لے کر آج تک جو دین آیا ہے، وہ سچے لوگوں کی صحبت سے آیا، صادقین کی صحبت سے آیا۔

(۱) التوبة: ۱۱۹

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دین کہاں سے حاصل کیا؟

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دین کہاں سے حاصل کیا؟ کسی یونیورسٹی میں پڑھا؟ کسی کالج میں پڑھا، کوئی سرٹیفکیٹ حاصل کیا؟ کوئی ڈگری لی، ایک ہی یونیورسٹی تھی وہ سرکارِ دو عالم محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اُٹھائی، اس سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے دین کا رنگ چڑھا دیا، ایسا چڑھایا ایسا چڑھایا کہ اس آسمان وزمین کی نگاہوں نے دین کا ایسا چڑھا ہوا رنگ نہ اس سے پہلے کبھی دیکھا تھا، نہ اس کے بعد دیکھ سکیں گی۔ وہ لوگ جو دنیا کے معمولی معمولی معاملات کے اُوپر جان قربان کرنے کے لئے تیار ہوتے تھے، ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن جاتے تھے، ایک دوسرے کی جان لینے پر آمادہ ہوجاتے تھے، ان کی نظر میں دنیا ایسی بے حقیقت ہوئی اور ایسی ذلیل ہوئی اور ایسی خوار ہوئی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے آگے اور آخرت کے بہبود کے آگے ساری دنیا کے خزانوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔

حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کا زہد

حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کا واقعہ یاد آیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد مبارک میں قیصر وکسریٰ کی بڑی بڑی سلطنتیں جو اس زمانے کی سپر پاور سمجھی جاتی تھیں (جیسے آج کل روس اور امریکہ) ان کا غرور اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں خاک میں ملا دیا۔ ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو شام کا گورنر مقرر فرمایا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ شام کے دورے پر تشریف لے گئے کہ دیکھیں کیا حالات ہیں؟ وہاں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ اپنے بھائی کا گھر دیکھوں، دل میں شاید یہ خیال ہوگا کہ ابوعبیدہ بن جراح مدینے سے آئے ہیں اور شام کے گورنر بن گئے ہیں، مدینہ منورہ کا علاقہ بے آب وگیاہ تھا اور اس میں کوئی زرخیزی نہیں تھی، معمولی کھیتی باڑی ہوا کرتی تھی اور شام میں کھیت لہلہا رہے ہیں، زرخیز زمینیں ہیں اور روم کی تہذیب پوری طرح وہاں پر مسلط ہے تو یہاں آنے کے بعد کہیں ایسا تو نہیں کہ دنیا کی محبت ان کے دل میں پیدا ہوگئی ہو اور اپنا کوئی عالی شان گھر بنالیا ہو جس میں بڑے عیش وعشرت کے ساتھ رہتے ہوں۔ شاید اسی قسم کا کچھ خیال حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دل میں پیدا ہوا ہو، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اپنے بھائی یعنی ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا گھر دیکھنا چاہتا ہوں۔

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے جواب میں کہا کہ امیر المؤمنین! آپ میرا گھر دیکھ کر کیا کریں گے، آپ میرا گھر دیکھیں گے تو آپ کو شاید آنکھیں نچوڑنے کے سوا کوئی فائدہ حاصل نہ ہو۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ بھائی کا گھر دیکھوں۔

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ ایک دن ان کو اپنے ساتھ لے کر چلے، چلتے جارہے ہیں چلتے جارہے ہیں، کہیں گھر نظر ہی نہیں آتا، جب شہر کی آبادی سے باہر نکلنے لگے تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ بھائی! میں تمہارا گھر دیکھنا چاہتا تھا، تم کہاں لے جارہے ہو؟

فرمایا: امیر المؤمنین! میں آپ کو اپنے گھر ہی لے جارہا ہوں، بستی سے نکل گئے تو لے جاکر ایک گھاس پھونس کے جھونپڑے کے سامنے کھڑا کر دیا اور کہا: امیر المؤمنین! یہ میرا گھر ہے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اس جھونپڑے کے اندر داخل ہوئے، چاروں طرف نظریں دوڑا کر دیکھنے لگے، کوئی چیز ہی نظر نہیں آتی، ایک مصلّی بچھا ہوا ہے، اس کے سوا پورے اس جھونپڑے کے اندر کوئی اور چیز نہیں،

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ ابوعبیدہ! تم زندہ کس طرح رہتے ہو، یہ تمہارے گھر کا سامان کہاں ہے؟

اس پر حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ آگے بڑھے، بڑھ کر ایک طاق سے پیالہ اُٹھا کر لائے، دیکھا تو اس پیالے کے اندر پانی پڑا ہوا تھا اور اس میں روٹی کے کچھ سوکھے ٹکڑے بھیگے ہوئے تھے اور عرض کیا ''امیر المؤمنین! مجھے اپنی مصروفیات اور ذمہ داریوں میں مصروف رہ کر اتنا وقت نہیں ملتا کہ میں کھانا پکا سکوں، اس لئے میں یہ کرتا ہوں کہ ہفتہ بھر کی روٹیاں ایک خاتون سے پکوالیتا ہوں اور وہ ہفتے بھر کی روٹی پکا کر مجھے دے جاتی ہے، میں اس کو اس پانی میں بھگو کر کھالیتا ہوں، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے زندگی اچھی گزر جاتی ہے''

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ تمہارا اور سامان؟

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اور سامان کیا یا امیر المؤمنین! یہ سامان اتنا ہے کہ قبر تک پہنچانے کے لئے کافی ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے دیکھا تو رو پڑے اور کہا کہ ابوعبیدہ! اس دنیا نے ہم میں سے ہر شخص کو بدل دیا، لیکن خدا کی قسم تم وہی ہو جو سرکارِ دو عالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ امیر المؤمنین! میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ آپ میرے گھر پر جائیں گے تو آنکھیں نچوڑنے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ (۱)

یہ وہ شخص ہے جو شام کا گورنر تھا، آج اس شام کے اندر جو ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے زیرِ نگیں تھا، مستقل چار ملک ہیں، اس شام کے گورنر تھے، ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کے قدموں میں دنیا کے خزانے روزانہ ڈھیر ہو رہے ہیں، روم کی بڑی بڑی طاقتیں ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا نام سن کر لرزہ براندام ہیں، ان کے دانت کھٹے ہو رہے ہیں ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے نام سے، اور روم کے محلّات کے خزانے، زر و جواہر اور زیورات لاکر

(۱) حلیة الاولیاء (۱/۱۰۱)، الاصابة (۲/۲۵۳)، حیاة الصحابة (۲/۳۷۹)

ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے قدموں میں ڈھیر کیے جا رہے ہیں، لیکن ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اسے ٹھوکر مار کر اس پھونس کے جھونپڑے میں رہ رہے ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جو جماعت تیار کی تھی، حقیقت یہ ہے کہ اس روئے زمین پر ایسی جماعت مل ہی نہیں سکتی، دنیا کو ایسا حقیر اور ایسا خوار کر کے رکھا کہ دنیا کی کوئی حقیقت آنکھوں میں باقی رہی ہی نہیں تھی، اس واسطے کہ ہر وقت دل میں یہ خیال لگا ہوا تھا کہ کسی وقت اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہونا ہے، زندگی ہے تو وہ زندگی ہے، یہ چند روزہ زندگی کیا حقیقت رکھتی ہے، یہ حقیقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں جاگزیں فرمادی تھی، اسی کا نام تقویٰ ہے۔ یہ کہاں سے حاصل ہوئی؟ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے حاصل ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں چند دن جس نے گزار لیے، اس کے دل میں دنیا کی حقیقت بھی واضح ہوگئی اور آخرت بھی سامنے آگئی، تو دین اس طریقہ سے چلتا آیا ہے۔

دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے، صحابہ کرام سے تابعین نے اور تابعین سے تبع تابعین نے اور اسی طریقہ سے آخر دم تک دین اس طرح پھیلا ہے اور پہنچا ہے۔ جن کی زندگیاں تقویٰ کے سانچے میں ڈھلی ہوتی ہیں، جو کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے تقاضوں کو جاننے اور سمجھنے والے ہوتے ہیں، ان کی صحبت سے یہ چیز حاصل ہوتی ہے، یہ کتابیں پڑھنے سے نہیں آتی، یہ محض تقریرین لینے سے یا کر لینے سے نہیں آتی، یہ آتی ہے کسی اللہ والے کی صحبت میں کچھ وقت گزارنے سے، اس کا طرزِ عمل دیکھنے سے، اس کی زندگی کی ادا کو پڑھنے سے، اور اس طرح دین کا یہ رنگ انسان کے اندر منتقل ہوتا ہے اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں کتابیں پڑھ کر دین حاصل کرلوں گا تو یہ ان کی خام خیالی ہے۔ بالکل صحیح بات کہی ہے۔

نہ کتابوں سے نہ کالج سے نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

دین کتاب پڑھ لینے سے نہیں آتا، لفاظیوں سے نہیں آتا، بلکہ بزرگوں کی نظر سے اور ان کی صحبت سے دین آتا ہے۔ باری تعالیٰ نے فرمایا کہ تقویٰ اختیار کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ سچے لوگوں کی اور اللہ والوں کی صحبت اختیار کرو، تو اس صحبت کے نتیجے میں اللہ تبارک وتعالیٰ تمہیں بھی متقی بنادیں گے، تمہارے اندر بھی وہ رنگ پیدا ہو جائے گا۔

سچے اور متقی لوگ کہاں سے لائیں؟

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سچے لوگ کہاں سے لائیں؟ ہر شخص دعویٰ کرتا ہے کہ میں بھی سچا ہوں، میں بھی صادق ہوں اور اسی فہرست میں داخل ہوں، بلکہ لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ صاحب! آج کل تو دھوکہ بازی کا دور ہے، ہر شخص لمبا کرتا پہن کر اور عمامہ سر پر لگا کر اور داڑھی لمبی کر کے کہتا ہے کہ میں بھی صادقین میں داخل ہوں، اقبال نے کہا تھا۔

خداوندا یہ تیرے سادہ دِل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

یہ حالت نظر آتی ہے تو اب کہاں سے لائیں وہ صادقین جن کی صحبت انسان کو کیمیا بنا دیتی ہے، وہ کہاں سے لائیں اللہ والے جن کی ایک نظر سے انسان کی زندگیاں بدل جاتی ہیں، وہ جنید وہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ جیسے بڑے بڑے اولیاء کرام اس دور میں کہاں سے لے کر آئیں، کس طرح ان کی صحبت حاصل کریں، آج کل تو عیاری کا اور مکاری کا دور ہے۔

ہر چیز میں ملاوٹ

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ اس کا ایک بڑا عمدہ جواب دیا کرتے تھے، وہ فرماتے تھے کہ میاں! لوگ یہ کہتے ہیں کہ آج کل صادقین کہاں سے تلاش کریں؟ ہر جگہ عیاری مکاری کا دور ہے، تو بات دراصل یہ ہے کہ یہ زمانہ ہے ملاوٹ کا، ہر چیز میں ملاوٹ، گھی میں ملاوٹ، چینی میں ملاوٹ، آٹے میں ملاوٹ، دنیا کی ہر چیز میں ملاوٹ، یہاں تک کہ کہتے ہیں کہ زہر میں بھی ملاوٹ ہے۔ کسی نے لطیفہ سنایا کہ ایک شخص نے ہر چیز میں ملاوٹ دیکھی کہ کوئی چیز خالص نہیں ملتی تو عاجز آ گیا، اس نے سوچا کہ میں خودکشی کرلوں، اس دنیا میں زندہ رہنا فضول ہے جہاں پر کوئی چیز خالص نہیں ملتی، نہ آٹا خالص ملے، نہ چینی خالص ملے، نہ گھی خالص ملے، کچھ بھی خالص نہیں، تو اس نے سوچا کہ خودکشی کرلینی چاہئے اور اس دنیا سے چلے جانا چاہئے۔ چنانچہ وہ بازار سے زہر خرید کر لایا اور وہ زہر کھالیا، اب کھا کر بیٹھا ہے انتظار میں کہ اب موت آئے اور تب موت آئے، لیکن موت ہے کہ آتی ہی نہیں، معلوم ہوا کہ زہر بھی خالص نہیں تھا، تو دنیا کی کوئی چیز خالص نہیں، ہر چیز میں ملاوٹ ہے۔

حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ دنیا کی ہر چیز میں ملاوٹ ہے تو بھائی آٹے میں بھی ملاوٹ ہے اور یہ آٹا بھی خالص نہیں ملتا، لیکن یہ بتاؤ کہ اگر آٹا خالص نہیں ملتا تو کسی نے

آٹا کھانا چھوڑ دیا کہ صاحب! آٹا تو اب خالص ملتا نہیں، لہٰذا اب آٹا نہیں کھائیں گے، اب تو بھس کھایا کریں گے، یا گھی اگر خالص نہیں ملتا تو کسی نے گھی کھانا چھوڑ دیا کہ صاحب! گھی تو اب خالص ملتا نہیں، لہٰذا اب مٹی کا تیل استعمال کریں گے، کسی نے بھی باوجود اس ملاوٹ کے دور کے نہ آٹا کھانا چھوڑا، نہ چینی کھانی چھوڑی، نہ گھی کھانا چھوڑا، بلکہ تلاش کرتا ہے کہ گھی کونسی دکان پر اچھا ملتا ہے اور کونسی بستی میں اچھا ملتا ہے، آدمی بھیج کر وہاں سے منگواؤ، مٹھائی کونسی دکان والا اچھی بناتا ہے، آٹا کس جگہ سے اچھا ملتا ہے، وہاں سے جاکر تلاش کر کے لائے گا، اسی کو حاصل کرے گا، اسی کو استعمال کرے گا۔ تو فرمایا کہ بے شک آٹا گھی چینی کچھ خالص نہیں ملتی، لیکن تلاش کرنے والے کو آج بھی مل جاتی ہے۔ اسی طرح مولوی بھی خالص نہیں ملتا، لیکن تلاش کرنے والے کو آج بھی مل جاتا ہے، اگر کوئی اللہ کا بندہ تلاش کرنا چاہے، طلب کرنا چاہے تو اس کو آج کے دور میں بھی صادقین مل جائیں گے، یہ کہنا بالکل شیطان کا دھوکہ ہے کہ آج کے دور میں صادقین ختم ہوئے۔ ارے جب اللہ تبارک وتعالیٰ فرمارہے ہیں کہ تم صادقین کے ساتھی بن جاؤ، یہ حکم کیا صرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور کے ساتھ مخصوص تھا کہ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس پر عمل کر سکیں، بیسویں صدی میں آنے والے اس پر عمل نہیں کر سکتے؟ ظاہر ہے کہ قرآن کریم کے ہر حکم پر قیامت تک جب تک مسلمان باقی ہیں عمل کرنا ممکن رہے گا، تو اس کے معنی خود بخود نکال لو کہ صادقین اس وقت بھی ہیں، ہاں تلاش کرنے کی بات ہے، یہ نہیں کہ صاحب ملتا ہی نہیں، لہٰذا بیٹھے ہیں، تلاش کرو گے اور طلب پیدا کرو گے تو مل جائے گا۔

جیسی روح ویسے فرشتے!!!

حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ میاں! آج کل لوگوں کا حال یہ ہے کہ خود خواہ کسی حالت میں ہوں، گناہ میں، معصیت میں، کبائر میں، فسق و فجور میں مبتلا ہوں، لیکن اپنے لئے صادقین تلاش کریں گے تو معیار سامنے رکھیں گے جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا، شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا اور بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا اور بڑے بڑے اولیاء کرام کا جن کے نام سن رکھے ہیں کہ صاحب! ہمیں تو ایسا صادق چاہئے جیسا کہ جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ تھے یا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ حالانکہ اصول یہ ہے کہ جیسی روح ویسے فرشتے، جیسے تم ہو ویسے ہی تمہارے مصلح ہوں گے، تم جس معیار کے ہو تمہارے لئے یہی لوگ کافی ہو سکتے ہیں، جنید و شبلی کے معیار کے نہ سہی لیکن تمہارے لئے یہ بھی کافی ہیں۔

مسجد کے مؤذن کی صحبت اختیار کرلو

بلکہ میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ فرماتے تھے کہ میں تو قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص

اللہ تعالیٰ کی طلب لے کر اپنی مسجد کے ان پڑھ مؤذن کی صحبت میں جا کر بیٹھے گا تو اس کی صحبت سے بھی فائدہ پہنچے گا۔ اس واسطے کہ وہ مؤذن کم از کم پانچ وقت اللہ کا نام بلند کرتا ہے، اس کی آواز فضاؤں میں پھیلتی ہے، وہ اللہ کے کلمے کو بلند کرتا ہے، اس کی صحبت میں جا کر بیٹھو، تمہیں اس سے بھی فائدہ پہنچے گا۔ یہی شیطان کا دھوکا ہے کہ صاحب! ہمیں تو اس معیار کا بزرگ اور اس معیار کا مصلح چاہئے، یہ انسان کا اپنے آپ کو دھوکا دینے کی بات ہے، حقیقت میں تمہاری اپنی اصلاح کے واسطے تمہارے معیار کے اور تمہاری سطح کے مصلح آج بھی موجود ہیں۔

بات لمبی ہوگئی، میں عرض یہ کرنا چاہ رہا تھا کہ دین حاصل کرنے کا اور اس کی سمجھ حاصل کرنے کا اور اس پر عمل کرنے کا طریقہ معلوم کرنے کا کوئی راستہ آج کل کے حالات میں اس کے سوا نہیں ہے کہ کسی اللہ والے کو اپنا دامن پکڑا دے، اللہ تبارک وتعالیٰ کسی اللہ والے کی صحبت عطا فرما دے تو اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ دین عطا فرما دیتے ہیں۔

میں آپ حضرات کو مبارک باد پیش کرتا ہوں، بہت سی جگہیں ایسی ہیں کہ وہاں کبھی جا کر یہ بات کہنے کی نوبت آتی ہے تو لوگ پوچھتے ہیں کہ صاحب! ہم کہاں جائیں تو بتلانے کے لئے ذرا دشواری ہوتی ہے، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کا اتنا بڑا کرم ہے کہ آپ اس کا شکر ادا کر ہی نہیں سکتے کہ اس بستی میں جو دور افتادہ بستی ہے، کسی کے منہ پر کوئی بات کہنا اچھا نہیں ہوتا، مگر ہمارا دین وہ ہے جو بے تکلف ہے تو اس بے تکلفی کی وجہ سے عرض کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس بستی کے اندر آپ اور ہم سب پر یہ بڑا فضل فرمایا ہے کہ حضرت مولانا مفتی عبدالشکور صاحب ترمذی دامت برکاتہم العالیہ کو اس بستی کے اندر بھیج دیا، اور انہیں کا یہ نورِ ظہور ہے جو آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، یہ مدرسہ، یہ بڑا اجتماع، یہ مسلمانوں کے اندر دینی جذبات، یہ ذوق وشوق اور یہ جوش وخروش، یہ سب کچھ ایک اللہ والے کے دل کی دھڑکنوں سے نکلنے والی آہوں اور دعاؤں کا نتیجہ ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل وکرم سے یہ نعمت میسر ہے اور ہماری قوم کا حال یہ ہے کہ جب تک نعمت میسر رہتی ہے اس کی قدر نہیں پہچانتے، جب چلی جاتی ہے تو قوم اس کو سر پر بٹھانے کے لئے تیار، اس کا عرس منانے کے لئے تیار، اس کے مزار پر چادریں چڑھانے کے لئے تیار، اس کو آسمان پر اُٹھانے کے لئے تیار، لیکن جب تک وہ نعمت موجود ہے قدر نہیں پہچانیں گے، قدر نہیں مانیں گے، ہمیشہ اس میں عیب ہی نظر آتے رہیں گے، تنقیدیں ہی کرتے رہیں گے، لہٰذا جہاں کوئی اللہ والا بیٹھ گیا ہو، اس کو بہت ہی غنیمت سمجھ کو اس سے استفادہ کی کوشش کیجئے۔

واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کو وہ مقام بخشا ہے کہ لوگ سفر کر کے آئیں اور آ کر استفادہ کریں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس بستی کے اندر آپ کو یہ نعمتِ عظمیٰ عطا

فرمائی ہوئی ہے۔ میں دور سے آنے والا، اوّل تو کچھ آتا جاتا نہیں، کوئی اہلیت نہیں، کوئی صلاحیت نہیں، میں آپ سے کیا عرض کروں، لیکن اگر اتنی بات آپ حضرات کے ذہن میں بیٹھ جائے اور اس نعمت کی قدر پہچاننے کی کوشش کرلیں اور اس سے استفادہ کی کوشش کرلیں تو میں سمجھتا ہوں کہ بہت بڑے بڑے جلسوں اور تقریروں کا خلاصہ اور اس کا فائدہ حاصل ہوگیا، یوں تو جلسے اور تقریریں اور کہنا سننا تو بہت ہوتا رہتا ہے اور عام طور پر لوگ کہتے بھی ہیں، سنتے بھی ہیں، لیکن کم از کم اگر دل میں یہ داعیہ اور یہ شوق پیدا ہو جائے کہ کسی اللہ والے کی صحبت سے استفادہ کرنا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس مجلس کا فائدہ حاصل ہوگیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ مجھے بھی اور آپ کو بھی دین کی صحیح فہم عطا فرمائے، صادقین کی صحبت عطا فرمائے، ان کی محبت اور ان کی خدمت کے ذریعہ دین کا صحیح مزاج ہمارے دلوں کے اندر پیدا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ



عقل کا دائرہ کار ☆

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ وَعَلٰى آلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ أَجْمَعِيْنَ. أَمَّا بَعْدُ.

میرے لئے اس اکیڈمی کے مختلف تربیتی کورسوں میں حاضری کا یہ پہلا موقع نہیں ہے، بلکہ اس سے پہلے بھی جو تربیتی کورس منعقد ہوتے رہے ہیں، ان سے بھی خطاب کرنے کا موقع ملا۔ اس مرتبہ مجھ سے یہ فرمائش کی گئی کہ میں ''اسلامائیزیشن آف لاز'' (Islamisation of Laws) کے سلسلے میں آپ حضرات سے کچھ گفتگو کروں۔ اتفاق سے ''اسلامائیزیشن آف لاز'' کا موضوع بڑا طویل اور ہمہ گیر ہے اور مجھے اس وقت ایک اور جگہ بھی جانا ہے، اس لئے وقت بھی مختصر ہے۔ لیکن اس مختصر سے وقت میں ''اسلامائیزیشن آف لاز'' کے صرف ایک پہلو کی طرف آپ حضرات کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

''بنیاد پرست'' ایک گالی بن چکی ہے

جب یہ آواز بلند ہوتی ہے کہ ہمارا قانون، ہماری معیشت، ہماری سیاست یا ہماری زندگی کا ہر پہلو اسلام کے سانچے میں ڈھلنا چاہئے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں ڈھلنا چاہئے؟ اس کی کیا دلیل ہے؟ یہ سوال اس لئے پیدا ہوا کہ آج ہم ایک ایسے معاشرے میں زندگی گزار رہے ہیں جس میں سیکولر تصورات (Secular Ideas) اس دنیا کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں اور یہ بات تقریباً ساری دنیا میں بطور ایک مسلمہ مان لی گئی ہے کہ کسی ریاست کو چلانے کا بہترین سسٹم سیکولر سسٹم (Secular System) ہے اور اسی سیکولرازم (Secularism) کے دائرے میں رہتے ہوئے ریاست کو کامیابی کے ساتھ چلایا جاسکتا ہے۔ ایسے ماحول میں جہاں دنیا کی بیشتر ریاستیں بڑی سے لے کر چھوٹی تک، وہ نہ صرف یہ کہ سیکولر (Secular) ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں بلکہ اس پر فخر بھی کرتی ہیں، ایسے معاشرے میں یہ آواز بلند کرنا کہ ''ہمیں اپنے ملک کو، اپنے قانون کو، اپنی معیشت اور

☆ اصلاحی مواعظ (۲/۱۴۷-۱۷۰)

سیاست کو، اپنی زندگی کے ہر شعبے کو اسلامائیز (Islamize) کرنا چاہئے" یا دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے کہ معاشرے کو چودہ سو سال پرانے اصولوں کے ماتحت چلانا چاہئے تو یہ آواز آج کی اس دنیا میں اجنبھی اور اجنبی معلوم ہوتی ہے اور اس کو طرح طرح کے طعنوں سے نوازا جاتا ہے۔ بنیاد پرستی اور فنڈامینٹل ازم (Fundamentalism) کی اصطلاح ان لوگوں کی طرف سے ایک گالی بنا کر دنیا میں مشہور کردی گئی ہے، اور ان کی نظر میں ہر وہ شخص بنیاد پرست (Fundamentalist) ہے جو یہ کہے کہ "ریاست کا نظام دین کے تابع ہونا چاہئے، اسلام کے تابع ہونا چاہئے۔" ایسے شخص کو بنیاد پرست کا خطاب دے کر بدنام کیا جارہا ہے، حالانکہ اگر اس لفظ کے اصل معنی پر غور کیا جائے تو یہ کوئی بُرا لفظ نہیں تھا۔ فنڈامینٹلسٹ کے معنی یہ ہیں کہ جو بنیادی اصولوں (Fundamental Principles) کو اختیار کرے۔ لیکن ان لوگوں نے اس کو گالی بنا کر مشہور کردیا ہے۔

اسلامائیزیشن کیوں؟

آج کی مجلس میں، میں صرف اس سوال کا جواب دینا چاہتا ہوں کہ ہم کیوں اپنی زندگی کو اسلامائیز (Islamize) کرنا چاہتے ہیں؟ اور ہم ملکی قوانین کو اسلام کے سانچے میں کیوں ڈھالنا چاہتے ہیں؟ جبکہ دین کی تعلیمات چودہ سو سال بلکہ بیشتر تو ہزار ہا سال پرانی ہیں۔

ہمارے پاس عقل موجود ہے

اس سلسلے میں، میں جس پہلو کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ایک سیکولر ریاست (Secular State) جس کو لادینی ریاست کہا جائے، وہ اپنے نظامِ حکومت اور نظامِ زندگی کو کس طرح چلائے، اس کے لئے اس کے پاس کوئی اصول موجود نہیں ہیں بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ ہمارے پاس عقل موجود ہے، ہمارے پاس مشاہدہ اور تجربہ موجود ہے، اس عقل، مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر ہم یہ فیصلہ کرسکتے ہیں کہ ہمارے اس دور کی ضروریات کیا ہیں؟ اس کے تقاضے کیا ہیں؟ اور پھر اس کے لحاظ سے کیا چیز ہماری مصلحت کے مطابق ہے؟ اور پھر اسی مصلحت کے مطابق ہم اپنے قوانین کو ڈھال سکتے ہیں۔ بدلتے ہوئے حالات میں ہم اس کے اندر تبدیلی لاسکتے ہیں اور ترقی کرسکتے ہیں۔

کیا عقل آخری معیار ہے؟

ایک سیکولر نظامِ حکومت میں عقل، تجربے اور مشاہدے کو آخری معیار قرار دے دیا گیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ معیار کتنا مضبوط ہے؟ کیا یہ معیار اس لائق ہے کہ قیامت تک آنے والی انسانیت

کی رہنمائی کر سکے؟ کیا یہ معیار تنہا عقل کے بھروسے پر، تنہا مشاہدے اور تجربے کے بھروسے پر ہمارے لئے کافی ہو سکتا ہے؟

ذرائع علم

اس کے جواب کے لئے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ کوئی بھی نظام جب تک اپنی پشت پر اپنے پیچھے علمی حقائق کا سرمایہ نہ رکھتا ہو اس وقت تک وہ کامیابی سے نہیں چل سکتا۔ اور کسی بھی معاملے میں علم حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو کچھ ذرائع عطا فرمائے ہیں۔ ان ذرائع میں سے ہر ایک کا ایک مخصوص دائرۂ کار ہے۔ اس دائرۂ کار تک وہ ذریعہ کام دیتا ہے اور اس سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے، لیکن اس سے آگے وہ ذریعہ کام نہیں دیتا ہے، اس سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔

حواسِ خمسہ کا دائرۂ کار

مثال کے طور پر انسان کو سب سے پہلے جو ذرائع علم عطا ہوئے وہ اس کے حواسِ خمسہ ہیں، آنکھ، کان، ناک اور زبان وغیرہ۔ آنکھ کے ذریعہ دیکھ کر بہت سی چیزوں کا علم حاصل ہوتا ہے۔ زبان کے ذریعہ چکھ کر علم حاصل ہوتا ہے۔ ناک کے ذریعہ سونگھ کر علم حاصل ہوتا ہے۔ ہاتھ کے ذریعہ چھو کر حاصل ہوتا ہے۔ لیکن علم کے یہ پانچ ذرائع جو مشاہدے کی سرحد میں آتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کا ایک دائرۂ کار ہے۔ اس دائرۂ کار سے باہر وہ ذریعہ کام نہیں کرتا۔ آنکھ دیکھ سکتی ہے لیکن سن نہیں سکتی۔ کان سن سکتا ہے، لیکن دیکھ نہیں سکتا۔ ناک سونگھ سکتی ہے، دیکھ نہیں سکتی۔ اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ میں آنکھ تو بند کر لوں اور کان سے دیکھنا شروع کر دوں تو اس شخص کو ساری دنیا احمق کہے گی۔ اس لئے کہ کان اس کام کے لئے نہیں بنایا گیا۔ اگر کوئی شخص اس سے کہے کہ تمہارا کان نہیں دیکھ سکتا، اس لئے کان سے دیکھنے کی تمہاری کوشش بالکل بیکار ہے، جواب میں وہ شخص کہے کہ اگر کان دیکھ نہیں سکتا تو وہ بیکار چیز ہے تو اس کو ساری دنیا احمق کہے گی۔ اس لئے کہ وہ اتنی بات بھی نہیں جانتا کہ کان کا ایک دائرۂ کار ہے، اس حد تک وہ کام کرے گا۔ اس سے اگر آنکھ کا کام لینا چاہو گے تو وہ نہیں کرے گا۔

دوسرا ذریعۂ علم ''عقل''

پھر جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں علم کے حصول کے لئے یہ پانچ حواس عطا فرمائے ہیں، ایک مرحلہ پر جا کر ان پانچوں حواس کی پرواز ختم ہو جاتی ہے۔ اس مرحلہ پر نہ تو آنکھ کام دیتی ہے، نہ کان کام دیتا ہے، نہ زبان کام دیتی ہے، نہ ہاتھ کام دیتا ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں اشیا براہِ راست مشاہدہ کی

گرفت میں نہیں آتیں۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے ہمیں اور آپ کو علم کا ایک اور ذریعہ عطا فرمایا ہے اور وہ ہے ''عقل''، جہاں پر حواسِ خمسہ کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں وہاں پر ''عقل'' کام آتی ہے۔ مثلاً میرے سامنے یہ میز رکھی ہے، میں آنکھ سے دیکھ کر یہ بتا سکتا ہوں کہ اس کا رنگ کیا ہے؟ ہاتھ سے چھو کر معلوم کر سکتا ہوں کہ یہ سخت لکڑی کی ہے، اور اس پر فارمیکا لگا ہوا ہے۔ لیکن اس بات کا علم کہ یہ میز وجود میں کیسے آئی؟ یہ بات میں نہ تو آنکھ سے دیکھ کر بتا سکتا ہوں، نہ کان سے سن کر، نہ ہاتھ سے چھو کر بتا سکتا ہوں۔ اس لئے کہ اس کے بننے کا عمل میرے سامنے نہیں ہوا۔ اس موقع پر میری عقل میری رہنمائی کرتی ہے کہ یہ چیز جو اتنی صاف ستھری بنی ہوئی ہے، خود بخود وجود میں نہیں آسکتی۔ اس کو کسی بنانے والے نے بنایا ہے، اور وہ بنانے والا اچھا تجربہ کار ماہر بڑھئی (Carpenter) ہے، جس نے اس کو خوبصورت شکل میں بنایا ہے۔ لہٰذا یہ بات کہ اس کو کسی کارپینٹر نے بنایا ہے مجھے میری عقل نے بتائی۔ تو جس جگہ پر میرے حواسِ خمسہ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا، وہاں میری عقل آئی اور اس نے میری رہنمائی کر کے ایک دوسرا علم عطا کیا۔

عقل کا دائرہ کار

لیکن جس طرح ان پانچوں حواس کا دائرۂ کار لامحدود (Unlimited) نہیں تھا، بلکہ ایک حد پر جا کر ان کا دائرۂ کار ختم ہو گیا تھا، اسی طرح عقل کا دائرۂ کار (Jurisdiction) بھی لامحدود (Unlimited) نہیں ہے۔ عقل بھی ایک حد تک انسان کو کام دیتی ہے۔ ایک حد تک رہنمائی کرتی ہے۔ اس حد سے آگے اگر اس عقل کو استعمال کرنا چاہیں گے تو وہ عقل صحیح جواب نہیں دے گی، صحیح رہنمائی نہیں کرے گی۔

تیسرا ذریعۂ علم ''وحی الٰہی''

جس جگہ عقل کی پرواز ختم ہو جاتی ہے، وہاں اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو ایک تیسرا ذریعۂ علم عطا فرمایا ہے۔ اور وہ ہے ''وحی الٰہی'' یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے وحی اور آسمانی تعلیم۔ یہ ذریعۂ علم شروع ہی اس جگہ سے ہوتا ہے جہاں عقل کی پرواز ختم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا جس جگہ ''وحی الٰہی'' آتی ہے، اس جگہ پر عقل کو استعمال کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کہ آنکھ کے کام کے لئے کان کو استعمال کرنا۔ کان کے کام کے لئے آنکھ کو استعمال کرنا۔ اس کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ عقل بیکار ہے۔ نہیں بلکہ وہ کار آمد چیز ہے، بشرطیکہ آپ اس کو اس کے دائرۂ کار (Jurisdiction) میں استعمال کریں۔ اگر اسکے دائرۂ کار سے باہر استعمال کریں گے تو یہ بالکل ایسا ہی ہو گا جیسے کوئی شخص آنکھ اور کان سے سونگھنے کا کام لے۔

اسلام اور سیکولر نظام میں فرق

اسلام اور ایک سیکولر نظامِ حیات میں یہی فرق ہے کہ سیکولر نظام میں علم کے پہلے دو ذرائع استعمال کرنے کے بعد رک جاتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ انسان کے پاس علم کے حصول کا کوئی تیسرا ذریعہ نہیں ہے، بس ہماری آنکھ، کان، ناک ہے اور ہماری عقل ہے۔ اس سے آگے کوئی اور ذریعۂ علم نہیں ہے۔ اور اسلام یہ کہتا ہے کہ ان دونوں ذرائع کے آگے تمہارے پاس ایک اور ذریعۂ علم بھی ہے اور وہ ہے ''وحی الٰہی''

وحی الٰہی کی ضرورت

اب دیکھنا یہ ہے کہ اسلام کا یہ دعویٰ کہ عقل کے ذریعہ ساری باتیں معلوم نہیں کی جاسکتیں، بلکہ آسمانی ہدایت کی ضرورت ہے، وحی الٰہی کی ضرورت ہے، پیغمبروں اور رسولوں کی ضرورت ہے، آسمانی کتابوں کی ضرورت ہے، اسلام کا یہ دعویٰ ہمارے موجودہ معاشرے میں کس حد تک درست ہے؟

عقل دھوکہ دینے والی ہے

آج کل عقل پرستی (Rationalism) کا بڑا زور ہے اور کہا جاتا ہے کہ ہر چیز کو عقل کی میزان پر پرکھ کر اور تول کر اختیار کریں گے، لیکن عقل کے پاس کوئی ایسا لگا بندھا ضابطہ (Formula) اور کوئی لگا بندھا اصول (Principle) نہیں ہے، جو عالمی حقیقت (Universal Truth) رکھتا ہو۔ جس کو ساری دنیا کے انسان تسلیم کرلیں اور اس کے ذریعہ وہ اپنے خیر و شر اور اچھائی اور برائی کا معیار تجویز کرسکیں۔ کون سی چیز اچھی ہے؟ کون سی چیز بُری ہے؟ کون سی چیز اختیار کرنی چاہئے؟ کون سی چیز اختیار نہیں کرنی چاہئے؟ یہ فیصلہ جب ہم عقل کے حوالے کرتے ہیں تو آپ تاریخ اٹھا کر دیکھ جائیے، اس میں آپ کو یہ نظر آئے گا کہ اس عقل نے انسان کو اتنے دھوکے دیئے ہیں جس کا کوئی شمار اور حد و حساب ممکن نہیں۔ اگر عقل کو اس طرح آزاد چھوڑ دیا جائے تو انسان کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ اس کے لئے میں تاریخ سے چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

بہن سے نکاح خلافِ عقل نہیں

آج سے تقریباً آٹھ سو سال پہلے عالمِ اسلام میں ایک فرقہ پیدا ہوا تھا، جس کو ''باطنی فرقہ'' اور ''قرامطہ'' کہتے ہیں۔ اس فرقے کا ایک مشہور لیڈر گزرا ہے جس کا نام عبیداللہ بن حسن قیروانی ہے۔

اس نے اپنے پیروکاروں کے نام ایک خط لکھا ہے وہ خط بڑا دلچسپ ہے۔ جس میں اس نے اپنے پیروکاروں کو زندگی گزارنے کے لئے ہدایات دی ہیں۔ اس میں وہ لکھتا ہے:

''میری سمجھ میں یہ بے عقلی کی بات نہیں آتی ہے کہ لوگوں کے پاس اپنے گھر میں ایک بڑی خوبصورت، سلیقہ شعار لڑکی بہن کی شکل میں موجود ہے اور بھائی کے مزاج کو بھی سمجھتی ہے۔ اس کی نفسیات سے بھی واقف ہے۔ لیکن یہ بے عقل انسان اس بہن کا ہاتھ اجنبی شخص کو پکڑا دیتا ہے۔ جس کے بارے میں یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کے ساتھ نباہ صحیح ہو سکے گا یا نہیں؟ وہ مزاج سے واقف ہے یا نہیں؟ اور خود اپنے لئے بعض اوقات ایک ایسی لڑکی لے آتے ہیں جو حسن و جمال کے اعتبار سے بھی، سلیقہ شعاری کے اعتبار سے بھی، مزاج شناسی کے اعتبار سے بھی اس بہن کے ہم پلہ نہیں ہوتی۔

میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اس بے عقلی کا کیا جواز ہے کہ اپنے گھر کی دولت تو دوسرے کے ہاتھ میں دیدے۔ اور اپنے پاس ایک ایسی چیز لے آئے جو اس کو پوری راحت و آرام نہ دے۔ یہ بے عقلی ہے۔ عقل کے خلاف ہے۔ میں اپنے پیروؤں کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ اس بے عقلی سے اجتناب کریں اور اپنے گھر کی دولت کو گھر ہی میں رکھیں''(۱)

بہن اور جنسی تسکین

اور دوسری جگہ عبید اللہ بن حسن قیروانی عقل کی بنیاد پر اپنے پیروؤں کو یہ پیغام دے رہا ہے، وہ کہتا ہے کہ:

''کیا وجہ ہے کہ جب ایک بہن اپنے بھائی کے لئے کھانا پکا سکتی ہے، اس کی بھوک دور کر سکتی ہے، اس کی راحت کے لئے اس کے کپڑے سنوار سکتی ہے، اس کا بستر درست کر سکتی ہے تو اس کی جنسی تسکین کا سامان کیوں نہیں کر سکتی؟ اس کی کیا وجہ ہے؟ یہ تو عقل کے خلاف ہے''(۲)

---

(۱) الفرق بین الفرق للبغدادی، ص:۲۹۷، وبیان مذاھب الباطنیہ للدیلمی، ص:۸۱

(۲) الفرق بین الفرق للبغدادی، ص:۲۹۷، وبیان مذاھب الباطنیہ للدیلمی، ص:۸۱

عقلی جواب ناممکن ہے

آپ اس کی بات پر جتنی چاہے لعنت بھیجیں، لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ خالص عقل کی بنیاد پر جو وحی الٰہی کی رہنمائی سے آزاد ہو، جس کو وحی الٰہی کی روشنی میسر نہ ہو، اس عقل کی بنیاد پر آپ اس کے اس استدلال کا جواب دیں۔ خالص عقل کی بنیاد پر قیامت تک اس کے اس استدلال کا جواب نہیں دیا جاسکتا۔

عقلی اعتبار سے بداخلاقی نہیں

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ یہ تو بڑی بداخلاقی کی بات ہے، بڑی گھناؤنی بات ہے، تو اس کا جواب موجود ہے کہ یہ بداخلاقی اور گھناؤنا پن یہ سب ماحول کے پیدا کردہ تصورات ہیں۔ آپ ایک ایسے ماحول میں پیدا ہوئے ہیں جہاں اس بات کو معیوب سمجھا جاتا ہے اس لئے آپ اس کو معیوب سمجھتے ہیں۔ ورنہ عقلی اعتبار سے کوئی عیب نہیں۔

نسب کا تحفظ کوئی عقلی اصول نہیں

اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ اس سے حسب و نسب کا سلسلہ خراب ہو جاتا ہے تو اس کا جواب موجود ہے کہ نسبوں کا سلسلہ خراب ہو جاتا ہے تو ہونے دو۔ اس میں کیا برائی ہے؟ نسب کا تحفظ کون سا ایسا عقلی اصول ہے کہ اس کی وجہ سے نسب کا تحفظ ضرور کیا جائے۔

یہ بھی ہیومن ارج (Human Urge) کا حصہ ہے

اگر آپ اس استدلال کے جواب میں یہ کہیں کہ اس سے طبی طور پر نقصانات ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ اب یہ تصورات سامنے آئے ہیں کہ استلذاذ بالاقارب (Incest) سے طبی نقصانات بھی ہوتے ہیں۔

لیکن آپ کو معلوم ہے کہ آج مغربی دنیا میں اس موضوع پر کتابیں آرہی ہیں کہ استلذاذ بالاقارب (Incest) انسان کی فطری خواہش (Human Urge) کا ایک حصہ ہے۔ اور اس کے جو طبی نقصانات بیان کیے جاتے ہیں، وہ صحیح نہیں ہیں۔ وہی نعرہ جو آج سے آٹھ سو سال پہلے عبیداللہ بن حسن قیروانی نے لگایا تھا، اس کی نہ صرف صدائے بازگشت سنائی دے رہی ہے بلکہ آج مغربی ملکوں میں اس پر کسی نہ کسی طرح عمل بھی ہو رہا ہے۔

وحی الٰہی سے آزادی کا نتیجہ

یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ اس لئے کہ عقل کو اس جگہ استعمال کیا جا رہا ہے جو عقل کے دائرۂ کار (Jurisdiction) میں نہیں ہے۔ جہاں وحی الٰہی کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اور عقل کو وحی الٰہی کی رہنمائی سے آزاد کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ برطانیہ کی پارلیمنٹ ہم جنس پرستی (Homo Sexuality) کے جواز کا بل تالیوں کی گونج میں منظور کر رہی ہے۔

اور اب تو باقاعدہ یہ ایک علم بن گیا ہے۔ میں ایک مرتبہ اتفاق سے نیویارک کے ایک کتب خانہ میں گیا۔ وہاں پر پورا ایک علیحدہ سیکشن تھا، جس پر یہ عنوان لگا ہوا تھا کہ ''گے اسٹائل آف لائف'' (GAY STYLE OF LIFE) تو اس موضوع پر کتابوں کا ایک ذخیرہ آچکا ہے اور باقاعدہ ان کی انجمنیں ہیں، ان کے گروپ اور جماعتیں ہیں، اور وہ بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔ اس زمانے میں نیویارک کا میئر (Mayor) بھی ایک Gay تھا۔

عقل کا فریب

پچھلے ہفتے کے امریکی رسالے ٹائم کو اگر آپ اٹھا کر دیکھیں تو اس میں یہ خبر آئی ہے کہ خلیج کی جنگ میں حصہ لینے والے فوجیوں میں سے تقریباً ایک ہزار افراد کو صرف اس لئے فوج سے نکال دیا گیا کہ وہ ہم جنس پرست (Homo Sexual) تھے۔ لیکن اس اقدام کے خلاف شور مچ رہا ہے، مظاہرے ہو رہے ہیں، اور چاروں طرف سے یہ آواز اُٹھ رہی ہے کہ یہ بات کہ ہم جنس پرست ہونے کی وجہ سے آپ نے ان لوگوں کو فوج کے عہدوں سے برخاست کر دیا ہے، یہ بات بالکل عقل کے خلاف ہے اور ان کو دوبارہ بحال کرنا چاہئے۔ اور ان کی دلیل یہ ہے کہ یہ تو ایک ہیومن ارج (Human Urge) ہے۔ اور آج "Human Urge" کا بہانہ لے کر دنیا کی ہر بُری سے بُری بات کو جائز قرار دیا جا رہا ہے۔ یہ سب عقل کی بنیاد پر ہو رہا ہے کہ بتاؤ عقلی اعتبار سے اس میں کیا خرابی ہے۔ اور یہ تو صرف جنسِ انسانی کی بات تھی۔ اب تو بات جانوروں، کتوں، گدھوں اور گھوڑوں تک نوبت پہنچ گئی ہے اور اس کو بھی باقاعدہ فخریہ بیان کیا جا رہا ہے۔

عقل کا ایک اور فریب

بات واضح کرنے کے لئے ایک اور مثال عرض کر دوں کہ یہ ایٹم بم جس کی تباہ کاریوں سے تمام دنیا آج خوف زدہ اور پریشان ہے، اور ایٹمی اسلحہ میں تخفیف کے طریقے تلاش کر رہی ہے۔

انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا (Encyclopedia of Britannica) میں ایٹم بم پر جو مقالہ لکھا گیا ہے اس کو ذرا کھول کر دیکھیں۔ اس میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ دنیا میں ایٹم بم کا استعمال دو جگہ پر کیا گیا ہے۔ ایک ہیروشیما اور دوسرے ناگاساکی پر، اور ان دونوں مقامات پر ایٹم بم کے ذریعہ جو تباہی ہوئی اس کا ذکر تو بعد میں آگے چل کر کیا ہے، لیکن اس مقالے کو شروع یہاں سے کیا گیا ہے کہ ہیروشیما اور ناگاساکی پر جو ایٹم بم برسائے گئے اس کے ذریعہ ایک کروڑ انسانوں کی جانیں بچائی گئیں، اور ان کو موت کے منہ سے نکالا گیا۔ اور اس کی منطق یہ لکھی ہے کہ اگر ہیروشیما اور ناگاساکی پر بم نہ گرائے جاتے تو پھر جنگ مسلسل جاری رہتی اور اس میں اندازہ یہ تھا کہ تقریباً ایک کروڑ انسان مزید مر جاتے۔ تو ایٹم بم کا تعارف اس طرح کرایا گیا کہ ایٹم بم وہ چیز ہے جس سے ایک کروڑ انسانوں کی جانیں بچائی گئیں۔ یہ اس واقع کا جواز (Justification) پیش کیا جارہا ہے، جس پر ساری دنیا لعنت بھیجتی ہے کہ ایٹم بم کے ذریعہ ہیروشیما اور ناگاساکی میں ان بچوں کی نسلیں تک تباہ کردی گئیں، بے گناہوں کو مارا گیا، اور یہ جواز (Justification) بھی عقل کی بنیاد پر ہے۔

لہٰذا کوئی بُری سے بُری بات اور کوئی سنگین سے سنگین خرابی ایسی نہیں ہے جس کے لئے عقل کوئی نہ کوئی دلیل اور کوئی نہ کوئی جواز فراہم نہ کردے۔

آج ساری دنیا فاشزم (Fascism) پر لعنت بھیج رہی ہے اور سیاست کی دنیا میں ہٹلر اور مسولینی کا نام ایک گالی بن گیا ہے۔ لیکن آپ ذرا ان کا فلسفہ تو اٹھا کر دیکھیں کہ انہوں نے اپنے فاشزم (Fascism) کو کس طرح فلسفیانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ایک معمولی سمجھ کا آدمی اگر فاشزم کے فلسفے کو پڑھے گا تو اسے اعتراف ہونے لگے گا کہ بات تو سمجھ میں آتی ہے، معقول بات ہے۔ یہ کیوں ہے؟ اس لئے کہ عقل ان کو اس طرف لے جارہی ہے ــــ بہرحال! دنیا کی کوئی بد سے بدتر بُرائی ایسی نہیں ہے جس کو عقل کی دلیل کی بنیاد پر صحیح تسلیم کرانے کی کوشش نہ کی جاتی ہو۔ اس لئے کہ عقل کو اس جگہ استعمال کیا جارہا ہے جہاں اس کے استعمال کی جگہ نہیں ہے۔

عقل کی مثال

علامہ ابن خلدون جو بہت بڑے مؤرخ اور فلسفی گزرے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو عقل دی ہے وہ بڑی کام کی چیز ہے۔ لیکن یہ اسی وقت تک کام کی چیز ہے جب اس کو اس کے دائرے میں استعمال کیا جائے۔ لیکن اگر اس کو اس کے دائرہ سے باہر استعمال کرو گے تو یہ کام نہیں دے گی اور پھر اس کی ایک بڑی اچھی مثال دی ہے کہ عقل کی مثال ایسی ہے جیسے سونا تولنے کا کانٹا۔ وہ کانٹا چند گرام سونا تول لیتا ہے اور بس اس حد تک وہ کام دیتا ہے۔ اور وہ صرف سونا تولنے کے لئے بنایا

گیا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کانٹے میں پہاڑ تولنا چاہے گا تو اس کے نتیجے میں وہ کانٹا ٹوٹ جائے گا اور جب پہاڑ تولنے کے نتیجے میں وہ ٹوٹ جائے تو اگر کوئی شخص کہے کہ یہ کانٹا تو بیکار چیز ہے، اس لئے کہ اس سے پہاڑ تو تلتا نہیں ہے، اس نے تو کانٹے کو توڑ دیا تو اسے ساری دنیا احمق کہے گی۔

بات دراصل یہ ہے کہ اس نے کانٹے کو غلط جگہ پر استعمال کیا اور غلط کام میں استعمال کیا اس لئے وہ کانٹا ٹوٹ گیا۔(۱)

اسلام اور سیکولرازم میں فرق

اسلام اور سیکولرازم میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اسلام یہ کہتا ہے کہ بیشک تم عقل کو استعمال کرو، لیکن صرف اس حد تک جہاں تک وہ کام دیتی ہے۔ ایک سرحد ایسی آتی ہے جہاں عقل کام دینا چھوڑ دیتی ہے بلکہ غلط جواب دینا شروع کر دیتی ہے، جیسے کمپیوٹر ہے۔ اگر آپ اس کو اس کام میں استعمال کریں جس کے لئے وہ بنایا گیا ہے تو وہ فوراً جواب دیدے گا۔ لیکن جو چیز اس کمپیوٹر میں فیڈ (Feed) نہیں کی گئی، وہ اگر اس سے معلوم کرنا چاہیں تو نہ صرف یہ کہ وہ کمپیوٹر کام نہیں کرے گا، بلکہ غلط جواب دینا شروع کر دے گا۔ اسی طرح جو چیز اس عقل کے اندر فیڈ نہیں کی گئی، جس چیز کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک تیسرا ذریعہ علم عطا فرمایا ہے، جو وحی الٰہی ہے، جب وہاں عقل کو استعمال کرو گے تو یہ عقل غلط جواب دینا شروع کر دے گی۔ یہی وجہ ہے جس کی وجہ سے نبی کریم ﷺ تشریف لائے۔ جس کے لئے قرآن کریم اتارا گیا۔ چنانچہ قرآن کریم کی آیت ہے کہ:

﴿إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ﴾ (۲)

”ہم نے آپ کے پاس یہ کتاب بھیجی جس سے واقع کے موافق آپ لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں“

یہ قرآن کریم آپ کو بتائے گا کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا ہے؟ یہ بتائے گا کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے؟ یہ بتائے گا کہ خیر کیا ہے اور شر کیا ہے؟ یہ سب باتیں آپ کو محض عقل کی بنیاد پر نہیں معلوم ہو سکتیں۔

آزادی فکر کے علم بردار ادارے کا حال

ایک معروف بین الاقوامی ادارہ ہے۔ جس کا نام ”ایمنسٹی انٹرنیشنل“ ہے۔ اس کا ہیڈ آفس پیرس میں ہے۔ آج سے تقریباً ایک ماہ پہلے اس کے ایک ریسرچ اسکالر سروے کرنے کے لئے

(۱) مقدمہ ابن خلدون، بحث علم کلام، ص: ۴۴۰ (۲) النساء: ۱۰۵

پاکستان آئے ہوئے تھے۔ خدا جانے کیوں وہ میرے پاس بھی انٹرویو کرنے کے لئے آ گئے اور انہوں نے آکر مجھ سے گفتگو شروع کی کہ ہمارا مقصد آزادیٔ فکر اور حریتِ فکر کے لئے کام کرنا ہے۔ بہت سے لوگ آزادیٔ فکر کی وجہ سے جیلوں اور قیدوں میں بند ہیں۔ ان کو نکالنا چاہتے ہیں۔ اور یہ ایک ایسا غیر متنازعہ موضوع ہے، جس میں کسی کو اختلاف نہیں ہونا چاہئے۔ مجھے اس لئے پاکستان بھیجا گیا کہ میں اس موضوع پر مختلف طبقوں کے خیالات معلوم کروں۔ میں نے سنا ہے کہ آپ کا بھی مختلف اہلِ دانش سے تعلق ہے۔ اس لئے میں آپ سے بھی کچھ سوالات کرنا چاہتا ہوں۔

آج کل کا سروے

میں نے ان سے پوچھا کہ آپ یہ سروے کس مقصد کے لئے کرنا چاہتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ پاکستان کے مختلف حلقوں میں اس سلسلے میں کیا آراء پائی جاتی ہیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ کراچی کب تشریف لائے؟ جواب دیا کہ آج صبح پہنچا ہوں۔ میں نے پوچھا کہ واپس کب تشریف لے جائیں گے؟ انہوں نے جواب دیا کہ کل صبح میں اسلام آباد جا رہا ہوں (رات کے وقت یہ ملاقات ہو رہی تھی) میں نے پوچھا: اسلام آباد میں کتنے روز قیام رہے گا؟ فرمایا کہ ایک دن اسلام آباد میں رہوں گا۔ میں نے ان سے کہا کہ پہلے تو آپ مجھے یہ بتائیں آپ پاکستان کے مختلف حلقوں کے خیالات کا سروے کرنے جا رہے ہیں اور اس کے بعد آپ رپورٹ تیار کر کے پیش کریں گے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ ان دو تین شہروں میں دو تین دن گزارنا آپ کے لئے کافی ہوگا؟ کہنے لگے کہ ظاہر ہے کہ تین دن میں سب کے خیالات تو معلوم نہیں ہو سکتے۔ لیکن میں مختلف حلقہ ہائے فکر سے مل رہا ہوں۔ کچھ لوگوں سے ملاقاتیں ہوئی ہیں اور اسی سلسلے میں آپ کے پاس بھی آیا ہوں، آپ بھی میری کچھ رہنمائی کریں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آج آپ نے کراچی میں کتنے لوگوں سے ملاقات کی؟ کہنے لگے: میں نے پانچ آدمیوں سے ملاقات کر لی ہے، اور چھٹے آپ ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ ان چھ آدمیوں کے خیالات معلوم کر کے ایک رپورٹ تیار کر دیں گے کہ کراچی والوں کے خیالات یہ ہیں۔ معاف کیجئے مجھے آپ کے اس سروے کی سنجیدگی پر شبہ ہے اس لئے کہ تحقیقی ریسرچ اور سروے کا کوئی کام اس طرح نہیں ہوا کرتا ہے۔ اس لئے میں آپ کے کسی سوال کا جواب دینے سے معذور ہوں۔ اس پر وہ معذرت کرنے لگے کہ میرے پاس وقت کم تھا۔ اس لئے صرف چند حضرات سے مل سکا ہوں۔ احقر نے عرض کیا کہ وقت کی کمی کی صورت میں سروے کا یہ کام ذمہ لینا کیا ضروری تھا؟ پھر انہوں نے اصرار شروع کر دیا کہ اگرچہ آپ کا اعتراض حق بجانب ہے، لیکن میرے چند سوالات کا جواب تو آپ دے ہی دیں۔ احقر نے پھر معذرت کی اور عرض کیا کہ

میں اس غیر سنجیدہ اور نا تمام سروے میں کسی تعاون سے معذور ہوں ۔ البتہ اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ سے اس ادارے کی بنیادی فکر کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں ۔ کہنے لگے کہ دراصل تو میں آپ سے سوال کرنے کے لئے آیا تھا، لیکن اگر آپ جواب نہیں دینا چاہتے تو بیشک آپ ہمارے ادارے کے بارے میں جو سوال کرنا چاہیں کرلیں ۔

کیا آزادی فکر کا نظریہ بالکل مطلق (Absolute) ہے؟

میں نے ان سے کہا کہ آپ نے فرمایا کہ یہ ادارہ جس کی طرف سے آپ کو بھیجا گیا ہے یہ آزادی فکر کا علمبردار ہے، بیشک یہ آزادی فکر بڑی اچھی بات ہے، لیکن میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ آزادی فکر آپ کی نظر میں بالکل مطلق (Absolute) ہے؟ یا اس پر کوئی پابندی بھی ہونی چاہئے؟ کہنے لگے کہ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا ۔ میں نے کہا کہ میرا مطلب یہ ہے کہ آزادی فکر کا یہ تصور کیا اتنا اب سلوٹ (Absolute) ہے کہ جو بھی انسان کے دل میں آئے وہ دوسروں کے سامنے برملا کہے اور اس کی تبلیغ کرے اور لوگوں کو اس کی دعوت دے؟ مثلاً میری سوچ یہ کہتی ہے کہ سرمایہ داروں نے بہت دولت جمع کرلی ہے، اس لئے غریبوں کو یہ آزادی ہونی چاہئے کہ وہ ان سرمایہ داروں پر ڈاکے ڈالیں اور ان کا مال چھین لیں اور میں اپنی اسی سوچ کی تبلیغ بھی شروع کردوں کہ غریب جاکر ڈاکہ ڈالیں اور کوئی ان کو پکڑنے والا نہ ہو ۔ اس لئے کہ سرمایہ داروں نے غریبوں کا خون چوس کر یہ دولت جمع کی ہے ۔ اب آپ بتائیں کہ کیا آپ اس آزادی فکر کے حامی ہوں گے یا نہیں؟

آپ کے پاس کوئی نپا تلا معیار (Yardstick) نہیں

وہ کہنے لگے: اس کے تو ہم حامی نہیں ہوں گے ۔

میں نے کہا کہ میں یہی واضح کرنا چاہتا ہوں کہ جب آزادی فکر کا تصور بالکل اب سلوٹ (Absolute) نہیں ہے، تو کیا آپ اس کو مانتے ہیں کہ کچھ قیدیں ہونی چاہئے؟

انہوں نے کہا کہ ہاں! کچھ قیدیں تو ہونی چاہئے، مثلاً میرا خیال یہ ہے کہ آزادی فکر کو اس شرط کا پابند ہونا چاہئے کہ اس کا نتیجہ دوسروں پر تشدد (Violance) کی صورت میں ظاہر نہ ہو ۔

میں نے عرض کیا کہ یہ قید تو آپ نے اپنی سوچ کے مطابق عائد کردی، لیکن اگر کسی شخص کی دیانت دارانہ رائے یہ ہو کہ بعض اعلیٰ مقاصد تشدد کے بغیر حاصل نہیں ہوتے، اور ان اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے تشدد کے نقصانات برداشت کرنے چاہئیں تو کیا اس کی یہ آزادی فکر قابلِ احترام ہے یا نہیں؟ دوسرے جس طرح آپ نے اپنی سوچ سے "آزادی فکر" پر ایک پابندی عائد کردی، اسی طرح

اگر کوئی دوسرا شخص اسی قسم کی کوئی اور پابندی اپنی سوچ سے عائد کرنا چاہے تو اس کو بھی اس کا اختیار ملنا چاہئے، ورنہ کوئی وجہ ہونی چاہئے کہ آپ کی سوچ پر عمل کیا جائے اور دوسرے کی سوچ پر عمل نہ کیا جائے لہٰذا اصل سوال یہ ہے کہ وہ قیدیں کیا ہونی چاہئے، اور یہ فیصلہ کون کرے گا کہ یہ قید ہونی چاہئے؟ اور آپ کے پاس وہ معیار کیا ہے جس کی بنیاد پر آپ یہ فیصلہ کریں کہ آزادی فکر پر فلاں قسم کی پابندی لگائی جاسکتی ہے اور فلاں قسم کی پابندی نہیں لگائی جاسکتی؟ آپ مجھے کوئی نپا تلا معیار (Yardstick) بتائیں، جس کے ذریعہ آپ یہ فیصلہ کرسکیں کہ فلاں قسم کی پابندی جائز ہے اور فلاں قسم کی پابندی ناجائز ہے۔

انہوں نے جواب دیا کہ صاحب! ہم نے اس پہلو پر کبھی باقاعدہ غور نہیں کیا۔

میں نے کہا: آپ اتنے بڑے عالمی ادارے سے وابستہ ہیں اور اسی کام کے سروے کے لئے آپ جارہے ہیں اور اسی کام کا بیڑہ اٹھایا ہے، لیکن یہ بنیادی سوال کہ آزادی فکر کی حدود کیا ہونی چاہئیں، اس کا اسکوپ (Scope) کیا ہونا چاہئے، اگر یہ آپ کے ذہن میں نہیں ہے پھر آپ کا یہ پروگرام مجھے بارآور ہوتا نظر نہیں آتا۔ براہِ کرم میرے اس سوال کا جواب آپ مجھے اپنے لٹریچر سے فراہم کردیں، یا دوسرے حضرات سے مشورہ کرکے فراہم کردیں۔

انسان کے پاس وحی کے علاوہ کوئی معیار نہیں

کہنے لگے کہ آپ کے یہ خیالات اپنے ادارے تک پہنچاؤں گا اور اس موضوع پر جو ہمارا لٹریچر ہے وہ بھی فراہم کروں گا۔ یہ کہہ کر انہوں نے میرا پھیکا سا شکریہ ادا کیا اور جلد رخصت ہوگئے۔ میں آج تک ان کے وعدے کے مطابق لٹریچر یا اپنے سوال کے جواب کا منتظر ہوں اور مجھے پورا یقین ہے کہ وہ قیامت تک نہ سوال کا جواب فراہم کرسکتے ہیں، نہ کوئی ایسا معیار پیش کرسکتے ہیں جو عالمگیر مقبولیت کا حامل (Universally Applicable) ہو۔ اس لئے کہ آپ ایک معیار متعین کریں گے دوسرا شخص دوسرا معیار متعین کرے گا۔ آپ کا بھی اپنے ذہن کا سوچا ہوا معیار ہوگا۔ اس کا معیار بھی اس کے ذہن کا سوچا ہوا ہوگا۔ اور دنیا میں کوئی شخص ایسا معیار تجویز کردے جو ساری دنیا کے لئے مکمل طور پر قابلِ قبول ہو، یہ بات میں کسی تردید کے خوف کے بغیر کہہ سکتا ہوں کہ واقعتاً انسان کے پاس وحی الٰہی کے سوا کوئی معیار نہیں ہے جو ان مبہم تصورات پر جائز حدیں قائم کرنے کا کوئی لازمی اور ابدی معیار فراہم کرسکے۔ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے سوا انسان کے پاس کوئی چیز نہیں ہے۔

صرف مذہب معیار بن سکتا ہے

آپ فلسفہ کو اٹھا کر دیکھئے۔ اس میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا ہے کہ قانون کا اخلاق سے کیا تعلق ہے؟ قانون میں ایک مکتبِ فکر ہے جس کا یہ کہنا ہے کہ قانون کا اخلاق سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اچھے بُرے کا تصور غلط ہے۔ نہ کوئی چیز اچھی ہے، نہ کوئی چیز بُری ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ Should اور Should not اور Ought وغیرہ کے الفاظ درحقیقت انسان کی خواہشِ نفس کے پیدا کردہ ہیں، ورنہ اس قسم کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اس واسطے جو معاشرہ جس وقت جو چیز اختیار کرلے وہ اس کے لئے درست ہے۔ اور ہمارے پاس اچھائی اور برائی کے لئے کوئی معیار نہیں ہے جو یہ بتا سکے کہ فلاں چیز اچھی ہے اور فلاں چیز بُری ہے۔ اور اصولِ قانون پر مشہور ٹیکسٹ بک Jurisprudence ہے، اس میں اس بحث کے آخر میں ایک جملہ لکھا ہے کہ:

> ''انسانیت کے پاس ان چیزوں کے تعین کے لئے ایک چیز معیار بن سکتی تھی، وہ ہے مذہب (Religion) لیکن چونکہ ریلیجن (Religion) کا تعلق انسان کے بلیف (Belief) اور عقیدے سے ہے اور سیکولر نظامِ حیات میں اس کا کوئی مقام نہیں ہے، اس واسطے ہم اس کو ایک بنیاد کے طور پر نہیں اپنا سکتے''

ہمارے پاس اس کو رد کرنے کی کوئی دلیل نہیں ہے

ایک اور مثال یاد آگئی ہے، جیسا کہ ابھی میں نے عرض کیا تھا جس وقت برطانیہ کی پارلیمنٹ میں ہم جنس پرستی (Homo Sexuality) کا بل تالیوں کی گونج میں پاس ہوا۔ اس بل کے پاس ہونے سے پہلے کافی مخالفت بھی ہوئی اور اس بل پر غور کرنے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جو اس مسئلہ پر غور کرے کہ آیا یہ بل پاس ہونا چاہئے یا نہیں؟ اس کمیٹی کی رپورٹ شائع ہوئی ہے اور فریڈمین (Fridman) کی مشہور کتاب ''دی لیگل تھیوری'' (The Legal theory) میں اس رپورٹ کا خلاصہ دیا گیا ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ اس کمیٹی نے ساری رپورٹ لکھنے کے بعد لکھا ہے:

> ''اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ چیز اچھی نہیں لگتی، لیکن چونکہ ہم ایک مرتبہ یہ فیصلہ کرچکے ہیں کہ انسان کی پرائیویٹ زندگی میں قانون کو دخل انداز نہیں ہونا چاہئے اس لئے اس اصول کی روشنی میں جب تک ہم سِن (Sin) اور کرائم (Crime) میں تفریق برقرار رکھیں گے کہ سِن اور چیز ہے اور کرائم علیحدہ چیز ہے، اس وقت تک ہمارے پاس اس عمل کو رد کرنے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ ہاں! اگر سِن

اور کرائم کو ایک تصور کرلیا جائے تو پھر بیشک اس بل کے خلاف رائے دی جا سکتی ہے۔ اس واسطے ہمارے پاس اس بل کو رد کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس لئے یہ بل پاس ہو جانا چاہئے''

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ "Law" کو اسلامائز کیا جائے تو اس کے معنی یہی ہیں کہ سیکولر نظام نے حصولِ علم کی جو دو بنیادیں، آنکھ، کان، ناک، زبان وغیرہ اور عقل اختیار کی ہوئی ہیں، اس سے آگے ایک اور قدم بڑھا کر وحی الٰہی کو بھی حصولِ علم اور رہنمائی کا ذریعہ قرار دے کر اس کو اپنا شعار بنائیں۔

اس حکم کی ریزن (Reason) میری سمجھ میں نہیں آتی

اور جب یہ بات ذہن میں آجائے کہ وحی الٰہی شروع ہی وہاں سے ہوتی ہے جہاں عقل کی پرواز ختم ہو جاتی ہے، تو پھر وحی الٰہی کے ذریعہ قرآن و سنت میں جب کوئی حکم آجائے، اس کے بعد اس بنا پر اس حکم کو رد کرنا کہ صاحب اس حکم کا ریزن (Reason) میری سمجھ میں نہیں آتا، احمقانہ فعل ہوگا۔ اس واسطے کہ وحی کا حکم آیا ہی اس جگہ پر ہے جہاں ریزن کام نہیں دے رہی تھی۔ اگر ریزن کام دے چکی ہوتی تو پھر وحی کے آنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اگر اس حکم کے پیچھے جو حکمتیں ہیں اگر ان ساری حکمتوں کا تمہاری عقل ادراک کرسکتی تھی تو پھر اللہ کو وحی کے ذریعہ اس کے حکم دینے کی چنداں حاجت نہیں تھی۔

قرآن و حدیث میں سائنس اور ٹیکنالوجی

یہیں سے ایک اور سوال کا جواب بھی ہوگیا۔ جو اکثر ہمارے پڑھے لکھے طبقے کے ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ صاحب! آج سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ ساری دنیا سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کر رہی ہے لیکن ہمارا قرآن اور ہماری حدیث سائنس اور ٹیکنالوجی کے بارے میں کوئی فارمولا ہمیں نہیں بتاتے، کہ کس طرح ایٹم بم بنائیں، کس طرح ہائیڈروجن بم بنائیں۔ اس کا کوئی فارمولا نہ تو قرآنِ کریم میں ملتا ہے اور نہ حدیث رسول ﷺ میں ملتا ہے۔ اس کی وجہ سے بعض لوگ احساسِ کمتری کا شکار ہوتے ہیں کہ صاحب! دنیا چاند اور مریخ پر پہنچ رہی ہے اور ہمارا قرآن ہمیں اس بارے میں کچھ نہیں بتاتا کہ چاند پر کیسے پہنچیں؟

سائنس اور ٹیکنالوجی تجربہ کا میدان ہے

اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارا قرآن ہمیں یہ باتیں اس لئے نہیں بتاتا کہ وہ دائرہ عقل کا ہے۔ وہ تجربہ کا دائرہ ہے۔ وہ ذاتی محنت اور کوشش کا دائرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو انسان کے ذاتی تجربے عقل اور کوشش پر چھوڑا ہے کہ جو شخص جتنی کوشش کرے گا اور عقل کو استعمال کرے گا، تجربہ کو استعمال کرے گا، اس میں آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ قرآن آیا ہی اس جگہ پر ہے جہاں عقل کا دائرہ ختم ہو رہا تھا۔ عقل اس کا پوری طرح ادراک نہیں کرسکتی، ان چیزوں کا ہمیں قرآن کریم نے سبق پڑھایا ہے۔ ان چیزوں کے بارے میں ہمیں یہ معلومات فراہم کی ہیں۔

لہٰذا اسلامائیزیشن آف لاز کا سارا فلسفہ یہ ہے کہ ہم اپنی پوری زندگی کو اس کے تابع بنائیں۔

اسلام کے احکام میں لچک (Elasticity) موجود ہے

آخر میں ایک بات یہ عرض کردوں کہ جب اُوپر کی بات سمجھ میں آگئی تو پھر دل میں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ ہم چودہ سو سال پرانی زندگی کو کیسے لوٹائیں؟ چودہ سو سال پرانے اصولوں کو آج کی بیسویں اور اکیسویں صدی پر کیسے اپلائی کریں؟ اس لئے کہ ہماری ضروریات نوع بنوع ہیں، بدلتی رہتی ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ اسلامی علوم سے انسیت نہ ہونے کی وجہ سے یہ اشکال پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اسلام نے اپنے احکام کے تین حصے کیے ہیں، ایک حصہ وہ ہے جس میں قرآن وسنت کی نص قطعی موجود ہے۔ جس میں قیام قیامت تک آنے والے حالات کی وجہ سے کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ یہ اصول غیر متبدل ہیں۔ زمانہ کیسا ہی بدل جائے، لیکن اس میں تبدیلی نہیں آسکتی۔ دوسرا حصہ وہ ہے جس میں اجتہاد اور استنباط کی گنجائش رکھی گئی ہے، اور اس میں اس درجہ کی نصوصِ قطعیہ نہیں ہیں جو زمانہ کے حال پر اپلائی کریں۔ اس میں اسلامی احکام کی لچک (Elasticity) خود موجود ہے۔ اور احکام کا تیسرا حصہ وہ ہے جس کے بارے میں قرآن وسنت خاموش ہیں۔ جن کے بارے میں کوئی ہدایت اور کوئی رہنمائی نہیں کی گئی۔ جن کے بارے میں قرآن وسنت نے کوئی حکم نہیں دیا۔ حکم کیوں نہیں دیا؟ اس لئے کہ اس کو ہماری عقل پر چھوڑ دیا ہے۔ اور اس کا اتنا وسیع دائرہ ہے کہ ہر دور میں انسان اپنی عقل اور تجربہ کو استعمال کرکے اس خالی میدان (Unoccupied Area) میں ترقی کرسکتا ہے اور ہر دور کی ضروریات پوری کرسکتا ہے۔

ان احکام میں قیامت تک تبدیلی نہیں آئے گی

دوسرا حصہ، جس میں اجتہاد اور استنباط کی گنجائش رکھی گئی ہے، اس کے اندر بھی حالات کے لحاظ سے علتوں کے بدلنے کی وجہ سے احکام کے اندر تغیر و تبدل ہو سکتا ہے۔ البتہ پہلا حصہ بیشک کبھی نہیں بدل سکتا۔ قیامت آ جائے گی لیکن وہ نہیں بدلے گا۔ اس لئے کہ وہ درحقیقت انسان کی فطرت کے ادراک پر مبنی ہے۔ انسان کے حالات بدل سکتے ہیں، لیکن فطرت نہیں بدل سکتی۔ اور چونکہ وہ فطرت کے ادراک پر مبنی ہیں اس لئے ان میں بھی تبدیلی نہیں لائی جا سکتی۔

بہر حال! جہاں تک شریعت نے ہمیں گنجائش دی ہے گنجائش کے دائرہ میں رہ کر ہم اپنی ضروریات کو پورے طریقے سے استعمال کر سکتے ہیں۔

اجتہاد کہاں سے شروع ہوتا ہے

اجتہاد کا دائرہ وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں نص قطعی موجود نہ ہو۔ جہاں نص موجود ہو وہاں عقل کو استعمال کر کے نصوص کے خلاف کوئی بات کہنا درحقیقت اپنے دائرۂ کار (Jurisdiction) سے باہر جانے والی بات ہے اور اسی کے نتیجے میں دین کی تحریف کا راستہ کھلتا ہے۔ جس کی ایک مثال آپ حضرات کے سامنے عرض کرتا ہوں۔

خنزیر حلال ہونا چاہئے

قرآن کریم میں خنزیر کو حرام قرار دیا گیا ہے اور یہ حرمت کا حکم وحی کا حکم ہے۔ اس جگہ پر عقل کو استعمال کرنا کہ صاحب! یہ کیوں حرام ہے؟ یہ عقل کو غلط جگہ پر استعمال کرنا ہے۔ اسی وجہ سے بعض لوگوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ بات دراصل یہ ہے کہ قرآن کریم نے خنزیر اس لئے حرام کیا تھا کہ اس زمانے میں خنزیر بڑے گندے تھے اور غیر پسندیدہ ماحول میں پرورش پاتے تھے اور غلاظتیں کھاتے تھے۔ اب تو خنزیر کے لئے بڑے بڑے ہائی جینک فارم (Hygenic Farm) تیار کیے گئے ہیں اور بڑے صحت مندانہ طریقے سے پرورش ہوتی ہے، لہٰذا وہ حکم اب ختم ہونا چاہئے، یہ اس جگہ پر عقل کو استعمال کرنا ہے جہاں وہ کام دینے سے انکار کر رہی ہے۔

سود اور تجارت میں کیا فرق ہے؟

اسی طرح ربا اور سود کو جب قرآن کریم نے حرام قرار دے دیا، بس وہ حرام ہو گیا۔ عقل میں

چاہے آئے یا نہ آئے۔ دیکھئے قرآن کریم میں مشرکینِ عرب کا قول نقل کرتے ہوئے فرمایا گیا:

﴿اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا﴾ (۱)

کہ بیع بھی ربا جیسی چیز ہے۔ تجارت اور بیع وشراء سے بھی انسان نفع کماتا ہے اور ربا سے بھی نفع کماتا ہے۔ لیکن قرآن کریم نے اس کے جواب میں فرق بیان نہیں کیا کہ بیع اور ربا میں یہ فرق ہے بلکہ یہ جواب دیا کہ:

﴿وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ (۲)

بس! اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال قرار دیا ہے اور ربا کو حرام قرار دیا ہے۔ اب آگے اس حکم میں تمہارے لئے چون وچرا کی گنجائش نہیں۔ اس لئے کہ جب اللہ نے بیع کو حلال کر دیا ہے تو حلال ہے اور جب اللہ نے ربا کو حرام کر دیا اس لئے حرام ہے۔ اب اس کے اندر چون وچرا کرنا درحقیقت عقل کو غلط جگہ پر استعمال کرنا ہے۔

ایک انوکھا اور دلچسپ واقعہ

ایک واقعہ مشہور ہے کہ ہمارا ایک ہندوستانی گویا ایک مرتبہ حج کرنے چلا گیا۔ حج کے بعد وہ جب مدینہ شریف جارہا تھا۔ راستے میں منزلیں ہوتی تھیں۔ ان پر رات گزارنی پڑتی تھی۔ ایک منزل پر جب رات گزارنے کے لئے ٹھہرا تو وہاں ایک عرب گویا آگیا۔ وہ بدو قسم کا عرب گویا تھا۔ اس نے بہت بھدے انداز سے سارنگی بجا کر گانا شروع کیا۔ آواز بڑی بھدی تھی اور اس کو سارنگی اور طبلہ بھی صحیح بجانا نہیں آتا تھا۔ جب ہندوستانی گویے نے اس کی آواز سنی تو اس نے کہا کہ آج یہ بات میری سمجھ میں آگئی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے گانے بجانے کو کیوں حرام قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ آپ نے تو ان بدوؤں کا گانا سنا تھا۔ اگر آپ میرا گانا سن لیتے تو حرام قرار نہ دیتے۔ تو اس قسم کی فکر اور تھنکنگ (Thinking) ڈیویلپ (Develop) ہورہی ہے۔ جس کو اجتہاد کا نام دیا جارہا ہے۔ یہ نصوصِ قطعیہ کے اندر اپنی خواہشاتِ نفس کو استعمال کرنا ہے۔

آج کے مفکر کا اجتہاد

ہمارے ہاں ایک معروف مفکر ہیں ''مفکر'' اس لئے کہہ رہا ہوں کہ وہ اپنی فیلڈ (Field) میں ''مفکر'' (Thinker) سمجھے جاتے ہیں۔ قرآن کریم کی یہ جو آیت ہے:

﴿اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَهُمَا﴾ (۳)

(۱) البقرہ: ۲۷۵ (۲) البقرۃ: ۲۷۵ (۳) المائدۃ: ۳۸

''چور مرد اور چور عورت کا ہاتھ کاٹ دو''

ان مفکر صاحب نے اس آیت کی یہ تفسیر کی کہ چور سے مراد سرمایہ دار ہیں جنہوں نے بڑی بڑی صنعتیں قائم کر رکھی ہیں۔ اور ''ہاتھ'' سے مراد ان کی انڈسٹریاں (Industries) اور ''کاٹنے'' سے مراد ان کا نیشنلائیزیشن (Nationalization) ہے، لہٰذا اس آیت کے معنی ہیں کہ سرمایہ داروں کی ساری انڈسٹریوں کو نیشنلائیز کرلیا جائے اور اس طریقے سے چوری کا دروازہ بند ہو جائے گا۔

مشرق میں ہے تقلیدِ فرنگی کا بہانہ

اس قسم کے اجتہادات کے بارے میں اقبال مرحوم نے کہا تھا کہ۔

ز اجتہادے عالمانِ کم نظر
اقتداء با رفتگاں محفوظ تر

''ایسے کم نظر لوگوں کے اجتہاد سے پرانے لوگوں کی باتوں کی اقتدا کرنا وہ زیادہ محفوظ ہے''

لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید
مشرق میں ہے تقلیدِ فرنگی کا بہانہ

بہرحال میں آج کی اس نشست سے یہ فائدہ اٹھانا چاہتا تھا اور شاید میں نے اپنے استحقاق اور اپنے وعدے سے بھی زیادہ وقت آپ حضرات کا لیا ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ جب تک ''اسلامائیزیشن آف لاز'' کا فلسفہ ذہن میں نہ ہو، اس وقت تک محض ''اسلامائیزیشن آف لاز'' کے لفظ کی دروبست درست کر لینے سے بات نہیں بنتی۔

خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اس لئے اسلامائیزیشن کا پہلا قدم یہ ہے کہ ہمیں اس بات کا یقین ہو کہ ڈنکے کی چوٹ پر، سینہ تان کر، کسی معذرت خواہی کے بغیر کسی سے مرعوب ہوئے بغیر یہ بات کہہ سکیں کہ ہمارے نزدیک انسانیت کی فلاح کا اگر کوئی راستہ ہے تو وہ صرف ''اسلامائیزیشن'' (Islamisation) میں ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور چیز میں نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم آپ کو اس کی حقیقت کو صحیح طور پر سمجھنے کی توفیق عطا فرمادے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.

ایمانِ کامل کی چار علامتیں ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

((مَنْ أَعْطٰى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ وَأَحَبَّ لِلّٰهِ وَأَبْغَضَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ إِيْمَانَهُ))(۱)

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''جو شخص کسی کو کچھ دے تو اللہ کے لئے دے اور کسی کو دینے سے منع کرے تو اللہ کے لئے منع کرے۔ اگر کسی سے محبت کرے تو اللہ کے لئے کرے اور اگر کسی سے بغض اور عناد رکھے تو اللہ کے لئے رکھے تو اس شخص کا ایمان کامل ہو گیا۔

حضورِ اقدس ﷺ نے اس کے ایمان کے کامل ہونے کی گواہی دی۔

ایمانِ کامل کی پہلی علامت

ایمانِ کامل کی پہلی علامت یہ بیان فرمائی کہ وہ دے تو اللہ کے لئے دے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی موقع پر کچھ خرچ کر رہا ہے تو اس خرچ کرنے میں اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی نیت ہو۔ انسان اپنی ذات پر بھی خرچ کرتا ہے، اپنے اہل و عیال پر بھی خرچ کرتا ہے اور صدقہ و خیرات بھی کرتا ہے تو ان تمام مواقع پر خرچ کرتے وقت اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی نیت ہو۔ صدقہ و خیرات میں تو یہ بات واضح ہے کہ اس کو دیتے وقت یہ نیت ہونی چاہئے کہ میں اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے صدقہ دے رہا ہوں اور اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس کا ثواب مجھ کو عطا فرما دیں۔ اس صدقہ دینے میں احسان جتانا مقصود نہ ہو، نام و نمود مقصود نہ ہو، دکھاوا مقصود نہ ہو، تو یہ دینا اللہ تعالیٰ کے لئے ہوا۔

☆ اصلاحی خطبات (۹/ ۲۷-۴۸)، ۲۵ اگست، ۱۹۹۵ء، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) سنن الترمذي، كتاب صفة القيامة والرقائق والورع عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، رقم: ٢٤٤٥، سنن أبي داؤد، كتاب السنة، باب الدليل على زيادة الايمان ونقصانه، رقم: ٤٠٦١، مسند أحمد، مسند معاذ بن جبل، رقم: ١٥٠٦٤

خرید و فروخت کرتے ہوئے کیا نیت ہونی چاہئے؟

صدقہ وخیرات کے علاوہ بھی جہاں خرچ کرو تو وہاں بھی اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی نیت کرلو۔ مثلاً فرض کریں کہ آپ نے کوئی چیز خریدی اور دکان دار کو پیسے دے دیئے۔ اب بظاہر تو یہ ایک دنیاوی معاملہ ہے، لیکن اگر وہ چیز مثلاً گوشت، ترکاری خریدتے وقت یہ نیت کرلی کہ اللہ تعالیٰ نے میرے اہل وعیال کے جو حقوق میرے ذمے عائد کر رکھے ہیں، ان حقوق کی ادائیگی کے لئے یہ خریداری کر رہا ہوں، اور اگر اسی طرح دوسری نیت یہ کرلی کہ میں دکاندار کے ساتھ خرید وفروخت کا جو معاملہ کر رہا ہوں وہ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے اس حلال طریقے کے مطابق کر رہا ہوں جو طریقہ اللہ تعالیٰ نے میرے لئے جائز کیا ہے اور حرام طریقے سے معاملہ نہیں کر رہا ہوں، تو ان دو نیتوں کے ساتھ خریداری کا جو معاملہ کیا اور دکاندار کو جو پیسے دیئے، یہ دینا اللہ تعالیٰ کے لئے ہوا۔ اگرچہ بظاہر یہ نظر آ رہا ہے کہ تم نے ایک دنیاوی لین دین کا معاملہ کیا اور گوشت خریدا یا کپڑا خریدا یا ترکاری خریدی لیکن یہ دینا اللہ تعالیٰ کے لئے ہوا۔

صرف زاویۂ نگاہ بدل لیجئے

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ دین اور دنیا میں صرف زاویۂ نگاہ بدلنے کا فرق ہے۔ اگر زاویۂ نگاہ بدل لو تو وہی دنیا تمہارے حق میں دین بن جائے گی۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم دنیا کے اندر جو کچھ کام کر رہے ہو، سونا، جاگنا، اُٹھنا، بیٹھنا، کھانا، پینا، یہ سب کرتے رہو مگر ذرا سا زاویۂ نگاہ بدل لو۔ مثلاً کھانا کھانا ایک دنیاوی کام ہے، لیکن کھانا کھاتے وقت ذرا یہ سوچ لو کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا))(۱)

یعنی تمہارے نفس کا بھی تمہارے اُوپر کچھ حق ہے۔ اس حق کی ادائیگی کے لئے کھانا کھا رہا ہوں۔ اور یہ سوچ لو کہ حضور اقدس ﷺ کے سامنے جب کھانا آتا تو آپ اس کو اللہ تعالیٰ کی نعمت سمجھ کر اس پر شکر کرتے ہوئے کھانا تناول فرمالیا کرتے تھے۔ میں بھی آپ کی اسی سنت کی اتباع میں کھانا کھا رہا ہوں۔ تو اب یہی دنیا کا کام دین کا کام بن گیا۔ لہٰذا وہ سارے کام جن کو ہم دنیاوی کام سمجھتے ہیں، ان میں کوئی بھی کام ایسا نہیں ہے جس کو ہم زاویۂ نگاہ کی تبدیلی سے دین نہ بنا سکیں اور اس کو اللہ کے لئے نہ بنا سکیں۔ صبح سے لے کر شام تک کی زندگی میں جتنے کام ہم کرتے ہیں ان کے بارے میں

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الصوم، باب من أقسم على أخيه ليفطر في التطوع، رقم: ۱۷۳۲، سنن الترمذي، كتاب الزهد عن رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم، رقم: ۳۳۳۷، سنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب ما يؤمر به من القصد في الصلاة، رقم: ۱۱۶۲، مسند أحمد، مسند عبدالله بن عمرو، رقم: ۶۵۸۳

ذرا سوچیں کہ میں ان کے اندر زاویہ نگاہ بدل کر کس طرح ان کو دین بنا سکتا ہوں۔

ہر نیک کام صدقہ ہے

لوگ سمجھتے ہیں کہ صدقہ کرنا صرف اس کا نام ہے کہ آدمی کسی ضرورت مند کو پیسے دیدے یا کسی غریب کو کھانا کھلا دے وغیرہ۔ بس یہ کام صدقہ ہے اس کے علاوہ کوئی کام صدقہ نہیں۔ لیکن حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ ہر نیک کام جو نیک نیت سے کیا جائے وہ صدقہ ہے۔[1] یہاں تک فرمایا کہ کھانے کا وہ لقمہ جو انسان اپنی بیوی کے منہ میں ڈالے، یہ بھی صدقہ ہے۔[2] یہ صدقہ اس لئے ہے کہ آدمی یہ کام اس لئے کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے ذمے یہ حق عائد کیا ہے، اس حق کی ادائیگی کے لئے میں یہ کام کر رہا ہوں تو اللہ تعالیٰ اس کو اس کام پر صدقہ کا اجر وثواب عطا فرمائیں گے۔ یہ سب کام اللہ کے لئے دینے میں داخل ہیں۔

ایمانِ کامل کی دوسری علامت

دوسری علامت یہ بیان فرمائی کہ اگر روکے اور منع کرے تو اللہ کے لئے روکے۔ مثلاً کسی جگہ پر پیسہ خرچ کرنے سے بچایا تو وہ بچانا بھی اللہ کے لئے ہو۔ چونکہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے کہ فضول خرچی نہ کرو۔ اس فضول خرچی سے بچنے کے لئے میں اپنا پیسہ بچا رہا ہوں۔ تو یہ بچانا اور روکنا اللہ کے لئے ہے۔ یا مثلاً کوئی شخص آپ سے ایسے کام کے لئے پیسوں کا مطالبہ کر رہا ہے جو کام شرعاً ممنوع ہے۔ اب آپ نے اس کام کے لئے اس کو پیسے نہیں دیئے تو یہ نہ دینا اللہ تعالیٰ کیلئے ہوا۔

رسم کے طور پر ہدیہ دینا

ہمارے معاشرے میں نہ جانے کیسے کیسے رسم و رواج پڑ گئے ہیں کہ اس موقع پر فلاں تحفہ دیا جاتا ہے، اس موقع پر فلاں تحفہ دیا جاتا ہے، اس موقع پر یہ رسم ہے۔ اگر اس موقع پر نہیں دیں گے تو ناک کٹ جائے گی۔ اب اس موقع پر تحفہ دینے کا نہ تو شریعت نے کوئی حکم دیا اور نہ اللہ اور اللہ کے

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب کل معروف صدقة، رقم: ۵۵۶۲، صحیح مسلم، کتاب الزکاة، باب بیان أن اسم الصدقة یقع علی کل نوع من المعروف، رقم: ۱۶۷۳، سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول الله، باب ما جاء فی طلاقة الوجه وحسن البشر، رقم: ۱۸۹۳

(۲) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب ما جاء ان الاعمال بالنیة والحسبة، رقم: ۵۴، سنن الدارمی، کتاب الوصایا، باب الوصیة بالثلث، رقم: ۳۰۶۵

رسول ﷺ نے کوئی حکم دیا۔ مثلاً تقریبات اور شادیوں میں ''نیوتہ'' دیا جاتا ہے، اس کو اس قدر لازمی سمجھا جاتا ہے کہ چاہے کسی کے پاس پیسے ہوں یا نہ ہوں، چاہے وہ قرض لے، چاہے وہ حرام طریقے سے کما کر دے یا رشوت لے کر دے، لیکن یہ ''نیوتہ'' ضرور دے، اگر نہیں دے گا تو معاشرے میں ناک کٹ جائے گی۔ اب ایک شخص کے پاس دینے کے لئے پیسے موجود ہیں اور معاشرے کی طرف سے دینے کا مطالبہ بھی ہے لیکن وہ شخص صرف اس لئے نہیں دے رہا کہ چاہے معاشرے کے اندر ناک کٹ جائے لیکن میرا اللہ تعالیٰ تو راضی ہوگا۔ اب یہ روکنا اللہ کیلئے ہوگا۔ یہ بھی ایمانِ کامل کی علامت ہے۔

ایمانِ کامل کی تیسری علامت

تیسری علامت یہ بیان فرمائی کہ اگر محبت کرے تو اللہ کے لئے محبت کرے۔ دیکھئے! ایک محبت تو بغیر کسی شائبہ کے خالصۃً اللہ کے لئے ہوتی ہی ہے۔ جیسے کسی اللہ والے سے محبت ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے محبت اس وجہ سے نہیں ہوتی کہ اس سے پیسے کمائیں گے بلکہ اس سے محبت اس نیت سے ہوتی ہے کہ اس سے محبت اور تعلق رکھیں گے تو ہمارے دین کا فائدہ ہوگا اور اللہ تعالیٰ راضی ہوں گے۔ یہ محبت اللہ کے لئے ہے اور بڑی برکت کی اور بڑے فائدے کی چیز ہے۔

دنیا کی خاطر اللہ والوں سے تعلق

بعض اوقات شیطان اور انسان کا نفس اس محبت میں بھی صحیح راستے سے گمراہ کر دیتا ہے۔ مثلاً اولیاء اللہ سے اس تعلق کے وقت شیطان یہ نیت دل میں ڈال دیتا ہے کہ اگر ہم ان کے مقرب بنیں گے تو دنیا والوں کی نگاہ میں ہماری قدر و قیمت بڑھ جائے گی۔ العیاذ باللہ۔ یا مثلاً لوگ یہ کہیں گے یہ صاحب تو فلاں بزرگ کے خاص آدمی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو محبت خالص اللہ کے لئے ہونی چاہئے تھی وہ اللہ کے لئے نہیں ہوتی بلکہ وہ محبت دنیاداری کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ یا بعض لوگ کسی اللہ والے کے ساتھ اس لئے رابطہ جوڑ لیتے ہیں کہ ان کے پاس ہر قسم کے لوگ آتے ہیں، صاحبِ منصب اور صاحبِ اقتدار بھی آتے ہیں اور بڑے بڑے مالدار لوگ بھی آتے ہیں۔ جب ہم ان بزرگ کے پاس جائیں گے تو ان لوگوں سے بھی تعلقات قائم ہوں گے اور پھر اس تعلق کے ذریعہ ان سے اپنی ضروریات اور اپنے مقاصد پورے کریں گے۔ العیاذ باللہ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو محبت اللہ کیلئے ہونی تھی وہ دنیا حاصل کرنے کے لئے ہوگئی۔ لیکن اگر کوئی شخص کسی اللہ والے کے پاس یا کسی استاد کے پاس یا کسی شیخ کے پاس دین حاصل کرنے کے لئے جا رہا ہے تو یہ محبت خالص اللہ کے لئے ہے اور حب فی اللہ میں داخل ہے اور اس محبت پر اللہ تعالیٰ نے بڑے ثمرات اور اجر و ثواب کا وعدہ فرمایا ہے۔

دنیاوی محبتیں بھی اللہ کے لئے ہونی چاہئیں

لیکن اس محبت کے علاوہ جو دنیاوی محبتیں کہلاتی ہیں مثلاً ماں سے محبت ہے یا باپ سے محبت ہے یا بھائی بہن سے محبت ہے یا بیوی بچوں سے محبت ہے۔ رشتہ داروں سے محبت ہے، دوستوں سے محبت ہے، اگر انسان ذرا سا زاویۂ نگاہ بدل لے تو یہ محبتیں بھی اللہ تعالیٰ کے لئے ہو جاتی ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص والدین سے محبت اس نیت سے کرے کہ اللہ اور اللہ کے رسول جناب رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے کہ والدین سے محبت کرو۔ یہاں تک فرمادیا کہ اگر کوئی شخص والدین پر محبت سے ایک نظر ڈال لے تو اللہ تعالیٰ اس شخص کو ایک حج اور ایک عمرے کا ثواب عطا فرمائیں گے۔ اب بظاہر دیکھنے میں وہ شخص طبعی تقاضے کے نتیجے میں والدین سے محبت کر رہا ہے لیکن حقیقت میں وہ محبت اللہ کیلئے ہے۔

بیوی سے محبت اللہ کے لئے ہو

بیوی سے محبت ہے۔ اب بظاہر تو یہ محبت نفسانی تقاضے سے ہے۔ لیکن محبت میں اگر آدمی یہ نیت کر لے کہ اللہ اور اللہ کے رسول جناب رسول اللہ ﷺ نے اس محبت کا حکم دیا ہے اور میں حضور اکرم ﷺ کی سنت کی اتباع میں بیوی سے محبت کر رہا ہوں تو یہی محبت اب اللہ کے لئے ہوگئی۔ اب اگر ایک شخص اللہ کے لئے بیوی سے محبت کر رہا ہے اور دوسرا شخص اپنی نفسانی خواہشات کے لئے بیوی سے محبت کر رہا ہے تو بظاہر دیکھنے میں دونوں محبتیں ایک جیسی نظر آئیں گی، کوئی فرق معلوم نہیں ہوگا لیکن دونوں محبتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ احادیث میں یہ بات ثابت ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ اپنی ازواج مطہرات سے بڑی محبت فرماتے تھے اور ان کی دلداری کے لئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں فرماتے تھے۔ حضورِ اقدس ﷺ کے ازواج مطہرات کے ساتھ ایسے ایسے معاملات نظر آتے ہیں جو بعض اوقات ہم جیسے لوگوں کو حیرت انگیز معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً حدیث شریف میں ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو گیارہ عورتوں کی کہانی سنائی کہ گیارہ عورتیں ایک جگہ جمع ہوئیں اور انہوں نے آپس میں یہ طے کیا کہ ہر عورت اپنے اپنے شوہر کا حال بیان کرے گی۔ پھر ایک عورت نے یہ کہا۔ دوسری عورت نے یہ کہا۔ تیسری نے یہ کہا۔ چوتھی نے یہ کہا وغیرہ۔ اب جس ذاتِ گرامی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل ہو رہی ہے اور جس ذاتِ گرامی کا ہر وقت اللہ تعالیٰ سے رابطہ قائم ہے، وہ ذاتِ گرامی اپنی بیوی کو گیارہ عورتوں کا قصہ سنا رہے ہیں۔ (۱)

(۱) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب حسن المعاشرۃ مع الأھل، رقم: ۴۷۹۰، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب ذکر حدیث أم زرعۃ، رقم: ۴۴۸۱

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ سفر پر تشریف لے جارہے تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ساتھ تھیں، راستے میں ایک کھلا میدان آیا تو آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ دوڑ لگاؤ گی؟ انہوں نے عرض کیا کہ ہاں۔ چنانچہ آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ اس میدان میں دوڑ لگائی۔ وہاں بے پردگی کا کوئی احتمال نہیں تھا۔ اس لئے کہ جنگل تھا اور کوئی دوسرا شخص ساتھ نہیں تھا۔(۱)

ہمارے کام نفسانی خواہش کے تابع ہوتے ہیں

اب بظاہر یہ کام ایسے ہیں جن کا اللہ تعالیٰ سے یا اللہ کی عبادت سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ اسی طرح ہم میں سے کوئی شخص بیوی کی دلداری اور اس کی دلجوئی کے لئے اس قسم کا کوئی تفریح کا کام کرتا ہے تو وہ بھی بظاہر ایسا ہی لگتا ہے جیسے حضورِ اقدس ﷺ دلجوئی کا معاملہ فرمایا کرتے تھے۔ لیکن ہمارے اس کام میں اور حضورِ اقدس ﷺ کے اس کام میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ہم اس کام کو اپنی نفسانی خواہش اور نفسانی تقاضے کی بنیاد پر کرتے ہیں اور جناب محمد رسول اللہ ﷺ اپنے مقامِ بلند سے نیچے اُتر کر اس کام کو اس لئے کر رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ بیوی کی دلداری کرو۔

''عارف'' کون ہوتا ہے؟

صوفیاء کرام نے فرمایا کہ ''عارف'' یعنی جو اللہ کی معرفت اور شریعت و طریقت کی معرفت رکھتا ہو، وہ ''عارف'' مجموعۂ اضداد ہوتا ہے۔ یعنی اس کی ذات میں اور اس کے عمل میں ایسی چیزیں جمع ہوتی ہیں جو بظاہر دیکھنے میں متضاد معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک طرف اس کا رابطہ اللہ تعالیٰ سے بھی جڑا ہوا ہے۔ تعلق مع اللہ بھی حاصل ہے اور ملکہ یادداشت بھی حاصل ہے۔ یعنی ہر وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر و فکر اور اس کی یاد دل میں بسی ہوئی ہے اور دوسری طرف لوگوں کے ساتھ اور گھر والوں کے ساتھ ہنس رہا ہے، بول بھی رہا ہے، کھا بھی رہا ہے، پی بھی رہا ہے۔ اس لئے ایسا شخص مجموعۂ اضداد ہوتا ہے۔

مبتدی اور منتہی کے درمیان فرق

اسی طرح صوفیاء کرام نے فرمایا کہ جو آدمی مبتدی ہوتا ہے یعنی جس نے ابھی طریقت کے راستے پر چلنا شروع کیا ہے اور دوسرا آدمی جو منتہی ہوتا ہے یعنی جو طریقت کا پورا راستہ طے کر کے آخری انجام تک پہنچ گیا ہے، ان دونوں کی ظاہری حالت ایک جیسی ہوتی ہے۔ بظاہر دونوں ایک جیسے نظر آتے

(۱) سنن أبي داؤد، كتاب الجهاد، باب في السبق على الرجل، رقم: ٢٢١٤

ہیں اور جو آدمی درمیان میں ہوتا ہے اس کی حالت علیحدہ ہوتی ہے۔

مثلاً ایک شخص ہم جیسا مبتدی ہے جس نے ابھی دین کے راستے پر چلنا شروع کیا ہے تو وہ دنیا کے سارے کام کر رہا ہے۔ کھا رہا ہے، پی رہا ہے، ہنس بول رہا ہے، خرید و فروخت کر رہا ہے، بیوی بچوں کے ساتھ ہنسی مذاق کر رہا ہے۔ دوسری طرف حضورِ اقدس ﷺ ہیں کہ آپ بازار میں خرید و فروخت بھی کر رہے ہیں، مزدوری بھی کر رہے ہیں، بیوی بچوں کے ساتھ ہنس بول بھی رہے ہیں جبکہ آپ منتہی ہیں۔ اب بظاہر مبتدی اور منتہی کی حالت ایک جیسی نظر آ رہی ہے۔ لیکن حقیقت میں دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اور ایک تیسرا آدمی ہے جو مبتدی سے ذرا آگے بڑھ گیا ہے اور درمیان راستے میں ہے۔ اس کی حالت الگ ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ نہ تو بازار میں جاتا ہے، نہ بیوی بچوں کے ساتھ ہنستا بولتا ہے اور ہر وقت اللہ کی یاد اور استغراق میں لگا ہوا ہے۔ صبح سے شام تک اس کے علاوہ اس کا کوئی مشغلہ نہیں ہے۔ یہ درمیان والا شخص ہے۔

مبتدی اور منتہی کی مثال

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان تینوں اشخاص کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھاتے ہوئے فرمایا کہ جیسے ایک دریا ہے، ایک آدمی دریا کے اس کنارے پر کھڑا ہے اور دوسرا آدمی دریا پار کر کے دوسرے کنارے پر کھڑا ہے اور تیسرا آدمی دریا کے اندر ہے، دریا پار کر رہا ہے اور ہاتھ پاؤں چلا رہا ہے۔ اور اب بظاہر وہ شخص جو اس کنارے پر کھڑا ہے اور وہ شخص جو دوسرے کنارے پر کھڑا ہے، دونوں کی ظاہری حالت ایک جیسی ہے۔ یہ بھی ساحل پر کھڑا ہے اور وہ بھی ساحل پر کھڑا ہے لیکن جو اس ساحل پر کھڑا ہے وہ ابھی تک دریا میں داخل ہی نہیں ہوا اور ابھی تک اس نے دریا کی موجوں کا مقابلہ نہیں کیا ہے لیکن جو شخص دوسرے ساحل پر کھڑا ہے وہ دریا پار کر کے اور دریا کی موجوں کا مقابلہ کر کے دوسرے ساحل پر پہنچ چکا ہے۔ اور تیسرا شخص ابھی دریا میں غوطے لگا رہا ہے اور دوسرے ساحل پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے اور موجوں سے لڑ رہا ہے۔ اب بظاہر یہ نظر آ رہا ہے کہ یہ تیسرا شخص بڑا بہادر ہے جو دریا کی موجوں سے کھیل رہا ہے اور طوفانوں کا مقابلہ کر رہا ہے لیکن حقیقتاً بہادر وہ ہے جو ان موجوں اور طوفانوں کا مقابلہ کر کے دوسرے کنارے پر پہنچ چکا ہے۔ اور اب اس کی حالت اس شخص جیسی ہو گئی جو ابھی تک دریا میں داخل ہی نہیں ہوا۔ اس وجہ سے مبتدی اور منتہی کی حالت ایک جیسی نظر آتی ہے۔ لیکن حقیقت میں دونوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

حب فی اللہ کے لئے مشق کی ضرورت ہے

اب یہ کہ دنیاوی محبتیں بھی اللہ کے لئے ہو جائیں، یہ درجہ حاصل کرنے کے لئے انسان کو کچھ مشق کرنی پڑتی ہے۔ اور بزرگانِ دین اور صوفیاء کرام کے پاس جب کوئی شخص اپنی اصلاح کرانے کے لئے جاتا ہے تو یہ حضرات مشق کراتے ہیں کہ یہ ساری محبتیں اسی طرح رہیں لیکن ان محبتوں کا زاویہ بدل جائے اور ان کا طریقہ اس طرح بدل جائے کہ یہ محبتیں حقیقت میں اللہ کے لئے ہو جائیں۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے ان محبتوں کو بدلنے کی سالہا سال تک مشق کی ہے تب جا کر اس میں کامیابی ہوئی اور اس طرح مشق کی ہے کہ مثلاً گھر میں داخل ہوئے، کھانے کا وقت ہے، بھوک لگی ہوئی ہے، اب کھانا کھانے کے لئے بیٹھے اور کھانا سامنے آیا۔ اب دل چاہ رہا ہے کہ جلدی سے کھانا شروع کر دیں لیکن ایک لمحے کے لئے رک گئے اور دل میں یہ خیال لائے کہ نفس کے تقاضے سے کھانا نہیں کھائیں گے۔ پھر یہ سوچا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے نفس کا مجھ پر حق رکھا ہے اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت یہ تھی کہ آپ کے سامنے جب کھانا آتا تو آپ شکر ادا کرتے ہوئے اور اس کھانے کی طرف اپنی احتیاج ظاہر کرتے ہوئے کھانا کھالیا کرتے تھے۔ مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت کی اتباع کرنی چاہئے۔ لہٰذا آپ کی اتباع میں کھانا کھاتا ہوں۔ پھر کھانا شروع کیا۔ اس طرح زاویۂ نگاہ بدل دیا۔

بچوں کے ساتھ بھی اللہ کے لئے محبت ہو

اسی طرح گھر میں داخل ہوئے۔ دیکھا کہ بچہ کھیل رہا ہے اور وہ بچہ کھیلتا ہوا اچھا لگا اور دل چاہا کہ اس کو گود میں اُٹھا کر اس کو پیار کروں۔ اس کے ساتھ کھیلوں۔ لیکن ایک لمحے کے لئے رک گئے اور یہ سوچا کہ اپنے نفس کے تقاضے سے بچے سے پیار نہیں کریں گے۔ پھر دوسرے لمحے دل میں خیال لائے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یہ تھی کہ آپ بچوں سے محبت فرمایا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے روز مسجدِ نبوی میں جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے، اتنے میں حضرت حسن یا حضرت حسین رضی اللہ عنہما گرتے پڑتے مسجدِ نبوی میں پہنچ گئے۔ جب آپ نے ان کو آتا دیکھا تو فوراً منبر سے اُترے اور ان کو گود میں اُٹھالیا۔ (۱)

ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نوافل پڑھ رہے تھے، حضرت امامہ رضی اللہ عنہا جو بچی تھیں وہ آ کر آپ کے کندھے پر کسی طرح سوار ہو گئیں۔ جب آپ رکوع میں جانے لگے تو آپ نے ان کو آہستہ سے اُٹھا کر

---

(۱) حياة الصحابة (٢/٦١٣)

نیچے اُتار دیا۔ جب آپ سجدے میں گئے تو پھر وہ آپ کے اُوپر سوار ہو گئیں۔ (۱)

بہرحال! بچوں کے ساتھ پیار کرنا، محبت کرنا، ان کے ساتھ کھیلنا، یہ حضورِ اقدس ﷺ کی سنت ہے۔ اس سنت کی اتباع میں میں بھی بچوں سے پیار کرتا ہوں اور ان کے ساتھ کھیلتا ہوں۔ یہ تصور کر کے بچے کو اُٹھالیا اور سنت کا استحضار کر لیا۔ شروع شروع میں آدمی تکلف سے یہ کام کرتا ہے لیکن بار بار کرنے کے نتیجے میں تکلف باقی نہیں رہتا بلکہ وہ کام طبیعت بن جاتا ہے اور پھر اس کے بعد ساری محبتیں اللہ کے لئے ہو جاتی ہیں۔ چاہے بیوی سے محبت ہو یا بچوں سے محبت ہو یا چاہے والدین سے محبت ہو۔

یہ نسخہ تو بہت آسان ہے۔ اس سے زیادہ آسان نسخہ اور کیا ہو گا کہ سب کام جو تم کرتے ہو اسی طرح کرتے رہو، صرف زاویہ نگاہ بدل لو اور نیتوں کے اندر تبدیلی لے آؤ۔ لیکن اس آسان نسخہ پر عمل اس وقت ہو گا جب انسان اس کے لئے تھوڑی سی محنت اور مشقت کرے اور ہر ہر قدم پر اس مشق کو کرنے کی کوشش کرے۔ پھر ایک وقت ایسا آئے گا کہ یہ ساری محبتیں اللہ کے لئے ہو جائیں گی۔

حبّ فی اللہ کی علامت

اب دیکھنا یہ ہے کہ اللہ کے لئے محبت ہونے کی علامت کیا ہے؟ اس کی علامت یہ ہے کہ اگر کسی وقت اللہ کی محبت کا یہ تقاضا ہو کہ میں ان محبتوں کو خیر باد کہہ دوں اور چھوڑ دوں تو اس وقت انسان کی طبیعت پر ناقابلِ برداشت بوجھ نہ ہو۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ محبت اللہ کے لئے ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بات یاد آ گئی۔ وہ یہ کہ ایک مرتبہ آپ نے حاضرینِ مجلس سے فرمایا کہ آج اللہ تعالیٰ نے اپنے امتحان کا ایک عجیب موقع عطا فرمایا۔ وہ یہ کہ جب میں گھر گیا اور اہلیہ سے بات ہوئی تو اہلیہ نے تلخ لہجے میں کوئی بات کہہ دی۔ اس وقت میرے منہ سے یہ نکلا کہ "بی بی مجھے اس لہجے کی برداشت نہیں اور اگر تم کہو تو میں یہ کرنے کے لئے تیار ہوں کہ اپنی چارپائی اُٹھا کر خانقاہ میں ڈال لوں اور ساری عمر وہیں گزار دوں، لیکن مجھے اس لہجے کی برداشت نہیں"

حضرت نے فرمایا کہ میں نے اپنی اہلیہ سے یہ بات کہہ تو دی لیکن بعد میں میں نے سوچا اور اپنا جائزہ لیا کہ بڑی بات کہہ دی کہ چارپائی اُٹھا کر خانقاہ میں ڈال دوں اور ساری عمر اس طرح

(۱) یہ حضرت امامہ بنت ابی العاص ہیں جو کہ حضور ﷺ کی نواسی ہیں۔ صحیح البخاری (۲/۸۸۷)، طبقات ابن سعد (۸/۳۹)

گزار دوں، کیا تم اس کام کے کرنے پر قادر بھی ہو؟ اگر اہلیہ کہہ دے کہ چلو ایسا کرلو تو کیا ایسا کرلو گے؟ اور ساری عمر خانقاہ میں گزار دو گے یا ویسے ہی جھوٹا دعویٰ کر دیا؟ لیکن جائزہ لینے کے بعد یہ محسوس ہوا کہ الحمدللہ میں اس کام پر قادر ہوں۔ چونکہ ساری محبتیں اللہ کے لئے ہوگئی ہیں اس لئے اب اگر کسی وقت اللہ کی محبت کی خاطر دوسری محبت کو چھوڑنا پڑے تو اس وقت کوئی نا قابلِ برداشت بوجھ نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ محبت تبدیل ہو کر اللہ کے لئے محبت بن گئی ہے۔

لیکن یہ مقام اتنی آسانی سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے محنت اور مشق کرنی پڑتی ہے اور یہ محنت اور مشق ایسی چیز نہیں ہے جو ناممکن ہو بلکہ ہر انسان کر سکتا ہے۔ پھر اس محنت اور مشق کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ مقام عطا فرما دیتے ہیں وہ کر کے دیکھنے کی بات ہے۔ یہ سب "احب للّٰہ" اللہ کے لئے محبت میں داخل ہے۔

ایمانِ کامل کی چوتھی علامت

چوتھی علامت ہے "وابغض للّٰہ" بغض اور غصہ بھی اللہ کے لئے ہو۔ یعنی جس کسی پر غصہ ہے یا جس کسی سے بغض ہے وہ اس کی ذات سے نہیں ہے بلکہ اس کے کسی بُرے عمل سے ہے یا اس کی کسی ایسی بات سے ہے جو مالکِ حقیقی کی ناراضگی کا سبب ہے تو یہ غصہ اور ناراضگی اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے۔

ذات سے نفرت نہ کریں

اس لئے بزرگوں نے ایک بات فرمائی ہے جو ہمیشہ یاد رکھنے کی ہے۔ وہ یہ کہ نفرت اور بغض کافر سے نہیں بلکہ اس کے کفر سے ہے۔ فاسق سے بغض نہیں بلکہ اس کے فسق سے بغض ہے۔ نفرت اور بغض گناہگار سے نہیں بلکہ گناہ سے ہے۔ جو آدمی فسق و فجور اور گناہ کے اندر مبتلا ہے اس کی ذات غصہ کا محل نہیں بلکہ اس کا فعل غصہ کا محل ہے۔ اس لئے کہ ذات تو قابلِ رحم ہے۔ وہ بیچارہ بیمار ہے، کفر کی بیماری میں مبتلا ہے، فسق کی بیماری میں مبتلا ہے اور نفرت بیمار سے نہیں ہوتی بلکہ بیماری سے ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اگر بیمار سے نفرت کرو گے تو پھر اس کی کون دیکھ بھال کرے گا؟ لہٰذا فسق و فجور سے اور کفر سے نفرت ہوگی اس کی ذات سے نہیں ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ اگر اس کی ذات فسق و فجور سے باز آجائے تو وہ ذات گلے لگانے کے لائق ہے۔ اس لئے کہ ذات کے اعتبار سے اس سے کوئی پرخاش اور کوئی ضد نہیں۔

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا بے مثال عفو و درگزر

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل دیکھئے، وہ خاتون جس نے آپ کے محبوب چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا کلیجہ نکال کر کچا چبایا یعنی حضرت ہندہ رضی اللہ عنہا اور جو اس کے سبب بنے یعنی حضرت وحشی رضی اللہ عنہ، جب یہ دونوں اسلام کے دائرے میں داخل ہو گئے اور اسلام قبول کرلیا تو اب وہ آپ کے اسلامی بہن اور بھائی بن گئے۔ آج حضرت وحشی کے نام کے ساتھ ''رضی اللہ تعالیٰ عنہ'' کہتے ہیں۔ ہندہ جنہوں نے کلیجہ چبایا تھا آج ان کے نام کے ساتھ ''رضی اللہ تعالیٰ عنہا'' کہا جاتا ہے۔ بات دراصل یہ تھی کہ ان کی ذات سے کوئی نفرت نہیں تھی بلکہ ان کے فعل اور ان کے اعتقاد سے نفرت تھی۔ پھر جب سچی توبہ کے ساتھ وہ بُرا فعل اور بُرا اعتقاد ختم ہو گیا تو اب ان سے نفرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ اولیاء اللہ میں اُونچا مقام رکھتے ہیں۔ ان کے زمانے میں ایک بڑے عالم اور فقیہ اور مفتی مولانا حکیم ضیاء الدین صاحب بھی موجود تھے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ بحیثیت ''صوفی'' کے مشہور تھے اور یہ بڑے عالم ''مفتی اور فقیہ'' کی حیثیت سے مشہور تھے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ ''سماع'' کو جائز کہتے تھے۔ بہت سے صوفیاء کے یہاں سماع کا رواج تھا۔ سماع کا مطلب ہے کہ موسیقی کے آلات کے بغیر حمد و نعت وغیرہ کے مضامین کے اشعار ترنم سے یا بغیر ترنم کے محض خوش آواز سے کسی کا پڑھنا اور دوسروں کا اسے خوش عقیدگی اور محبت سے سننا۔ بعض صوفیاء اس کی اجازت دیتے تھے اور بہت سے فقہاء اور مفتی حضرات اس سماع کو بھی جائز نہیں کہتے تھے بلکہ ''بدعت'' قرار دیتے تھے۔ چنانچہ ان کے زمانے کے مولانا حکیم ضیاء الدین صاحب نے بھی ''سماع'' کے ناجائز ہونے کا فتویٰ دیا تھا۔ اور حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ ''سماع'' سنتے تھے۔

جب مولانا حکیم ضیاء الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کا وقت قریب آیا تو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ حضرت کی عیادت اور مزاج پرسی کے لئے تشریف لے گئے اور اطلاع کروائی کہ جا کر حکیم ضیاء الدین صاحب سے عرض کیا جائے کہ نظام الدین مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوا ہے۔ اندر سے حکیم ضیاء الدین صاحب نے جواب دیا کہ ان کو باہر روک دیں، میں کسی بدعتی کی صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ نے جواب بھجوایا کہ ان سے عرض کر دو کہ بدعتی بدعت سے توبہ کرنے کے لئے حاضر ہوا ہے۔ اسی وقت مولانا حکیم ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی

پگڑی بھیجی کہ اسے بچھا کر خواجہ صاحب اس کے اُوپر قدم رکھتے ہوئے آئیں اور جوتے سے قدم رکھیں، ننگے پاؤں نہ آئیں۔ خواجہ صاحب نے پگڑی کو اُٹھا کر سر پر رکھا اور کہا کہ یہ میرے لئے دستارِفضیلت ہے۔اس شان سے اندر تشریف لے گئے۔آکر مصافحہ کیا اور بیٹھ گئے اور حکیم ضیاء الدینؒ کی طرف متوجہ رہے۔پھر خواجہ صاحب کی موجودگی میں حکیم ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کا وقت آ گیا۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ الحمد للہ، حکیم ضیاء الدین صاحب کو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالیا کہ ترقی مدارج کے ساتھ ان کا انتقال ہوا۔

غصہ بھی اللہ کے لئے ہو

بہر حال جو بغض اور غصہ اللہ کے لئے ہوتا ہے وہ کبھی ذاتی دشمنیاں پیدا نہیں کرتا اور وہ عداوتیں پیدا نہیں کرتا وہ فتنے پیدا نہیں کرتا، کیونکہ جس آدمی سے بغض کیا جارہا ہے اور جس پر غصہ کیا جارہا ہے وہ بھی جانتا ہے کہ اس کو میری ذات سے دشمنی نہیں ہے بلکہ میرے خاص فعل سے اور خاص حرکت سے ہے۔اسی وجہ سے وہ اس کی بات کا برا نہیں مانتا۔اس لئے کہ جانتا ہے کہ یہ جو کچھ کہہ رہا ہے اللہ کے لئے کہہ رہا ہے۔اس کو فرماتے ہیں:

((وَأَحَبَّ لِلّٰهِ وَأَبْغَضَ لِلّٰهِ))

یعنی جس سے تعلق اور محبت ہے تو وہ بھی اللہ کے لئے ہے اور جس سے بغض اور نفرت ہے تو وہ بھی اللہ کے لئے ہے۔تو یہ غصہ کا بہترین محل ہے بشرطیکہ یہ غصہ شرعی حد کے اندر ہو۔اللہ تعالیٰ یہ نعمت ہم کو عطا فرمادے کہ محبت ہو تو اللہ کے لئے ہو، غصہ اور بغض ہو تو وہ اللہ کے لئے ہو۔

لیکن یہ غصہ ایسا ہونا چاہئے کہ اس کے منہ میں لگام پڑی ہوئی ہو کہ جہاں اللہ کے لئے غصہ کرنا ہے وہاں تو ہو اور جہاں غصہ نہیں کرنا ہے وہاں لگام ڈال کر اس کو روک دو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا واقعہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیکھئے، ایک یہودی نے آپ کے سامنے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کا کلمہ کہہ دیا۔ العیاذ باللہ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کہاں برداشت کر سکتے تھے، فوراً اس کو پکڑ کر اُوپر اُٹھایا اور پھر زمین پر پٹخ دیا اور اس کے سینے پر سوار ہو گئے۔ یہودی نے جب یہ دیکھا کہ اب میرا قابو تو ان کے اُوپر نہیں چل رہا ہے تو اس نے لیٹے لیٹے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے منہ پر تھوک دیا۔ جیسے کہاوت ہے کہ ''کھسیانی بلی کھمبا نوچے''، لیکن جیسے ہی اس یہودی نے تھوکا، آپ فوراً اس کو چھوڑ کر الگ ہو گئے۔ لوگوں نے آپ سے کہا کہ حضرت! اس نے اور زیادہ گستاخی کا کام کیا کہ آپ کے منہ پر تھوک دیا۔

ایسے میں آپ اس کو چھوڑ کر الگ کیوں ہو گئے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بات اصل میں یہ ہے کہ پہلے اس پر جو میں نے حملہ کیا تھا اور اس کو مارنے کا ارادہ کیا تھا وہ حضورِ اقدس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں کیا تھا۔ اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی جس کی وجہ سے مجھے غصہ آگیا اور میں نے اس کو گرا دیا۔ پھر جب اس نے میرے منہ پر تھوک دیا تو اب مجھے اور زیادہ غصہ آیا لیکن اب اگر میں اس غصہ پر عمل کرتے ہوئے اس سے بدلہ لیتا تو یہ بدلہ لینا حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نہ ہوتا بلکہ اپنی ذات کے لئے ہوتا، اور اس وجہ سے ہوتا کہ چونکہ اس نے میرے منہ پر تھوکا ہے، لہٰذا میں اس کو اور زیادہ ماروں۔ تو اس صورت میں یہ غصہ اللہ اور اس کے رسول کے لئے نہ ہوتا بلکہ اپنی ذات کے لئے ہوتا۔ اس وجہ سے میں اس کو چھوڑ کر الگ ہو گیا۔

یہ درحقیقت اس حدیث وَأَحَبَّ لِلّٰهِ وَأَبْغَضَ لِلّٰهِ پر عمل فرما کر دکھا دیا۔ گویا کہ غصہ کے منہ میں لگام دے رکھی ہے کہ جہاں تک اس غصہ کا شرعی اور جائز موقع ہے، بس وہاں تک تو غصہ کرنا ہے، اور جہاں اس غصہ کا جائز موقع ختم ہو جائے تو اس کے بعد آدمی اس غصے سے اس طرح دور ہو جائے کہ جیسے اس سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ انہیں حضرات کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کان وقافا عن حدود اللہ یعنی یہ اللہ کی حدود کے آگے ٹھہر جانے والے لوگ تھے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا واقعہ

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ مسجدِ نبوی میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے گھر کا پرنالہ مسجدِ نبوی کی طرف لگا ہوا ہے، بارش وغیرہ کا پانی مسجدِ نبوی کے اندر گرتا تھا گویا کہ مسجد کی فضا میں وہ پرنالہ لگا ہوا تھا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے سوچا کہ مسجد تو اللہ تعالیٰ کا گھر ہے اور کسی شخص کے ذاتی گھر کا پرنالہ مسجد کے اندر آرہا ہو تو یہ اللہ کے حکم کے خلاف ہے۔ چنانچہ آپ نے اس پرنالے کو توڑنے کا حکم دے دیا اور وہ توڑ دیا گیا۔ اب دیکھئے کہ آپ نے اس پرنالے کو توڑنے کا جو حکم دیا یہ غصے کی وجہ سے تو دیا لیکن غصہ اس بات پر آیا کہ یہ کام مسجد کے احکام اور آداب کے خلاف ہے۔ جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا کہ میرے گھر کا پرنالہ توڑ دیا گیا ہے تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور ان سے فرمایا کہ آپ نے یہ پرنالہ کیوں توڑ دیا؟ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ جگہ تو مسجد کی ہے، کسی کی ذاتی جگہ نہیں ہے۔ مسجد کی جگہ میں کسی کا پرنالہ آنا شریعت کے حکم کے خلاف تھا اس لئے میں نے توڑ دیا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آپ کو پتہ بھی ہے کہ یہ پرنالہ یہاں پر کس طرح لگا تھا؟ یہ پرنالہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لگا تھا اور آپ کی اجازت سے میں نے لگایا تھا۔ آپ اس کو توڑنے والے کون ہوتے ہیں؟ حضرت فاروق

اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کیا حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی تھی؟ انہوں نے فرمایا کہ ہاں! اجازت دی تھی۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ خدا کے لئے میرے ساتھ آؤ۔ چنانچہ اس پرنالے کی جگہ کے پاس گئے اور وہاں جاکر خود رکوع کی حالت میں کھڑے ہوگئے اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اب میری کمر پر کھڑے ہوکر یہ پرنالہ دوبارہ لگاؤ۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں دوسروں سے لگوالوں گا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ عمر کی یہ مجال کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لگائے ہوئے پرنالے کو توڑ دے۔ مجھ سے یہ اتنا بڑا جرم سرزد ہوا، اس کی کم سے کم سزا یہ ہے کہ میں رکوع میں کھڑا ہوتا ہوں اور تم میری کمر پر کھڑے ہوکر یہ پرنالہ لگاؤ۔ چنانچہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ان کی کمر پر کھڑے ہوکر وہ پرنالہ اس کی جگہ پر واپس لگا دیا۔ (۱)

وہ پرنالہ آج بھی مسجدِ نبوی میں لگا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جزائے خیر دے جن لوگوں نے مسجدِ نبوی کی تعمیر کی ہے، انہوں نے اب بھی اس جگہ پر پرنالہ لگا دیا ہے۔ اگرچہ اب اس پرنالے کا بظاہر کوئی مصرف نہیں ہے لیکن یادگار کے طور پر لگا دیا ہے۔ یہ درحقیقت اس حدیث پر عمل ہے من احب للّٰہ وابغض للّٰہ۔ پہلے جو غصہ اور بغض ہوا تھا وہ اللہ کے لئے ہوا تھا اور اب جو محبت ہے وہ بھی اللہ کے لئے ہے۔ جو شخص یہ کام کرلے اس نے اپنا ایمان کامل بنالیا۔ یہ ایمان کے کامل ہونے کی علامت ہے۔

مصنوعی غصہ کرکے ڈانٹ لیں

بہرحال، اس بغض فی اللّٰہ کی وجہ سے بعض اوقات غصے کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔ خاص طور سے ان لوگوں پر غصہ کا اظہار کرنا پڑتا ہے جو زیرِ تربیت ہوتے ہیں۔ جیسے استاد ہے اس کو اپنے شاگردوں پر غصہ کرنا پڑتا ہے۔ باپ کو اپنی اولاد پر غصہ کرنا پڑتا ہے۔ شیخ کو اپنے مریدوں پر غصہ کرنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ غصہ اس حد تک ہونا چاہئے جتنا اس کی اصلاح کے لئے ضروری ہو۔ اس سے آگے نہ بڑھے۔ جیسا کہ ابھی عرض کیا کہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جب انسان کی طبیعت میں اشتعال ہو، اس وقت غصہ نہ کرے۔ مثلاً استاد کو شاگرد پر غصہ آگیا اور اشتعال پیدا ہوگیا۔ اس اشتعال اور غصہ کے وقت ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ نہ کرے بلکہ جب طبیعت میں وہ اشتعال اور غصہ ختم ہوجائے اس وقت مصنوعی غصہ کرکے ڈانٹ ڈپٹ کرلے تاکہ یہ ڈانٹ ڈپٹ حد سے متجاوز نہ ہو۔ یہ کام ذرا مشکل ہے کیونکہ انسان غصہ کے وقت بے قابو ہوجاتا ہے۔ لیکن جب تک اس کی مشق نہیں کرے گا اس وقت تک

(۱) طبقات ابن سعد (۴/۱۲) کنزالعمال (۷/۶۶) مجمع الزوائد (۴/۲۰۶) حیاۃ الصحابۃ (۲/۴۲۴)

اس غصہ کے مفاسد اور برائیوں سے نجات نہیں ملے گی۔

چھوٹوں پر زیادتی کا نتیجہ

اور پھر جو زیر تربیت افراد ہوتے ہیں جیسے اولاد، شاگرد، مرید، ان پر اگر غصہ کے وقت حد سے تجاوز ہو جائے تو بعض صورتوں میں یہ بات بڑی خطرناک ہو جاتی ہے، کیونکہ جس پر غصہ کیا جا رہا ہے وہ اگر آپ سے بڑا ہے یا برابر کا تو آپ کے غصہ کرنے کے نتیجے میں اس کو جو ناگواری ہوگی اس کا اظہار بھی کر دے گا اور وہ بتا دے گا کہ تمہاری یہ بات مجھے اچھی نہیں لگی، یا کم از کم بدلہ لے لے گا لیکن جو تمہارا ماتحت اور چھوٹا ہے وہ تم سے بدلہ لینے پر تو قادر نہیں ہے بلکہ اپنی ناگواری کے اظہار پر بھی قادر نہیں۔ چنانچہ کوئی بیٹا اپنے باپ سے یا شاگرد اپنے استاد سے یا مرید اپنے شیخ سے یہ نہیں کہے گا کہ آپ نے فلاں وقت جو بات کہی تھی وہ مجھے ناگوار ہوئی۔ اس لئے آپ کو پتہ ہی نہیں چلے گا کہ آپ نے اس کی کتنی دل شکنی کی ہے، اور جب پتہ نہیں چلے گا تو معافی مانگنا بھی آسان نہیں ہوگا۔ اس لئے یہ بہت نازک معاملہ ہے اور خاص طور سے جو چھوٹے بچوں کو پڑھانے والے اساتذہ ہوتے ہیں، ان کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان کا معاملہ تو بہت ہی نازک ہے۔ اس لئے کہ وہ نابالغ بچے ہیں اور نابالغ کا معاملہ یہ ہے کہ اگر وہ معاف بھی کر دے تو معافی نہیں ہوتی کیونکہ نابالغ کی معافی معتبر نہیں۔

بہرحال، آج کی مجلس کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنے غصہ پر قابو پانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اس لئے کہ یہ غصہ بے شمار برائیوں کی جڑ ہے اور اس کے ذریعہ بے شمار باطنی امراض پیدا ہوتے ہیں۔ ابتداء میں تو یہ کوشش کرے کہ غصہ کا اظہار بالکل نہ ہو، بعد میں جب یہ غصہ قابو میں آجائے تو اس وقت یہ دیکھے کہ کہاں غصہ کا موقع ہے اور کہاں غصہ کا موقع نہیں۔ جہاں غصہ کا جائز محل ہو بس وہاں جائز حد تک غصہ کرے اس سے زیادہ نہ کرے۔

غصہ کا غلط استعمال

جیسا کہ ابھی میں نے بتایا کہ بغض فی اللہ یعنی اللہ کے لئے غصہ کرنا چاہئے۔ لیکن بعض لوگ اس کا انتہائی غلط استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ زبان سے تو یہ کہتے ہیں کہ ہمارا یہ غصہ اللہ کے لئے ہے لیکن حقیقت میں وہ غصہ نفسانیت اور تکبر اور دوسرے کی حقارت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ مثلاً جب اللہ تعالیٰ نے ذرا سی دین پر چلنے کی توفیق دے دی اور دین پر ابھی چلنا شروع کیا تو اب ساری دنیا کے لوگوں کو حقیر سمجھنے لگے۔ میرا باپ بھی حقیر ہے، میری ماں بھی حقیر ہے، میرا بھائی بھی حقیر ہے، میری بہن بھی

حقیر ہے، میرے سارے گھر والے حقیر ہیں۔ ان سب کو حقیر سمجھنا شروع کر دیا اور یہ سمجھنے لگا کہ یہ سب تو جہنمی ہیں، میں جنتی ہوں اور مجھے اللہ تعالیٰ نے ان جہنمیوں کی اصلاح کے لئے پیدا کیا ہے۔ اب ان کی اصلاح کے لئے ان پر غصہ کرنا اور ان کے لئے نازیبا الفاظ کا استعمال کرنا اور ان کی تحقیر کرنی اور ان کے حقوق تلف کرنا شروع کر دیا۔ اور پھر شیطان یہ سبق پڑھاتا ہے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں یہ بغض فی اللہ کے ماتحت کر رہا ہوں حالانکہ حقیقت میں یہ سب نفسانیت کے تحت کرتا ہے۔

چنانچہ جو لوگ دین پر نئے نئے چلنے والے ہوتے ہیں۔ شیطان ان کو اس طرح بہکاتا ہے کہ ان کو بغض فی اللہ کا سبق پڑھا کر ان سے دوسرے مسلمانوں کی تحقیر اور تذلیل کراتا ہے، اور اس کے نتیجے میں لڑائیاں، جھگڑے اور فساد ہوتے ہیں۔ بات بات پر لوگوں پر غصہ کرتے ہیں۔ بات بات پر لوگوں کو ٹوک دیتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں فساد پھیل رہا ہے۔

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جملہ

حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جملہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ حق بات، حق نیت سے، حق طریقے سے کہی جائے تو وہ کبھی بے اثر نہیں رہتی اور کبھی فتنہ وفساد پیدا نہیں کرتی۔ گویا کہ تین شرطیں بیان فرمادیں۔ نمبر ایک بات حق ہو، نمبر دو نیت حق ہو، نمبر تین طریقہ حق ہو۔ مثلاً ایک شخص کسی برائی کے اندر مبتلا ہے، اب اس پر ترس کھا کر نرمی اور شفقت سے اس کو سمجھائے تاکہ وہ اس برائی سے کسی طرح نکل جائے۔ یہ نیت ہو، اس میں اپنی بڑائی مقصود نہ ہو اور دوسروں کو ذلیل کرنا مقصود نہ ہو، اور طریقہ بھی حق ہو یعنی نرمی اور محبت سے بات کہے۔ اگر یہ تین شرطیں پائی جائیں تو فتنہ پیدا نہیں ہوتا۔ اور جہاں کہیں یہ دیکھو کہ حق بات کہنے کے نتیجے میں فتنہ کھڑا ہو گیا تو غالب گمان یہ ہے کہ اس کا سبب یہ ہے کہ ان تینوں باتوں میں سے کوئی ایک بات موجود نہیں تھی۔ یا تو بات حق نہ تھی یا نیت حق نہیں تھی یا طریقہ حق نہیں تھا۔

تم خدائی فوجدار نہیں ہو

یہ بات یاد رکھیں کہ تم خدائی فوجدار بن کر دنیا میں نہیں آئے۔ تمہارا کام صرف اتنا ہے کہ حق بات حق نیت اور حق طریقے سے دوسروں کو پہنچاؤ اور مناسب طریقے سے مسلسل پہنچاتے رہو۔ اس کام سے کبھی مت اُکتاؤ۔ لیکن ایسا کوئی کام مت کرو جس سے فتنہ پیدا ہو۔

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اور اپنے فضل وکرم سے ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

ایمان کے تقاضے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○
﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ○ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ○ إِلَّا عَلٰى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ○ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ﴾ (۱)

حقیقی مؤمن کون ہیں؟

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! میں نے ابھی آپ کے سامنے سورۃ المؤمنون کی ابتدائی آیتیں تلاوت کی ہیں، یہ آیتیں اٹھارہویں پارے کے بالکل شروع میں آئی ہیں، ان آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ''مؤمنین'' کی صفات بیان فرمائی ہیں کہ صحیح معنی میں ''مؤمن'' کون لوگ ہیں؟ ان کی صفات کیا ہیں؟ وہ کیا کام کرتے ہیں اور کن کاموں سے بچتے ہیں؟ ساتھ میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بیان فرمایا کہ جو مؤمنین ان صفات کے حامل ہوں گے، ان کو فلاح حاصل ہوگی۔

کامیابی کا مدار عمل پر ہے

ان آیات کی ابتداء ہی ان الفاظ سے فرمائی:

﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾

☆ اصلاحی خطبات (۱۴/۱۷۷۔۱۹۰)، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) المؤمنون: ۱۔۷۔ آیات مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ان ایمان والوں نے یقیناً فلاح پالی ہے جو اپنی نمازوں میں دل سے جھکنے والے ہیں، اور جو لغو چیزوں سے منہ موڑے ہوئے ہیں، اور جو زکوٰۃ پر عمل کرنے والے ہیں، اور جو اپنی شرمگاہوں کی (اور سب سے) حفاظت کرتے ہیں، سوائے اپنی بیویوں اور ان کنیزوں کے جو ان کی ملکیت میں آچکی ہوں، کیونکہ ایسے لوگ قابلِ ملامت نہیں''

یعنی ان مؤمنین نے فلاح پائی جن کے اندر یہ صفات ہیں۔ اس سے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ اگر مسلمان فلاح چاہتے ہیں تو ان اعمال کو اختیار کرنا ہوگا، یہ صفات اپنانی ہوں گی اور اس بات کی پوری کوشش کرنی ہوگی کہ جو باتیں یہاں بیان کی جارہی ہیں ان کو اپنی زندگی کے اندر داخل کریں، کیونکہ اسی پر مسلمانوں کی فلاح کا دارومدار ہے اور اسی پر فلاح موقوف ہے۔

فلاح کا مطلب

پہلے یہاں یہ بات سمجھ لیں کہ ''فلاح'' کا کیا مطلب ہے؟ جب ہم اُردو زبان میں ''فلاح'' کا ترجمہ کرتے ہیں تو عام طور پر اس کا ترجمہ ''کامیابی'' سے کیا جاتا ہے، اس لئے کہ ہمارے پاس اُردو زبان میں اس کے معنی ادا کرنے کے لئے کوئی اور لفظ موجود نہیں، اس وجہ سے مجبوراً اس کا ترجمہ ''کامیابی'' سے کردیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت میں عربی زبان کے لحاظ سے اور قرآن کریم کی اصطلاح کے لحاظ سے ''فلاح'' کا مفہوم اس سے بہت زیادہ وسیع اور عام ہے۔ اس لفظ کے اصل معنی یہ ہیں ''دنیا و آخرت میں خوشحال ہونا''، دنیا و آخرت دونوں کی خوشحالی کے مجموعے کو ''فلاح'' کہا جاتا ہے، چنانچہ اذان میں ایک کلمہ کہا جاتا ہے: ''حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ'' آؤ فلاح کی طرف، اذان کے اس کلمہ سے بھی یہ بات بتائی جارہی ہے کہ اگر تم دنیا و آخرت دونوں کی خوشحالی چاہتے ہو تو نماز کے لئے آؤ اور مسجد میں پہنچو۔ بہرحال! ''فلاح'' کا لفظ بڑا ہی جامع اور مانع لفظ ہے۔

قرآن کریم میں سورۃ بقرہ کی ابتداء میں بھی فلاح کا لفظ استعمال ہوا ہے:

﴿أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ (۱)

یعنی جو لوگ تقویٰ اختیار کرنے والے ہیں اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں، قرآن کریم پر اور قرآن کریم سے پہلے نازل ہونے والی تمام کتابوں پر ایمان رکھنے والے ہیں، یہی لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت یافتہ ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ لہٰذا ''فلاح'' کا لفظ بڑا جامع ہے اور دنیا و آخرت کی تمام خوشحالیوں کو شامل ہے۔

کامیاب مؤمن کی صفات

اس ''سورۃ المؤمنون'' میں یہ کہا جارہا ہے کہ وہ مؤمن فلاح پائیں گے جن کے اندر وہ صفات ہوں گی جو آگے مذکور ہیں، پھر ایک ایک صفت کو بیان فرمایا کہ وہ مؤمن فلاح پائیں گے جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرنے والے ہیں اور بیہودہ اور فضول باتوں سے اعراض کرنے والے ہیں اور زکوٰۃ

(۱) البقرۃ:۵

دیتے ہیں اور زکوٰۃ کے حکم پر عمل کرنے والے ہیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، اور اپنی امانتیں اور اپنے عہد کو پورا کرنے والے ہیں۔ یہ ساری صفات ان آیاتِ کریمہ میں بیان فرمائی ہیں۔ ان میں سے ہر صفت تفصیل اور تشریح چاہتی ہے، ان صفات کا مطلب سمجھنے کی ضرورت ہے، اگر ان صفات کا صحیح مطلب اللہ تعالیٰ ہمارے ذہنوں میں بٹھادیں اور ان صفات کی اہمیت ہمارے ذہنوں میں پیدا فرمادیں اور ان صفات پر عمل کی توفیق عطا فرمادیں تو انشاء اللہ ہم سب فلاح یافتہ ہیں۔ اس لئے خیال آیا کہ ان صفات کو تفصیل سے بیان کردیا جائے، ہوسکتا ہے کہ ان کے بیان میں چند ہفتے لگ جائیں، ایک ایک صفت کا بیان ایک ایک جمعہ کو ہوتا جائے گا تو ساری صفات کا انشاء اللہ بیان ہوجائے گا۔

پہلی صفت ''خشوع''

پہلی صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ مؤمن فلاح یافتہ ہیں جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرنے والے ہیں۔ گویا کہ فلاح کی اولین شرط اور فلاح کا سب سے پہلا راستہ یہ ہے کہ انسان نہ صرف یہ کہ نماز پڑھے بلکہ نماز میں خشوع اختیار کرے، کیونکہ نماز ایسی چیز ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ۶۲ سے زیادہ مقامات پر اس کا حکم فرمایا، حالانکہ اگر اللہ تعالیٰ ایک مرتبہ حکم دیدیتے تو بھی کافی تھا، کیونکہ اگر ایک مرتبہ بھی قرآن کریم میں کسی کام کا حکم آجائے تو اس کام کو کرنا انسان کے ذمے فرض ہوجاتا ہے، لیکن نماز کے بارے میں باسٹھ مرتبہ حکم دیا کہ نماز قائم کرو۔ اس کے ذریعہ اس حکم کی اہمیت بتانا مقصود ہے کہ نماز کو معمولی کام مت سمجھو اور یہ نہ سمجھو کہ یہ روزمرہ کی ایک معمولی چیز ہے بلکہ مؤمن کے لئے دنیا و آخرت میں کامیابی کے لئے سب سے اہم کام نماز پڑھنا ہے، نماز کی حفاظت کرنا ہے، اور نماز کو اس کے احکام اور آداب کے ساتھ بجالانا ہے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے خلیفہ ہیں، ان کے زمانۂ خلافت میں مسلمانوں کو فتوحات بہت زیادہ ہوئیں، اللہ تعالیٰ نے انہی کے ہاتھوں قیصر و کسریٰ کی شوکت کا پرچم سرنگوں کیا، قیصر و کسریٰ کے محلّات مسلمانوں کے قبضے میں آئے۔ ایک دن میں نے حساب لگایا تو یہ بات سامنے آئی کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زیرِ نگیں ممالک کا کُل رقبہ آج کے ۱۵ ملکوں کے برابر ہے، یعنی آج پندرہ ممالک ان جگہوں پر قائم ہیں جہاں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی حکومت تھی۔ یہ ایسے امیر المؤمنین تھے کہ فرماتے تھے کہ اگر دریائے فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوکا مرجائے تو

مجھے ڈر ہے کہ مجھ سے آخرت میں یہ سوال ہوگا کہ اے عمر! تیری حکومت میں ایک کتا بھوکا مر گیا تھا۔[1] اتنی زیادہ ذمہ داری کا احساس کرنے والے تھے۔ ان کے زمانے میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو خوش حالی بھی عطا فرمائی، کوئی شخص ان کی حکومت میں بھوکا نہیں تھا، سب کو انصاف مہیا تھا، عدل وانصاف کا دور دورہ تھا، مسلمانوں کے ساتھ، غیر مسلموں کے ساتھ، مردوں کے ساتھ، عورتوں کے ساتھ، بوڑھوں کے ساتھ، بچوں کے ساتھ انصاف کا عظیم نمونہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی حکومت نے پیش کیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا سرکاری فرمان

اتنی بڑی حکومت کے جتنے فرمان رواں تھے اور مختلف صوبوں میں جتنے گورنر مقرر تھے اور مختلف شہروں میں جو حاکم مقرر تھے، ان سب کے نام حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک سرکاری فرمان بھیجا، یہ فرمان حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''مؤطا'' میں لفظ بہ لفظ روایت کیا ہے، اس فرمان میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"إِنَّ أَهَمَّ أَمْرِكُمْ عِنْدِي الصَّلَاةُ فَمَنْ حَفِظَهَا وَحَافَظَ عَلَيْهَا حَفِظَ دِينَهُ وَمَنْ ضَيَّعَهَا فَهُوَ لِمَا سِوَاهَا أَضْيَعُ"(۲)

میرے نزدیک تمہارے کاموں میں سب سے اہم کام نماز ہے، جس شخص نے نماز کی حفاظت کی اور اس پر مداومت کی، اس نے اپنے دین کی حفاظت کی، اور جس شخص نے نماز کو ضائع کیا، وہ اور چیزوں کو زیادہ ضائع کرے گا۔ ضائع کرنے کے معنی یہ بھی ہیں کہ وہ نماز نہیں پڑھے گا، اور یہ معنی بھی ہیں کہ نماز پڑھے گا لیکن غلط طریقے سے پڑھے گا، اور ضائع کرنے کے معنی یہ بھی ہیں کہ نماز پڑھنے میں لاپرواہی سے کام لے گا۔

نماز کو ضائع کرنے سے دوسرے امور کا ضیاع

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے حکام کو یہ فرمان اس لئے لکھ کر بھیجا کہ عام طور پر حاکم کے دل میں یہ بات ہوتی ہے کہ میرے سر پر تو قوم کی بہت بڑی ذمہ داریاں ہیں، لہٰذا اگر میں ان ذمہ داریوں کی خاطر کسی وقت کی نماز قربان بھی کردوں تو کوئی حرج نہ ہوگا، کیونکہ میں بڑے فریضے کو ادا

---

(۱) مصنف ابن أبي شيبة، رقم: ۳۵۶۲۷، طبقات ابن سعد (۲۸۴/۳)، تاريخ دمشق (۲۱۵/۳۵)، تاريخ عمر بن الخطاب لابن الجوزي، ص: ۱۴۰۔ مذکورہ مراجع میں ذکر کردہ روایات میں شاۃ، جدی، سخلۃ اور جمل وغیرہ کا ذکر ہے۔ بندہ کو ایسی روایت نہیں ملی جس میں کلب کا ذکر ہو۔

(۲) مؤطا امام مالك، كتاب وقوت الصلاة، باب وقوت الصلاة، رقم: ۵

کر رہا ہوں، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ حاکموں کی اس غلط فہمی کو دور فرما رہے ہیں کہ تم یہ مت سمجھنا کہ حاکم بننے کے بعد تمہاری ذمہ داریاں نماز سے زیادہ فوقیت رکھتی ہیں، بلکہ میرے نزدیک سب سے اہم کام یہ ہے کہ تمہاری نماز صحیح ہونی چاہئے۔ اگر نماز کی حفاظت کرو گے تو اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں رہو گے اور اگر تم نے نماز کو ضائع کر دیا تو تمہارے دوسرے کام اس سے زیادہ ضائع ہوں گے اور پھر حکومت کا کام تم سے ٹھیک نہیں چلے گا کیونکہ جب تم نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو توڑ دیا اور اللہ تعالیٰ کی توفیق تمہارے شاملِ حال نہ رہی تو پھر تمہارے کام کیسے درست ہوں گے۔

ایک گمراہانہ فکر

آج کل ہمارے معاشرے میں ایک گمراہی پھیل گئی ہے، وہ یہ ہے کہ لوگوں کے دماغ میں یہ بات آگئی ہے کہ بہت سے کام ایسے ہیں جو نماز سے زیادہ فوقیت رکھتے ہیں۔ خاص طور پر یہ بات ان لوگوں کے اندر پیدا ہوگئی ہے جو دین کے کام میں مشغول ہیں، دعوت وتبلیغ کا کام کر رہے ہیں، جہاد کا کام کر رہے ہیں، سیاست کا کام کر رہے ہیں، یہ حضرات سمجھتے ہیں کہ ہم بہت بڑا کام کر رہے ہیں، لہٰذا چونکہ ہم بڑا کام کر رہے ہیں، اس لئے اگر کبھی اس بڑے کام کی خاطر نماز چھوٹ گئی یا نماز میں کمی آگئی یا نماز میں کوئی نقص واقع ہوگیا تو کوئی حرج کی بات نہیں، کیونکہ ہم اس سے بڑے کام میں لگے ہوئے ہیں، ہم دعوت وتبلیغ کے کام میں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے کام میں لگے ہوئے ہیں، جہاد کے کام میں لگے ہوئے ہیں اور سیاست کے کام یعنی دین کو اس دنیا میں برپا کرنے اور اقامتِ دین کے کام میں لگے ہوئے ہیں، اس لئے اگر ہماری جماعت چھوٹ جائے گی تو ہم گھر میں نماز پڑھ لیں گے اور اگر نماز کا وقت نکل گیا تو قضا پڑھ لیں گے۔ یاد رکھئے! یہ بڑی گمراہانہ فکر ہے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور گمراہی کا علاج

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے زیادہ دین کا کام کرنے والا کون ہوگا؟ ان سے بڑا سیاست کا علم بردار کون ہوگا؟ ان سے بڑا جہاد کرنے والا کون ہوگا؟ ان سے بڑا داعی اور ان سے بڑا مبلغ کون ہوگا؟ لیکن وہ اپنے تمام فرمانرواؤں کو باقاعدہ یہ سرکاری فرمان جاری کر رہے ہیں کہ میرے نزدیک تمہارے سب کاموں میں سب سے اہم چیز نماز ہے، اگر تم نے اس کی حفاظت کی تو تمہارے اور کام بھی درست ہوں گے اور اگر اس کو ضائع کر دیا تو تمہارے اور کام بھی خراب ہوں گے۔

اپنے آپ کو کافروں پر قیاس مت کرنا

تم اپنے آپ کو کافروں پر قیاس مت کرنا، غیر مسلموں پر قیاس مت کرنا اور یہ مت سوچنا کہ غیر مسلم بھی تو نماز نہیں پڑھ رہے ہیں مگر ترقی کر رہے ہیں، دنیا میں ان کا ڈنکا بج رہا ہے، خوشحالی ان کا مقدر بنی ہوئی ہے اور دنیا کے اندر ان کی ترقی کے ترانے پڑھے جا رہے ہیں۔ یاد رکھو! تم اپنے آپ کو ان پر قیاس مت کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے مؤمن کا مزاج اور مؤمن کا طریقۂ زندگی کافر کے مقابلے میں بالکل مختلف قرار دیا ہے، قرآن کریم کا کہنا یہ ہے کہ مؤمن کو فلاح نہیں ہوسکتی جب تک وہ ان کاموں پر عمل نہ کرے جو یہاں بیان کیے گئے ہیں، ان میں سے سب سے پہلا کام نماز ہے۔

نماز میں خشوع مطلوب ہے

لہٰذا اگر تم فلاح چاہتے ہو تو اس کی پہلی شرط نماز کی حفاظت ہے۔ پھر یہاں پر یہ نہیں فرمایا کہ وہ لوگ فلاح پائیں گے جو نماز پڑھتے ہیں بلکہ یہ فرمایا کہ وہ مؤمن فلاح پائیں گے جو اپنی نماز میں ''خشوع'' اختیار کرنے والے ہیں۔ خشوع کا کیا مطلب ہے؟ اس کو اچھی طرح سمجھ لیجئے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہم سب کو ''خشوع'' عطا فرمادے۔

''خضوع'' کے معنی

دیکھئے! دو لفظ ہیں جو عام طور پر ایک ساتھ بولے جاتے ہیں، ایک ''خشوع'' دوسرا ''خضوع''، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ فلاں نے بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ نماز پڑھی۔ خشوع ''ش'' سے ہے اور خضوع ''ض'' سے ہے، دونوں کے معنی میں تھوڑا سا فرق ہے۔ خضوع کے معنی ہیں ''جسم کو اللہ تعالیٰ کے آگے جھکا دینا'' یعنی جب نماز میں کھڑے ہوئے تو جسم کو اللہ جل شانہ کے آگے جھکا دیا۔ جسم کو جھکا دینے کا مطلب یہ ہے کہ جب نماز میں کھڑے ہوئے تو تمام آداب کا لحاظ رکھتے ہوئے کھڑے ہوئے، رکوع کیا تو اس کے آداب کے ساتھ رکوع کیا، سجدہ کیا تو اس کے آداب کے ساتھ سجدہ کیا، گویا کہ ''اپنے ظاہری اعضاء کو اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکا دینا'' یہ معنی ہیں خضوع کے، لہٰذا خضوع کا تقاضا یہ ہے کہ جب آدمی نماز میں کھڑا ہو تو اس کے تمام اعضاء ساکن اور ساکت ہوں اور ان کے اندر حرکت نہ ہو۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ﴾ (۱)

---

(۱) البقرہ:۲۳۸

یعنی نماز میں اللہ تعالیٰ کے لئے کھڑے ہوں تو قانت بن کر کھڑے ہوں۔ قانت کے معنی ہیں سکون کے ساتھ کھڑا ہونا، لہٰذا نماز میں بلاوجہ اپنے جسم کو ہلانا، بلاوجہ بار بار ہاتھ اُٹھا کر اپنے جسم یا سر کو کھجانا، کپڑے درست کرنا، یہ سب باتیں خضوع کے خلاف ہیں۔

نماز میں اعضاء کو حرکت دینا

فقہاء کرام نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص نماز کے ایک رکن مثلاً قیام میں تین مرتبہ بار بار بلا ضرورت اپنے ہاتھ کو حرکت دے کر کوئی کام کرے گا تو اس کی نماز ہی ٹوٹ جائے گی، اور اگر تین مرتبہ سے کم کیا تو نماز نہیں ٹوٹے گی لیکن نماز کی جو شان ہے اور جو سنت طریقہ ہے وہ حاصل نہیں ہوگا، نماز کی برکت حاصل نہیں ہوگی۔ آج کل ہماری نمازوں میں یہ خرابی کثرت سے پائی جاتی ہے کہ جب نماز میں کھڑے ہوتے ہیں تو اپنے جسم کو بلاوجہ حرکت دیتے ہیں، یہ بلاوجہ حرکت دینا خضوع کے خلاف ہے اور سنت کے اور نماز کے آداب کے خلاف ہے۔

شاہی دربار میں حاضری کی کیفیت

جب تم نماز میں کھڑے ہوتے ہو تو اللہ تعالیٰ کے دربار میں کھڑے ہوتے ہو۔ اگر کسی سربراہِ مملکت کا دربار ہو اور اس دربار میں پریڈ ہو رہی ہو تو اس پریڈ میں جو شریک ہوتا ہے وہ پریڈ کے آداب کی پوری پابندی کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے، وہ یہ نہیں کرتا کہ کبھی سر کھجا رہا ہے، کبھی ہاتھ کھجا رہا ہے، کبھی کپڑے درست کر رہا ہے، کیونکہ کسی بادشاہ کے دربار میں یہ حرکتیں نہیں کی جاتیں۔ جب دنیا کے عام بادشاہوں کا یہ حال ہے تو تم تو احکم الحاکمین کے دربار میں کھڑے ہو جو سارے بادشاہوں کا بادشاہ ہے، اس کے دربار میں کھڑے ہو کر ایسی بیجا حرکتیں کرنا بالکل مناسب نہیں ہے بلکہ اس کے دربار کے تمام آداب کا لحاظ کر کے کھڑا ہونا چاہئے۔

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ اور خضوع

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ گرمی کے موسم میں رات کے وقت اپنے گھر کی چھت پر تہجد کی نماز پڑھا کرتے تھے۔ ان کے پڑوسی ان کو دیکھ کر کہا کرتے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے چھت پر کوئی لکڑی کھڑی ہے جس میں کوئی حرکت نہیں ہوتی۔ لہٰذا جب اللہ تعالیٰ کے دربار میں کھڑے ہوں تو قانت بن کر اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر سمجھ کر کھڑے ہوں۔

گردن جھکانا خضوع نہیں

نماز میں کھڑے ہونے کا جو سنت طریقہ ہے، اس کے مطابق کھڑا ہونا ہی خضوع ہے۔ بعض لوگ خضوع پر عمل کرتے ہوئے قیام کی حالت میں بہت جھک جاتے ہیں اور سینہ بھی جھکا لیتے ہیں، یہ طریقہ سنت کے خلاف ہے، سنت طریقہ یہ ہے کہ قیام کی حالت میں آدمی سیدھا کھڑا ہو اور گردن اس حد تک نیچی ہو کہ نگاہ سجدہ کی جگہ پر ہو، اس سے زیادہ گردن کو جھکا لینا کہ تھوڑی سینے سے لگ جائے، یہ سنت کے خلاف ہے۔ اور بلاوجہ نماز کے اندر حرکت کرنا بھی خلافِ سنت ہے، ہاں اگر کبھی بہت زیادہ خارش ہو رہی ہو تو کھجانا جائز ہے، لیکن بلاوجہ حرکت کرنا سنت کے خلاف ہے۔ بہر حال! خضوع کے معنی ہیں ''اپنے جسم کو اللہ تعالیٰ کے لئے جھکا لینا''

خشوع کے معنی

دوسرا لفظ ہے ''خشوع''، اس کے معنی ہیں ''دل کو اللہ تعالیٰ کے لئے جھکا لینا'' یعنی دل کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کر لینا، دونوں کا مجموعہ خشوع و خضوع کہلاتا ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ نماز خشوع و خضوع کے ساتھ پڑھو، یہ دونوں کام ضروری ہیں۔

خضوع کا خلاصہ

آج میں نے مختصراً ''خضوع'' کے بارے میں عرض کر دیا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ نماز میں جو سنت طریقہ ہے، اس کے مطابق اپنے اعضاء کو لے آؤ اور بلاضرورت اعضاء کو حرکت نہ دو۔ اب سوال یہ ہے کہ کس طرح سنت کے مطابق اعضاء کو لائیں، اس کے لئے میرا ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جو ''نمازیں سنت کے مطابق پڑھئے'' کے نام سے شائع ہو گیا ہے، انگریزی میں بھی اس کا ترجمہ ہو گیا ہے، اس رسالے کو سامنے رکھئے اور دیکھئے کہ اپنے اعضاء کو نماز کے اندر رکھنے کے کیا آداب ہیں، اگر اس پر عمل کر لیا جائے تو ان شاء اللہ خضوع حاصل ہو جائے گا۔ (۱)

خشوع کس طرح حاصل ہوگا، اس کے بارے میں انشاء اللہ آئندہ جمعہ میں عرض کروں گا۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

---

(۱) یہ رسالہ ''اسلام اور ہماری زندگی'' کی دوسری جلد میں مع تخریج و تحقیق ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

اسلام کا مطلب کیا؟ ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

اما بعد! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ﴾ (۱)

میرے محترم بزرگو اور دوستو! سب سے پہلے میں آپ حضرات کو اس جذبے پر مبارک باد پیش کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے اپنے اوقات میں سے کچھ وقت دین کی بات سننے کے لئے نکالا، اور اس غرض کے لئے یہاں جمع ہوئے کہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے احکام اور تعلیمات کی کچھ باتیں سنی جائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے اس جذبے کو قبول فرمائے، اور اس کے کہنے والے اور سننے والے سب کو عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ـــــ اس وقت میں نے آپ حضرات کے سامنے قرآن کریم کی ایک آیت تلاوت کی ہے۔ اس آیت کی تھوڑی سی تشریح آپ حضرات کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مؤمنوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی مت کرو اور اس کے پیچھے مت چلو۔

کیا ایمان اور اسلام علیحدہ علیحدہ ہیں؟

یہاں سب سے پہلی بات جو سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان الفاظ سے خطاب کیا کہ ''اے ایمان والو'' یعنی ان لوگوں سے خطاب ہو رہا ہے جو ایمان لا چکے، جو کلمہ طیبہ اور کلمہ شہادت پر اپنے اعتقاد کا اظہار کر چکے اور ''اشہد ان لا الٰہ الا اللہ واشہد ان محمدا رسول اللہ'' کہہ چکے،

☆ اصلاحی خطبات (۹/ ۹۵۔۱۲۳) ۲۲ نومبر ۱۹۹۱ء، بیت المکرم، کراچی

(۱) البقرۃ: ۲۰۸۔ آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ، اور شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو۔ یقین جانو وہ تمہارا کھلا دشمن ہے''

ان سے خطاب کر کے کہا جا رہا ہے کہ اے ایمان والو! اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب ایمان لا چکے تو ایمان لانے کے بعد اسلام میں داخل ہونے کے کیا معنی؟ عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ جب ایک شخص ایمان لے آیا تو وہ اسلام میں بھی داخل ہو گیا، ایمان اور اسلام ایک ہی چیز سمجھی جاتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ اے ایمان والو، اسلام میں داخل ہو جاؤ، جس سے یہ سمجھ میں آ رہا ہے کہ ایمان کچھ اور چیز ہے اور اسلام کچھ اور چیز ہے۔ اور ایمان لانے کے بعد اسلام میں داخل ہونا بھی ضروری ہے۔

''اسلام'' لانے کا مطلب

پہلی بات تو سمجھنے کی یہ ہے کہ اسلام کیا ہے؟ اور ایمان والوں کو اسلام میں داخل ہونے کی جو دعوت دی جا رہی ہے، اس سے کیا مراد ہے اور اسلام کس کو کہتے ہیں؟ ''اسلام'' عربی زبان کا لفظ ہے، اسلام کے معنی ہیں اپنے آپ کو کسی کے آگے جھکا دینا، یعنی کسی بڑی طاقت کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کر دینا اور اپنے آپ کو اس کا تابع بنا لینا کہ جیسا وہ کہے اس کے مطابق انسان کرے، یہ ہیں ''اسلام'' کے معنی۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ صرف زبان سے کلمہ طیبہ پڑھ لینا اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر اور یومِ آخرت پر ایمان لے آنا، یہ باتیں اسلام میں داخل ہونے کے لئے کافی نہیں، بلکہ اسلام میں داخل ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان اپنے پورے وجود کو اللہ تعالیٰ کے حکم اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کے آگے جھکا دے۔ جب تک یہ نہیں ہو گا اس وقت تک انسان صحیح معنی میں اسلام کے اندر داخل نہیں ہو گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور بیٹے کی قربانی

یہی لفظ ''اسلام'' اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی سورۃ صافات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں بھی استعمال فرمایا ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ہوا تھا کہ وہ اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ذبح کر دیں، جس کی یادگار ہم اور آپ ہر سال عید الاضحیٰ کے موقع پر مناتے ہیں۔ بیٹا بھی وہ جو منگوں اور مرادوں سے طلب کیا ہوا تھا، جس کے لئے آپ نے دعائیں کی تھیں کہ یا اللہ! مجھے بیٹا عنایت فرما دیجئے، جب وہ بیٹا ذرا چلنے پھرنے اور آنے جانے کے لائق ہوا اور باپ کا ہاتھ بٹانے کے لائق ہوا تو اس وقت یہ حکم آیا کہ اس کے گلے پر چھری پھیر کر اس کو ختم کر دو۔ اب اگر اس حکم کو عقل کی میزان میں تول کر دیکھا جائے اور اسکی حکمت اور مصلحت پر غور کیا جائے تو کوئی عقلی حکمت، عقلی مصلحت، کوئی عقلی جواز اس بات کا نظر نہیں آئے گا کہ

کوئی باپ اپنے بیٹے کے گلے پر چھری پھیر دے، نہ تو کوئی باپ ایسا کرسکتا ہے اور نہ ہی دنیا کا کوئی انسان اس عمل کو عقل اور انصاف کے مطابق قرار دے سکتا ہے۔

بیٹے کا بھی امتحان ہو گیا

لیکن جب اللہ تعالیٰ کا حکم آگیا کہ اپنے بیٹے کو قربان کر دو تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے فرمایا:

﴿ إِنِّیٓ أَرٰی فِی الْمَنَامِ أَنِّیٓ أَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی ﴾ (۱)

بیٹا! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں۔ بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے؟ مجھے کیا کرنا چاہئے؟ یہ سوال اس لئے نہیں کیا کہ ان کے دل میں اس حکم پر عمل کرنے میں تردّد تھا بلکہ اس لئے سوال کیا کہ بیٹے کا بھی امتحان لیا جائے کہ دیکھیں بیٹا اس کے بارے میں کیا جواب دیتا ہے۔ وہ بیٹا بھی خلیل اللہ کا بیٹا تھا اور جس کی صلب سے نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لانے والے تھے۔ اس بیٹے نے بھی پلٹ کر یہ نہیں کہا کہ ابا جان میں نے کون سا ایسا جرم کیا ہے، کیا خطا مجھ سے سرزد ہوئی ہے، کیا غلطی میں نے کی ہے جس کی پاداش میں مجھے زندگی سے محروم کیا جا رہا ہے اور مجھے قتل کیا جا رہا ہے۔ بلکہ جواب میں بیٹے نے یہ کہا:

﴿ قَالَ یٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیٓ إِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ ﴾ (۲)

ابا جان! جو حکم آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا ہے، اس کو کر گزریئے اور میری فکر نہ کیجئے، اس لئے کہ اس حکم پر عمل کرنے میں مجھے تکلیف پہنچے گی تو ان شاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اللہ تعالیٰ سے یہ نہیں پوچھا کہ اے اللہ! آپ نے جو مجھے میرے چہیتے بیٹے کو قربان کرنے کا حکم دیا ہے اس میں کیا حکمت اور مصلحت ہے؟ بس دونوں نے یہ دیکھا کہ یہ حکم ہمارے خالق اور ہمارے مالک کی طرف سے آیا ہے اسی وقت دونوں باپ اور بیٹا اس حکم کی تعمیل پر تیار ہو گئے۔

چلتی چھری نہ رُک جائے

قرآن کریم نے اس واقعہ کو بڑے پیارے انداز میں ذکر فرمایا ہے، یعنی جب باپ اور بیٹا اس حکم کو پورا کرنے کے لئے تیار ہو گئے اور باپ کے ہاتھ میں چھری ہے اور بیٹا زمین پر لٹا دیا گیا ہے اور قریب ہے کہ وہ چھری گلے پر چل جائے اور بیٹے کا کام تمام کر دے۔ اس واقعہ کو ذکر کرنے کے لئے

(۱) الصافات: ۱۰۲ (۲) الصافات: ۱۰۲

قرآن کریم نے جو الفاظ استعمال فرمائے ہیں وہ یہ ہیں:

﴿ فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِيْنِ ﴾(۱)

یعنی جب باپ اور بیٹے دونوں اسلام لے آئے اور دونوں نے اللہ کے حکم کے آگے اپنے آپ کو جھکا دیا اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا۔ پیشانی کے بل اس لئے لٹایا کہ اگر سیدھا لٹائیں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ بیٹے کی صورت دیکھ کر اور اس صورت پر ظاہر ہونے والے کرب اور تکلیف کے اثرات دیکھ کر چھری چلنے کی رفتار میں کمی آجائے اور کہیں اللہ تعالیٰ کے حکم کو پورا کرنے میں رکاوٹ پیدا ہو جائے، اس لئے اُلٹا لٹایا۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے لفظ "اسلما" استعمال فرمایا، یعنی دونوں اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے جھک گئے۔

اللہ کے حکم کے تابع بن جاؤ

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی اصطلاح میں "اسلام" کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے آپ کو اور اپنے پورے وجود کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے جھکا دے اور جب اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم آجائے تو یہ نہ پوچھے کہ اس میں عقلی حکمت اور مصلحت کیا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا حکم آنے کے بعد اس کی تعمیل کی فکر کرے۔ یہ ہے "اسلام" اور اسی اسلام میں داخل ہونے کے لئے قرآن کریم کی آیت يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً میں حکم دیا گیا ہے، یعنی اے ایمان والو! تم نے کلمہ طیبہ اور کلمہ شہادت تو پڑھ لیا لیکن اب اسلام میں داخل ہونے کی ضرورت ہے، وہ یہ کہ اپنے پورے وجود کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع بنا دو اور جو حکم بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے اس کو قبول کرو اور اس کو تسلیم کرو اور اس پر عمل کرو۔

ورنہ عقل کے غلام بن جاؤ گے

اب سوال یہ ہے کہ اللہ کے حکم کو بے چون و چرا کیوں مان لیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر تم اللہ کے حکم کو اس طرح بے چون و چرا نہیں مانو گے بلکہ اپنی عقل اور سمجھ استعمال کر کے یہ کہو گے کہ یہ حکم تو بے کار اور بے فائدہ ہے یا یہ حکم تو انصاف کے خلاف ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم اپنی عقل کے غلام بن کر رہ جاؤ گے اور اللہ کی غلامی اور بندگی کو چھوڑ کر عقل کی غلامی میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

حصولِ علم کے ذرائع

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں علم حاصل کرنے کے کچھ ذرائع عطا فرمائے ہیں، ان

(۱) الصافات: ۱۰۳

ذرائع کے ذریعہ انسان علم حاصل کرتا ہے۔ مثلاً سب سے پہلا ذریعۂ علم "آنکھ" ہے۔ آنکھ کے ذریعہ چیزوں کو دیکھ کر ان کے بارے میں انسان علم حاصل کرتا ہے۔ دوسرا ذریعۂ علم "زبان" ہے۔ اس زبان کے ذریعہ انسان بہت سی چیزوں کو چکھ کر ان کے بارے میں علم حاصل کرتا ہے۔ تیسرا ذریعۂ علم "کان" ہے۔ اس کان کے ذریعہ بہت سی چیزوں کے بارے میں سن کر انسان علم حاصل کرتا ہے۔ ایک ذریعۂ علم "ہاتھ" ہے۔ اس کے ذریعہ انسان بہت سی چیزوں کو چھو کر علم حاصل کرتا ہے۔ مثلاً یہ سامنے مائیکروفون ہے۔ اب مجھے آنکھ کے ذریعہ دیکھ کر اس کے بارے میں یہ علم حاصل ہوا کہ یہ ایک آلہ ہے اور گول بنا ہوا ہے۔ اور ہاتھ لگانے سے پتہ چلا کہ یہ ٹھوس ہے، اور کان کے ذریعہ مجھے پتہ چلا کہ یہ آلہ میری آواز کو دور تک پہنچا رہا ہے۔ دیکھئے! کچھ علم آنکھ کے ذریعہ دیکھ کر حاصل ہوا، کچھ علم کان کے ذریعہ سن کر حاصل ہوا، اور کچھ علم ہاتھ کے ذریعہ چھو کر حاصل ہوا۔

ان ذرائع کا دائرۂ کار متعین ہے

لیکن اللہ تعالیٰ نے ان ذرائعِ علم کا ایک دائرہ کار مقرر کر دیا ہے۔ اس دائرہ کے اندر وہ ذریعۂ علم کام دے گا۔ اگر اس دائرہ سے باہر اس ذریعہ کو استعمال کرو گے تو وہ ذریعہ کام نہیں دے گا۔ مثلاً آنکھ کا دائرۂ کار یہ مقرر کر دیا ہے کہ وہ دیکھ کر علم عطا کرتی ہے لیکن سن کر علم نہیں دیتی، اس کے اندر سننے کی طاقت موجود نہیں، وہ کام کان کا ہے، اور کان سن سکتا ہے مگر دیکھ نہیں سکتا، زبان چکھ سکتی ہے لیکن اس کے اندر سننے اور دیکھنے کی صلاحیت موجود نہیں۔ اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ میں اپنی آنکھیں تو بند کر لوں اور اپنے کانوں کے ذریعہ یہ دیکھوں کہ میرے سامنے کیا منظر ہے تو وہ احمق اور بیوقوف ہے، اس لئے کہ کان اس کو کوئی منظر نہیں دکھا سکے گا کیونکہ اس نے کان کو اس کے دائرۂ کار سے باہر استعمال کیا، کان دیکھنے کے لئے وضع ہی نہیں کیے گئے ہیں۔ یا اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ میں کان کو تو بند کر لوں اور آنکھ کے ذریعہ یہ سنوں کہ میرے سامنے والا شخص کیا بات کہہ رہا ہے تو وہ شخص بھی بیوقوف ہے، اس لئے کہ یہ سننے کا کام آنکھ انجام نہیں دے سکتی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ آنکھ بیکار ہے، یہ آنکھ بڑی کارآمد ہے، لیکن اس وقت تک کارآمد ہے جب تک اس کو اس کے دائرۂ کار میں اور دیکھنے کے کام میں استعمال کیا جائے، اگر سننے میں استعمال کرو گے تو یہ آنکھ کوئی کام نہیں دے گی۔

ایک اور ذریعۂ علم "عقل"

لیکن ایک مرحلہ ایسا آتا ہے جہاں یہ ظاہری حواسِ خمسہ آنکھ، کان، ناک، زبان اور ہاتھ معلومات فراہم کرنا چھوڑ دیتے ہیں، کام دینا بند کر دیتے ہیں، اس مرحلے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک

اور ذریعۂ علم عطا فرمایا ہے، وہ ہے انسان کی عقل۔ یہ عقل ان چیزوں کا علم انسان کو عطا کرتی ہے جن کا علم آنکھ کے ذریعہ دیکھ کر حاصل نہیں ہوسکتا، مثلاً یہ مائیکروفون ہے، میں نے ہاتھ کے ذریعہ چھوکر اور آنکھ کے ذریعہ دیکھ کر یہ تو پتہ لگالیا کہ یہ ٹھوس ہے، لوہے کا بنا ہوا ہے، لیکن اس کو کس نے بنایا؟ اور کس طرح یہ وجود میں آیا؟ یہ بات نہ آنکھ دیکھ کر بتا سکتی ہے، نہ کان سن کر بتا سکتا ہے، نہ زبان چکھ کر بتا سکتی ہے۔ اس کو معلوم کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہمیں عقل عطا فرمائی ہے، اس عقل کے ذریعہ ہمیں پتہ چلا کہ اتنا خوبصورت اور شاندار بنا ہوا آلہ جو اتنا اہم کام انجام دے رہا ہے کہ ہماری آواز کو دور تک پہنچا رہا ہے، یہ آلہ خود بخود نہیں بن سکتا، ضرور کسی کاریگر نے اس کو بنایا ہے اور ایسے کاریگر نے بنایا ہے جو بڑا ماہر ہے اور اس فن کو جاننے والا ہے۔ لہٰذا جس جگہ پر یہ حواسِ خمسہ اپنا کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں، وہاں اللہ تعالیٰ نے ہمیں علم حاصل کرنے کے لئے عقل کا ذریعہ عطا فرمایا ہے۔

عقل کا دائرۂ کار

لیکن جس طرح آنکھ، کان اور زبان وغیرہ کا کام غیر محدود نہیں تھا بلکہ ایک دائرۂ کار کے اندر اپنا کام کرتے تھے، اس سے باہر یہ اپنا کام کرنا چھوڑ دیتے تھے، اسی طرح عقل کا کام بھی غیر محدود نہیں بلکہ اس کا بھی ایک دائرۂ کار ہے، اس دائرۂ کار سے باہر نکل کر وہ بھی انسان کی رہنمائی نہیں کرتی، ایک مرحلہ ایسا آتا ہے جہاں پر عقل بھی خاموش ہو جاتی ہے، جواب دے جاتی ہے اور انسان کی صحیح رہنمائی نہیں کرسکتی۔

ایک اور ذریعۂ علم ”وحی الٰہی“

اور جس جگہ پر عقل انسان کی صحیح رہنمائی کرنے سے عاجز ہو جاتی ہے، وہاں پر انسان کی رہنمائی کے لئے اللہ تعالیٰ نے تیسرا ذریعۂ علم عطا فرمایا ہے، اس تیسرے ذریعۂ علم کا نام ہے ”وحی الٰہی“ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ”وحی“ جو انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوتی ہے۔ یہ ”وحی“ اسی جگہ پر انسان کی رہنمائی کرتی ہے جس جگہ پر انسان کی تنہا عقل کافی نہیں ہوتی۔ لہٰذا جن باتوں کا ادراک عقل کے ذریعہ ممکن نہیں تھا، ان باتوں کو بتانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی، اس وحی کے ذریعہ ہمیں بتایا کہ یہ کام اس طرح ہے۔

عقل اور ”وحی الٰہی“ ــــ ایک موازنہ

مثلاً یہ بات کہ اس کائنات کے ختم ہونے کے بعد اور انسان کے مرنے کے بعد ایک زندگی

اور آنے والی ہے، جس میں انسان کو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے اور اس کو وہاں پر اپنے تمام اعمال کا جواب دینا ہے، اور وہاں پر ایک عالم جنت ہے اور ایک عالم جہنم ہے، یہ ساری باتیں ایسی ہیں کہ اگر ان کے بارے میں وحی نازل نہ ہوتی، اور وحی کے ذریعہ انبیاء علیہم السلام کو نہ بتایا جاتا تو محض عقل کی بنیاد پر ہم اور آپ یہ پتہ نہیں لگا سکتے تھے کہ مرنے کے بعد کیسی زندگی آنے والی ہے اور اس میں کیسے حالات پیش آنے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سامنے کس طرح جواب دینا ہے۔ اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک تیسرا ذریعہ علم ہمیں عطا فرمایا، جس کا نام ''وحی الٰہی'' ہے۔

وحی الٰہی کو عقل سے مت تولو

یہ ''وحی الٰہی'' آتی ہی اس جگہ پر ہے جہاں عقل کام نہیں دے سکتی تھی اور انسان کی رہنمائی نہیں کر سکتی تھی، اس وجہ سے اس جگہ پر ''وحی الٰہی'' ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں وحی الٰہی کی بات اس وقت تک نہیں مانوں گا جب تک وہ بات میری عقل میں نہ آجائے، وہ شخص ایسا ہی بیوقوف ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ میں یہ بات اس وقت تک تسلیم نہیں کروں گا جب تک مجھے اپنے کان سے یہ چیز نظر نہ آنے لگے۔ ایسا شخص بیوقوف ہے، اس لئے کہ کان دیکھنے کے لئے بنایا ہی نہیں گیا۔ اسی طرح وہ شخص بھی بیوقوف ہے جو یہ کہے کہ میں وحی الٰہی کی بات اس وقت تک تسلیم نہیں کروں گا جب تک میری عقل نہ مان لے۔ اس لئے کہ وحی الٰہی تو آتی ہی اس جگہ پر ہے جہاں عقل کی پرواز ختم ہو جاتی ہے، جیسے میں نے آپ کو جنت اور جہنم کی مثال دی۔ اب لوگ یہ کہتے ہیں کہ جنت اور جہنم کی بات ہماری عقل میں نہیں آتی۔ حالانکہ یہ چیزیں عقل کے اندر کیسے آسکتی ہیں؟ اس لئے کہ یہ چیزیں عقل کی محدود پرواز اور محدود دائرے سے باہر ہیں، اسی وجہ سے ان کو بیان کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام پر وحی نازل فرمائی۔

اچھائی اور بُرائی کا فیصلہ ''وحی'' کرے گی

اسی طرح یہ بات کہ کونسی چیز اچھی ہے اور کون سی چیز بُری ہے؟ کیا کام اچھا ہے اور کیا کام بُرا ہے؟ کیا چیز حلال ہے اور کیا چیز حرام ہے؟ کون سا کام جائز ہے اور کون سا کام ناجائز ہے؟ یہ کام اللہ تعالیٰ کو پسند اور یہ کام اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے، یہ فیصلہ وحی پر چھوڑا گیا، محض انسان کی عقل پر نہیں چھوڑا گیا، اس لئے کہ تنہا انسان کی عقل یہ فیصلہ نہیں کر سکتی تھی کہ کون سا کام اچھا ہے اور کون سا کام بُرا ہے، کون سا حلال ہے اور کون سا حرام ہے۔

انسانی عقل بعض اوقات غلط رہنمائی کرتی ہے

اس دنیا کے اندر جتنی بڑی سے بڑی بُرائیاں پھیلی ہیں اور غلط سے غلط نظریات اس دنیا کے اندر آئے وہ سب عقل کی بنیاد پر آئے۔ مثلاً ہم اور آپ بحیثیت مسلمان کے یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ سور کا گوشت حرام ہے۔ اگر اس کے بارے میں وحی کی رہنمائی سے ہٹ کر صرف عقل کی بنیاد پر سوچیں گے تو عقل غلط رہنمائی کرے گی، جیسا کہ غیر مسلموں نے صرف عقل کی بنیاد پر یہ کہہ دیا کہ ہمیں تو سور کا گوشت کھانے میں بڑا مزہ آتا ہے، اس کے کھانے میں کیا حرج ہے؟ اس میں کیا عقلی خرابی ہے؟ اسی طرح ہم اور آپ کہتے ہیں کہ شراب پینا حرام ہے، شراب بری چیز ہے، لیکن جو شخص وحی الٰہی پر ایمان نہیں رکھتا، وہ یہ کہے گا کہ شراب پینے میں کیا قباحت ہے؟ کیا برائی ہے؟ ہمیں تو اس میں کوئی برائی نظر نہیں آتی، لاکھوں افراد شراب پی رہے ہیں، ان کو اس کے پینے سے کوئی خاص نقصان نہیں ہو رہا ہے، اور ہماری عقل میں تو اس کے بارے میں کوئی خرابی سمجھ میں نہیں آتی۔ حتیٰ کہ بعض لوگوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ مرد و عورت کے درمیان بدکاری میں کیا حرج ہے؟ اگر ایک مرد اور ایک عورت اس کام پر رضامند ہیں تو اس کام میں عقلی خرابی کیا ہے؟ اور عقلی اعتبار سے ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ برا کام ہے؟ اور اگر رضامندی کے ساتھ مرد و عورت نے یہ کام کرلیا تو تیسرے آدمی کو کیا اختیار ہے کہ اس کے اندر رُکاوٹ ڈالے؟ دیکھئے! اسی عقل کے بل بوتے پر بد سے بدتر برائی کو جائز اور صحیح قرار دیا گیا، اس لئے کہ جب عقل کو اس کے دائرۂ کار سے آگے بڑھایا تو یہ عقل اپنا جواب غلط دینے لگی۔ لہٰذا جب انسان عقل کو اس جگہ پر استعمال کرے گا جہاں پر اللہ تعالیٰ کی وحی آچکی ہے تو وہاں پر عقل غلط جواب دینے لگے گی اور غلط راستے پر لے جائے گی۔

اشتراکیت کی بنیاد عقل پر تھی

دیکھئے روس کے اندر چوہتر سال تک اس عقل کی بنیاد پر اشتراکیت، سوشلزم اور کمیونزم کا بازار گرم رہا، اور پوری دنیا میں مساوات اور غریبوں کی ہمدردی کے نام پر شور مچایا گیا، کمیونزم اور اشتراکیت کا پوری دنیا میں ڈنکا بجتا رہا، اور یہ کہہ دیا کہ عنقریب ساری دنیا پر اس کی حکومت قائم ہو جائے گی، اور یہ سب کچھ عقل کی بنیاد پر تھا۔ اگر اس وقت کوئی اُٹھ کر اس کے خلاف کوئی آواز نکالتا کہ یہ نظریہ غلط ہے، تو اس کو سرمایہ داروں کا ایجنٹ کہا جاتا، جاگیرداروں کا ایجنٹ کہا جاتا، اس کو رجعت پسند کہا جاتا تھا۔ لیکن آج چوہتر سال کے بعد ساری دنیا اس کا تماشا دیکھ رہی ہے، لینن جس کی پوجا کی جارہی تھی، اس کے بت خود اس کے ماننے والے گرا کر توڑ رہے ہیں۔ جو نظریہ وحی الٰہی سے آزاد ہو کر صرف عقل

کی بنیاد پر قائم کیا جاتا ہے، اس کا یہی انجام ہوتا ہے۔

وحی الٰہی کے آگے سر تسلیم خم کرلو

اس لئے اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ اگر زندگی ٹھیک گزارنی ہے تو اس کا راستہ صرف یہ ہے کہ جہاں اللہ کا اور اللہ کے رسول ﷺ کا حکم آجائے اور وحی الٰہی کا پیغام آجائے وہاں انسان اپنے آپ کو اس کے تابع بنالے، اس کے آگے جھک جائے، اور اس کے خلاف عقل کے گھوڑے نہ دوڑائے، چاہے بظاہر وہ عقل کے خلاف اور اپنی خواہشات کے خلاف اور مصلحت کے خلاف نظر آتا ہو۔ بس اللہ تعالیٰ کا حکم آجانے کے بعد اپنا سر اس کے آگے جھکادے۔ یہ ہے اسلام میں داخل ہونے کا مطلب۔ لہٰذا جو آیت میں نے تلاوت کی، اس کے پہلے جملے کا مطلب یہ ہوا کہ اے ایمان والو! اسلام میں داخل ہوجاؤ، یعنی اپنے آپ کو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے حکم کے مکمل تابع کردو۔

پورے داخل ہونے کا مطلب

اس آیت کے دوسرے جملے میں ارشاد فرمایا کہ "پورے کے پورے داخل ہوجاؤ" یعنی یہ نہ ہو کہ ایمان اور عقیدے اور عبادات کی حد تک تو اسلام میں داخل ہوگئے کہ کلمہ طیبہ پڑھ لیا، نماز پڑھ لی، روزہ رکھ لیا، زکوٰۃ دے دی، حج کرلیا، عبادتیں انجام دے دیں، اور جب مسجد میں پہنچے تو مسلمان، لیکن جب بازار پہنچے، جب دفتر پہنچے، یا گھر پہنچے تو وہاں مسلمان نہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "اسلام" محض عبادتوں کا نام نہیں کہ صرف عبادتیں انجام دے دیں تو مسلمان ہوگیا، بلکہ اپنی پوری زندگی کو اللہ کے حکم کے تابع بنانے کا نام "اسلام" ہے۔ لہٰذا مسلمان وہ ہے جو بازار میں بھی مسلمان ہو، دفتر میں بھی مسلمان ہو، گھر میں بیوی بچوں کے ساتھ بھی مسلمان ہو، دوست واحباب کے ساتھ بھی مسلمان ہو۔

اسلام کے پانچ حصے

اس "دینِ اسلام" کے اللہ تعالیٰ نے پانچ حصے بنائے ہیں، ان پانچ حصوں پر دین مشتمل ہے:

(۱) عقائد: یعنی عقیدہ درست ہونا چاہئے۔

(۲) عبادات: یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کی پابندی ہونی چاہئے۔

(۳) معاملات: یعنی خرید وفروخت کے معاملات اور بیع وشراء کے معاملات اللہ کے حکم کے مطابق ہوں، ناجائز اور حرام طریقے سے پیسے نہ کمائے۔

(۴) معاشرت: یعنی باہمی میل جول اور ایک دوسرے کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے اور زندگی گزارنے اور

رہن سہن کے طریقے میں اللہ تعالیٰ نے جو احکام دیے ہیں ان احکام کو انسان پورا کرے۔

(۵) اخلاق: یعنی اس کے باطنی اخلاق، جذبات اور خیالات درست ہوں۔

آج ہم مسجد میں مسلمان ہیں، لیکن جب بازار پہنچے تو لوگوں کو دھوکہ دے رہے ہیں، امانت میں خیانت کر رہے ہیں، دوسروں کو تکلیف پہنچا رہے ہیں، ان کی دل آزاری کر رہے ہیں۔ یہ تو اسلام میں پورا داخل ہونا نہ ہوا، اس لئے کہ اسلام کا ایک چوتھائی حصہ عبادات ہیں اور تین چوتھائی حصہ حقوق العباد سے متعلق ہے۔ لہٰذا جب تک انسان بندوں کے حقوق کا لحاظ نہیں رکھے گا، پورا اسلام میں داخل نہ ہوگا۔

''اللہ تو دیکھ رہا ہے''

ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سفر پر تھے، زادِ راہ جو ساتھ تھا وہ ختم ہو گیا، آپ نے دیکھا کہ جنگل میں بکریوں کا گلہ چر رہا ہے، اور اہلِ عرب کے اندر یہ رواج تھا کہ لوگ مسافروں کو راستے میں مہمان نوازی کے طور پر مفت دودھ پیش کر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ چرواہے کے پاس گئے اور اس سے جا کر فرمایا کہ میں مسافر ہوں اور کھانے پینے کا سامان ختم ہو گیا ہے، تم ایک بکری کا دودھ نکال کر مجھے دے دو تاکہ میں پی لوں۔ چرواہے نے کہا کہ آپ مسافر ہیں، میں آپ کو دودھ ضرور دے دیتا لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ بکریاں میری نہیں ہیں، ان کا مالک دوسرا شخص ہے، اور ان کے چرانے کی خدمت میرے سپرد ہے۔ اس لئے یہ بکریاں میرے پاس امانت ہیں، اور ان کا دودھ بھی امانت ہے، لہٰذا شرعی اعتبار سے میرے لئے ان کا دودھ آپ کو دینا جائز نہیں ہے۔

اس کے بعد حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اس کا امتحان لینا چاہا اور اس سے فرمایا کہ دیکھو بھائی! میں تمہیں ایک فائدے کی بات بتاتا ہوں، جس میں تمہارا بھی فائدہ ہے اور میرا بھی فائدہ ہے، وہ یہ کہ تم ایسا کرو کہ ان میں سے ایک بکری مجھے فروخت کر دو اور اس کی قیمت مجھ سے لے لو، اس میں تمہارا فائدہ یہ ہے کہ تمہیں پیسے مل جائیں گے، اور میرا فائدہ یہ ہوگا کہ مجھے بکری مل جائے گی، راستے میں اس کا دودھ استعمال کرتا رہوں گا۔ رہا مالک! تو مالک سے کہہ دینا کہ ایک بکری بھیڑیا کھا گیا، اور اس کو تمہاری بات پر یقین بھی آ جائے گا، کیونکہ جنگل میں بھیڑیے بکریاں کھاتے رہتے ہیں، اس طرح ہم دونوں کا کام بن جائے گا۔ جب چرواہے نے یہ تدبیر سنی تو فوراً اس نے جواب میں کہا: یا ھذا! فاین اللہ؟ اے بھائی! اگر میں یہ کام کر لوں تو اللہ کہاں گیا؟ یعنی یہ کام میں یہاں تو کر لوں گا، اور مالک کو بھی جواب دیدوں گا، وہ بھی شاید مطمئن ہو جائے گا، لیکن مالک کا بھی ایک اور مالک ہے، اس کے پاس جا کر کیا جواب دوں گا؟ اس لئے میں یہ کام کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ظاہر ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اس کا امتحان لینا چاہتے تھے، جب اس چرواہے کا جواب سنا تو آپ نے فرمایا کہ

جب تک تجھ جیسے انسان اس روئے زمین پر موجود ہیں، اس وقت تک کوئی ظالم دوسرے شخص پر ظلم کرنے پر آمادہ نہیں ہوگا۔ (۱)

اس لئے کہ جب تک دل میں اللہ کا خوف، آخرت کی فکر، اللہ کے سامنے کھڑے ہونے کا احساس موجود رہے گا، اس وقت تک جرائم اور مظالم چل نہیں سکیں گے۔ یہ ہے اسلام میں پورا کا پورا داخل ہونا۔ جنگل کی تنہائی میں بھی اس کو یہ فکر ہے کہ میرا کوئی کام اللہ کی مرضی کے خلاف نہ ہو۔

یہ دین کا لازمی حصہ ہے جس کے بغیر مسلمان مسلمان نہیں ہوسکتا۔ حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا أَمَانَۃَ لَہٗ))

''جس کے دل میں امانت نہیں اس کا ایمان نہیں''(۲)

ایک چرواہے کا عجیب واقعہ

غزوۂ خیبر کے موقع پر ایک چرواہا حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں آیا، وہ یہودیوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا، اس چرواہے نے جب دیکھا کہ خیبر سے باہر مسلمانوں کا لشکر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے تو اس کے دل میں خیال آیا کہ میں جا کر ان سے ملاقات کروں اور دیکھوں کہ یہ مسلمان کیا کہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں؟ چنانچہ بکریاں چراتا ہوا مسلمانوں کے لشکر میں پہنچا اور ان سے پوچھا کہ تمہارے سردار کہاں ہیں؟ صحابہ کرام نے اس کو بتایا کہ ہمارے سردار محمد ﷺ اس خیمے کے اندر ہیں۔ پہلے تو اس چرواہے کو ان کی باتوں پر یقین نہیں آیا، اس نے سوچا کہ اتنے بڑے سردار ایک معمولی سے خیمے میں کیسے بیٹھ سکتے ہیں۔ اس کے ذہن میں یہ تھا کہ جب آپ اتنے بڑے بادشاہ ہیں تو بہت ہی شان و شوکت اور ٹھاٹھ باٹ کے ساتھ رہتے ہوں گے، لیکن وہاں تو کھجور کے پتوں کی چٹائی سے بنا ہوا خیمہ تھا۔ خیر وہ اس خیمے کے اندر آپ سے ملاقات کے لئے داخل ہوگیا اور آپ سے ملاقات کی۔ اور پوچھا کہ آپ کیا پیغام لے کر آئے ہیں؟ اور کس بات کی دعوت دیتے ہیں؟ حضورِ اقدس ﷺ نے اس کے سامنے اسلام اور ایمان کی دعوت رکھی اور اسلام کا پیغام دیا۔ اس نے پوچھا کہ اگر میں اسلام کی دعوت قبول کرلوں تو میرا کیا انجام ہوگا؟ اور کیا رتبہ ہوگا؟ حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

''اسلام لانے کے بعد تم ہمارے بھائی بن جاؤ گے اور ہم تمہیں گلے سے لگائیں گے''

اس چرواہے نے کہا کہ آپ مجھ سے مذاق کرتے ہیں، میں کہاں اور آپ کہاں! میں ایک

---

(۱) أسد الغابة في معرفة الصحابة (۲۲۸/۳)

(۲) مسند أحمد بن حنبل، مسند انس بن مالك، رقم: ۱۱۹۳۵

معمولی سا چرواہا ہوں، اور میں ایک سیاہ فام انسان ہوں، میرے بدن سے بدبو آرہی ہے، ایسی حالت میں آپ مجھے کیسے گلے سے لگائیں گے؟ حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

"ہم تمہیں ضرور گلے سے لگائیں گے، اور تمہارے جسم کی سیاہی کو اللہ تعالیٰ تابانی سے بدل دیں گے، اور اللہ تعالیٰ تمہارے جسم سے اُٹھنے والی بدبو کو خوشبو سے تبدیل کردیں گے"

یہ باتیں سن کر وہ فوراً مسلمان ہوگیا، اور کلمہ شہادت "اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمدا رسول الله" پڑھ لیا۔ پھر حضور ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! اب میں کیا کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

"تم ایسے وقت میں اسلام لائے ہو کہ نہ تو اس وقت کسی نماز کا وقت ہے کہ تم سے نماز پڑھواؤں، اور نہ ہی روزہ کا زمانہ ہے کہ تم سے روزے رکھواؤں، اور زکوٰۃ تم پر فرض نہیں ہے، اس وقت تو صرف ایک ہی عبادت ہورہی ہے جو تلوار کی چھاؤں میں انجام دی جاتی ہے، وہ ہے جہاد فی سبیل اللہ"

اس چرواہے نے کہا کہ یا رسول اللہ! میں اس جہاد میں شامل ہوجاتا ہوں، لیکن جو شخص جہاد میں شامل ہوتا ہے، اس کے لئے دو میں ایک صورت ہوتی ہے، یا غازی یا شہید۔ تو اگر میں اس جہاد میں شہید ہوجاؤں تو آپ میری کوئی ضمانت لیجئے۔ حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

"میں اس بات کی ضمانت لیتا ہوں کہ اگر تم اس جہاد میں شہید ہوگئے تو اللہ تعالیٰ تمہیں جنت میں پہنچادیں گے، اور تمہارے جسم کی بدبو کو خوشبو سے تبدیل فرمادیں گے، اور تمہارے چہرے کی سیاہی کو سفیدی میں تبدیل فرمادیں گے۔"

چونکہ وہ چرواہا یہودیوں کی بکریاں چراتا ہوا وہاں پہنچا تھا، اس لئے حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

"تم یہودیوں کی جو بکریاں لے کر آئے ہو، ان کو جاکر واپس کرو، اس لئے کہ یہ بکریاں تمہارے پاس امانت ہیں۔"(۱)

اس سے اندازہ لگائیں کہ جن لوگوں کے ساتھ جنگ ہورہی ہے، جن کا محاصرہ کیا ہوا ہے، ان کا مال مالِ غنیمت ہے، لیکن چونکہ وہ چرواہا بکریاں معاہدے پر لے کر آیا تھا، اس لئے آپ نے حکم دیا کہ پہلے وہ بکریاں واپس کرکے آؤ، پھر آکر جہاد میں شامل ہونا۔ چنانچہ اس چرواہے نے جاکر بکریاں واپس کیں، اور واپس آکر جہاد میں شامل ہوا، اور شہید ہوگیا ——— اس کا نام ہے "اسلام"

(۱) البداية والنهاية (٤/٦٠٩)

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے راز دار ہیں۔ جب یہ اور ان کے والد حضرت یمان رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تو مسلمان ہونے کے بعد حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ طیبہ آرہے تھے، راستے میں ان کی ملاقات ابوجہل اور اس کے لشکر سے ہوگئی، اس وقت ابوجہل اپنے لشکر کے ساتھ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑنے کے لئے جارہا تھا۔ جب حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی ملاقات ابوجہل سے ہوئی تو اس نے انہیں پکڑلیا، اور پوچھا کہ کہاں جارہے ہو؟ انہوں نے بتایا کہ ہم حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ جارہے ہیں۔ ابوجہل نے کہا کہ پھر تو ہم تمہیں نہیں چھوڑیں گے، اس لئے کہ تم مدینہ جاکر ہمارے خلاف جنگ میں حصہ لوگے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا مقصد تو صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات اور زیارت ہے، ہم جنگ میں حصہ نہیں لیں گے۔ ابوجہل نے کہا کہ اچھا ہم سے وعدہ کرو کہ وہاں جاکر صرف ملاقات کروگے، لیکن جنگ میں حصہ نہیں لوگے۔ انہوں نے وعدہ کرلیا۔ چنانچہ ابوجہل نے آپ کو چھوڑ دیا۔ آپ جب مدینہ منورہ پہنچے تو اس وقت حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کرام کے ساتھ غزوۂ بدر کے لئے مدینہ منورہ سے روانہ ہوچکے تھے، لہٰذا ان کی راستے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوگئی۔

حق و باطل کا پہلا معرکہ ''غزوۂ بدر''

اب اندازہ لگایئے کہ اسلام کا پہلا حق و باطل کا معرکہ (غزوۂ بدر) ہورہا ہے۔ اور یہ وہ معرکہ ہے جس کو قرآن کریم نے ''یوم الفرقان'' فرمایا، یعنی حق و باطل کے درمیان فیصلہ کردینے والا معرکہ، یہ وہ معرکہ ہورہا ہے جس میں جو شخص شامل ہوگیا وہ ''بدری'' کہلایا، اور صحابہ کرام میں ''بدری'' صحابہ کا بہت اُونچا مقام ہے۔ اور ''اسماءِ بدریین'' بطور وظیفے کے پڑھے جاتے ہیں۔ ان کے نام پڑھنے سے اللہ تعالیٰ دعائیں قبول فرماتے ہیں۔ وہ ''بدریین'' ہیں جن کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پیشین گوئی فرمادی کہ اللہ تعالیٰ نے سارے اہل بدر (جنہوں نے بدر کی لڑائی میں حصہ لیا) بخشش فرمادی ہے، ایسا معرکہ ہونے والا ہے۔

گردن پر تلوار رکھ کرلیا جانے والا وعدہ

بہرحال، جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوئی تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے سارا قصہ سنادیا کہ اس طرح راستے میں ہمیں ابوجہل نے پکڑلیا تھا، اور ہم نے یہ وعدہ کرکے بمشکل جان چھڑائی کہ ہم

لڑائی میں حصہ نہیں لیں گے۔ اور پھر درخواست کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! یہ بدر کا معرکہ ہونے والا ہے، آپ اس میں تشریف لے جا رہے ہیں، ہماری بڑی خواہش ہے کہ ہم بھی اس میں شریک ہو جائیں، اور جہاں تک اس وعدہ کا تعلق ہے، وہ تو انہوں نے ہماری گردن پر تلوار رکھ کر ہم سے یہ وعدہ لیا تھا کہ ہم جنگ میں حصہ نہیں لیں گے، اگر ہم وعدہ نہ کرتے تو وہ ہمیں نہ چھوڑتے، اس لئے ہم نے وعدہ کر لیا، لہٰذا آپ ہمیں اجازت دے دیں کہ ہم اس جنگ میں حصہ لے لیں، اور یہ فضیلت اور سعادت ہمیں حاصل ہو جائے۔(۱)

پیغمبرِ عالم اور ایفائے عہد

لیکن سرکارِ دو عالم ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ نہیں، تم وعدہ کر کے آئے ہو اور زبان دے کر آئے ہو، اور اسی شرط پر تمہیں رہا کیا گیا ہے کہ تم وہاں جا کر محمد رسول اللہ ﷺ کی زیارت کرو گے، لیکن ان کے ساتھ جنگ میں حصہ نہیں لو گے، اس لئے میں تم کو جنگ میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دیتا۔

یہ وہ مواقع ہیں جہاں انسان کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ اپنی زبان اور اپنے وعدے کا کتنا پاس کرتا ہے۔ اگر ہم جیسا آدمی ہوتا تو ہزار تاویلیں کر لیتا، مثلاً یہ تاویل کر لیتا کہ ان کے ساتھ جو وعدہ کیا تھا، وہ سچے دل سے تو نہیں کیا تھا، وہ تو ہم سے زبردستی لیا گیا تھا۔ اور خدا جانے کیا کیا تاویلیں ہمارے ذہنوں میں آجاتیں۔ یا یہ تاویل کر لیتا کہ یہ حالتِ عذر ہے اس لئے حضورِ اقدس ﷺ کے ساتھ جہاد میں شامل ہونا ہے اور کفر کا مقابلہ کرنا ہے۔ جب کہ وہاں ایک ایک آدمی کی بڑی قیمت ہے، کیونکہ مسلمانوں کے لشکر میں صرف ۳۱۳ نہتے افراد ہیں، جن کے پاس صرف ۷۰ اُونٹ، ۲ گھوڑے اور ۸ تلواریں ہیں۔ باقی افراد میں سے کسی نے لاٹھی اُٹھائی ہے، کسی نے ڈنڈے، اور کسی نے پتھر اُٹھا لئے ہیں۔ یہ لشکر ایک ہزار مسلح سورماؤں کا مقابلہ کرنے کے لئے جا رہا ہے، اس لئے ایک ایک آدمی کی جان قیمتی ہے ــــ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو بات کہہ دی گئی ہے، اور جو وعدہ کر لیا گیا ہے، اس وعدہ کی خلاف ورزی نہیں ہوگی۔ اس کا نام ہے "اسلام"

جہاد کا مقصد حق کی سربلندی

اس لئے کہ یہ جہاد کوئی ملک حاصل کرنے کیلئے نہیں ہو رہا تھا، کوئی اقتدار حاصل کرنے کیلئے نہیں ہو رہا تھا، بلکہ یہ جہاد حق کی سربلندی کے لئے ہو رہا تھا۔ اور حق کو پامال کر کے جہاد کیا جائے، گناہ

(۱) الاصابة (۱/۳۱۶)

کا ارتکاب کر کے اللہ تعالیٰ کے دین کا کام کیا جائے، یہ نہیں ہوسکتا۔ آج ہم لوگوں کی ساری کوششیں بیکار جارہی ہیں، اور ساری کوششیں بے اثر ہورہی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ گناہ کر کے اسلام کی تبلیغ کریں، گناہ کر کے اسلام کو نافذ کریں، ہمارے دل و دماغ پر ہر وقت ہزاروں تاویلیں مسلط رہتی ہیں، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت مصلحت کا یہ تقاضا ہے۔ چلو، شریعت کے اس حکم کو نظر انداز کردو۔ اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت مصلحت اس کام کے کرنے میں ہے، چلو، یہ کام کرلو۔

یہ ہے وعدہ کا ایفاء

لیکن وہاں تو ایک ہی مقصود تھا، یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہونا، نہ مال مقصود ہے، نہ فتح مقصود ہے، نہ بہادر کہلانا مقصود ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے، اور اللہ تعالیٰ کی رضا اس میں ہے کہ جو وعدہ کرلیا گیا ہے، اس کو نبھاؤ۔ چنانچہ حضرت حذیفہ اور ان کے والد حضرت یمان رضی اللہ عنہما دونوں کو غزوۂ بدر جیسی فضیلت سے محروم رکھا گیا، اس لئے کہ یہ دونوں جنگ میں شرکت نہ کرنے پر زبان دے کر آئے تھے۔ یہ ہے "اسلام" جس کے بارے میں فرمایا کہ اس اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ایفائے عہد

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ان صحابہ کرام میں سے ہیں جن کے بارے میں لوگوں نے معلوم نہیں کیا کیا غلط قسم کے پروپیگنڈے کیے ہیں، اللہ تعالیٰ بچائے ـــــ آمین ـــــ لوگ ان کی شان میں گستاخیاں کرتے ہیں۔ ان کا ایک قصہ سن لیجئے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ چونکہ شام میں تھے، اس لئے روم کی حکومت سے ان کی ہر وقت جنگ رہتی تھی، ان کے ساتھ برسرِ پیکار رہتے تھے۔ اور روم اس وقت کی سپر پاور سمجھی جاتی تھی، اور بڑی عظیم الشان عالمی طاقت تھی۔ ایک مرتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کے ساتھ جنگ بندی کا معاہدہ کرلیا، اور ایک تاریخ متعین کرلی کہ اس تاریخ تک ہم ایک دوسرے سے جنگ نہیں کریں گے۔ ابھی جنگ بندی کے معاہدے کی مدت ختم نہیں ہوئی تھی، اس وقت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دل میں خیال آیا کہ جنگ بندی کی مدت تو درست ہے لیکن اس مدت کے اندر اپنی فوجیں رومیوں کی سرحد پر لے جا کر ڈال دوں، تاکہ جس وقت جنگ بندی کی مدت ختم ہو، اس وقت میں فوراً حملہ کردوں، اس لئے کہ دشمن کے ذہن میں تو یہ ہوگا کہ جب جنگ بندی کی مدت ختم ہوگی، پھر کہیں جا کر لشکر روانہ ہوگا، اور یہاں آنے میں وقت لگے گا، اس لئے معاہدہ کی مدت ختم ہوتے ہی فوراً مسلمانوں کا لشکر حملہ آور نہیں ہوگا،

لہٰذا وہ اس حملے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ اس لئے اگر میں اپنا لشکر سرحد پر ڈال دوں اور مدت ختم ہوتے ہی فوراً حملہ کردوں تو جلدی فتح حاصل ہو جائے گی۔

چنانچہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی فوجیں سرحد پر ڈال دیں، اور فوج کا کچھ حصہ سرحد کے اندر ان کے علاقے میں ڈال دیا، اور حملہ کے لئے تیار ہو گئے۔ اور جیسے ہی جنگ بندی کے معاہدے کی آخری تاریخ کا سورج غروب ہوا، فوراً حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے لشکر کو پیش قدمی کا حکم دے دیا، چنانچہ جب لشکر نے پیش قدمی کی تو یہ چال بڑی کامیاب ثابت ہوئی، اس لئے کہ وہ لوگ اس حملے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا لشکر شہر کے شہر، بستیاں کی بستیاں فتح کرتا ہوا چلا جا رہا تھا، اب فتح کے نشے کے اندر پورا لشکر آگے بڑھتا جا رہا تھا کہ اچانک دیکھا کہ پیچھے سے ایک گھڑ سوار دوڑتا چلا آ رہا ہے، اس کو دیکھ کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس کے انتظار میں رک گئے کہ شاید یہ امیر المؤمنین کا کوئی نیا پیغام لے کر آیا ہو، جب وہ گھڑ سوار قریب آیا تو اس نے آوازیں دینا شروع کر دیں:

"اَللّٰہُ اَکْبَرُ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ، قِفُوْا عِبَادَ اللّٰہِ قِفُوْا عِبَادَ اللّٰہِ"

اللہ کے بندو ٹھہر جاؤ، اللہ کے بندو ٹھہر جاؤ، جب وہ اور قریب آیا تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ وہ حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ حضرت معاویہ نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ انہوں نے فرمایا:

"وَفَاءٌ لَا غَدْرٌ، وَفَاءٌ لَا غَدْرٌ"

مؤمن کا شیوہ وفاداری ہے، غداری نہیں ہے، عہد شکنی نہیں ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے تو کوئی عہد شکنی نہیں کی ہے، میں نے تو اس وقت حملہ کیا ہے جب جنگ بندی کی مدت ختم ہو گئی تھی۔ حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگرچہ جنگ بندی کی مدت ختم ہو گئی تھی، لیکن آپ نے اپنی فوجیں جنگ بندی کی مدت کے دوران ہی سرحد پر ڈال دی تھیں، اور فوج کا کچھ حصہ سرحد کے اندر بھی داخل کر دیا تھا، اور یہ جنگ بندی کے معاہدے کی خلاف ورزی تھی۔ اور میں نے اپنے ان کانوں سے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

((مَنْ كَانَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ قَوْمٍ عَهْدٌ فَلَا يَحِلَّنَّهُ وَلَا يَشُدَّنَّهُ إِلَى أَنْ يَّمْضِيَ أَجَلٌ لَهُ أَوْ يَنْبِذَ إِلَيْهِمْ عَلَى سَوَاءٍ)) (۱)

یعنی جب تمہارا کسی قوم کے ساتھ معاہدہ ہو، تو اس وقت تک عہد نہ کھولے اور نہ باندھے جب تک کہ اس کی مدت نہ گزر جائے، یا ان کے سامنے پہلے کھلم کھلا یہ اعلان نہ کر دے کہ ہم نے وہ عہد ختم کر دیا۔ لہٰذا مدت گزرنے سے پہلے یا عہد کے ختم کرنے کا اعلان کیے بغیر ان کے علاقے کے

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب السیر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب ما جاء فی الغدر، رقم: ۱۵۰۶، سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، رقم: ۲۵۷۸، مسند احمد، مسند الشامیین، رقم: ۱۶۴۰

پاس لے جا کر فوجوں کو ڈال دینا حضورِ اقدس ﷺ کے اس ارشاد کے مطابق آپ کے لئے جائز نہیں تھا۔

سارا مفتوحہ علاقہ واپس کر دیا

اب آپ اندازہ لگایئے کہ ایک فاتح لشکر ہے، جو دشمن کا علاقہ فتح کرتا ہوا جا رہا ہے، اور بہت بڑا علاقہ فتح کر چکا ہے، اور فتح کے نشے میں چور ہے۔ لیکن جب حضورِ اقدس ﷺ کا یہ ارشاد کان میں پڑا کہ اپنے عہد کی پابندی مسلمان کے ذمے لازم ہے، اسی وقت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حکم دے دیا کہ جتنا علاقہ فتح کیا ہے، وہ سب واپس کر دو، چنانچہ پورا علاقہ واپس کر دیا اور اپنی سرحد میں دوبارہ واپس آگئے ـــــ پوری دنیا کی تاریخ میں کوئی قوم اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتی کہ اس نے صرف عہد شکنی کی بناء پر اپنا مفتوحہ علاقہ اس طرح واپس کر دیا ہو۔ لیکن یہاں پر چونکہ کوئی زمین کا حصہ پیشِ نظر نہیں تھا، کوئی اقتدار اور سلطنت مقصود نہیں تھی، بلکہ مقصود اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا تھا، اس لئے جب اللہ تعالیٰ کا حکم معلوم ہو گیا کہ وعدہ کی خلاف ورزی درست نہیں ہے، اور چونکہ یہاں وعدہ کی خلاف ورزی کا تھوڑا سا شائبہ پیدا ہو رہا تھا، اس لئے واپس لوٹ گئے ـــــ یہ ہے ''اسلام'' جس کے بارے میں حکم دیا گیا کہ ''اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً'' کہ پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور معاہدہ

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جب بیت المقدس فتح کیا تو اس وقت وہاں پر جو عیسائی اور یہودی تھے، ان سے یہ معاہدہ ہوا کہ ہم تمہاری حفاظت کریں گے، تمہارے جان و مال کی حفاظت کریں گے، اور اس کے معاوضے میں تم ہمیں جزیہ ادا کرو گے'' ''جزیہ'' ایک ٹیکس ہوتا ہے جو غیر مسلموں سے وصول کیا جاتا ہے' چنانچہ جب معاہدہ ہو گیا تو وہ لوگ ہر سال جزیہ ادا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ مسلمانوں کا دوسرے دشمنوں کے ساتھ معرکہ پیش آ گیا، جس کے نتیجے میں وہ فوج جو بیت المقدس میں متعین تھی ان کی ضرورت پیش آئی۔ کسی نے یہ مشورہ دیا کہ اگر فوج کی کمی ہے تو بیت المقدس میں فوجیں بہت زیادہ ہیں، اس لئے وہاں سے ان کو محاذ پر بھیج دیا جائے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ مشورہ اور تجویز بہت اچھی ہے، لہٰذا فوجیں وہاں سے اُٹھا کر محاذ پر بھیج دو، لیکن اس کے ساتھ ایک کام اور بھی کرو، وہ یہ کہ بیت المقدس کے جتنے عیسائی اور یہودی ہیں، ان سب کو ایک جگہ جمع کرو، اور ان سے کہو کہ ہم نے آپ کی جان و مال کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا، اور یہ معاہدہ کیا تھا کہ آپ کے جان و مال کی حفاظت کریں گے، اور اس کام کے لئے ہم نے وہاں فوج

ڈالی ہوئی تھی، لیکن اب ہمیں دوسری جگہ فوج کی ضرورت پیش آگئی ہے، اس لئے ہم آپ کی حفاظت نہیں کر سکتے، لہٰذا اس سال آپ نے ہمیں جو جزیہ بطور ٹیکس ادا کیا ہے، وہ ہم آپ کو واپس کر رہے ہیں، اور اس کے بعد ہم اپنی فوجوں کو یہاں سے لے جائیں گے۔ اور اب آپ لوگ اپنی حفاظت کا انتظام خود کریں۔

یہ ہے "اسلام" یہ نہیں کہ صرف نماز پڑھ لی اور روزہ رکھ لیا اور بس مسلمان ہو گئے، بلکہ جب تک اپنا پورا وجود، اپنی زبان، اپنی آنکھ، اپنے کان، اپنی زندگی کا طرزِ عمل پورا کا پورا اللہ کی مرضی کے مطابق نہیں ہوگا اس وقت تک کامل مسلمان نہیں ہوں گے۔

دوسروں کو تکلیف پہنچانا اسلام کے خلاف ہے

جناب رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمادیا کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں، اور دوسرے مسلمان کو تکلیف پہنچانا گناہِ کبیرہ ہے اور حرام ہے، اور یہ ایسا ہی بڑا گناہ ہے جیسے شراب پینا گناہ ہے۔ جیسے بدکاری کرنا گناہ ہے۔ جیسے سور کھانا گناہ ہے۔ اور تکلیف پہنچانے کے جتنے راستے ہیں، وہ سب گناہِ کبیرہ ہیں۔ مسلمان کا فرض یہ ہے کہ اپنی ذات سے کسی دوسرے کو تکلیف نہ پہنچائے۔ مثلاً آپ گاڑی لے کر جارہے ہیں اور کسی جگہ جا کر گاڑی کھڑی کرنے کی ضرورت پیش آئی تو آپ نے ایسی جگہ جا کر گاڑی کھڑی کر دی جو جگہ دوسرے لوگوں کے لئے گزرنے کی جگہ تھی، آپ کے گاڑی کھڑے کرنے کی وجہ سے دوسرے لوگوں کو گزرنا مشکل ہو گیا، اب آپ تو یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم نے زیادہ سے زیادہ ٹریفک کے قانون کی خلاف ورزی کی ہے، آپ اس کو دین کی خلاف ورزی اور گناہ نہیں سمجھتے، حالانکہ یہ صرف بداخلاقی کی بات نہیں، بلکہ گناہِ کبیرہ ہے۔ یہ ایسا ہی گناہ ہے جیسے شراب پینا گناہ ہے، اس لئے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے فرمادیا کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے یعنی اس کے پورے وجود سے دوسرے انسان محفوظ رہیں، ان کو تکلیف نہ پہنچے۔ (۱)

آپ نے اپنی گاڑی غلط جگہ پارک کر کے دوسروں کو تکلیف پہنچائی۔ آج ہم نے دینِ اسلام کو عبادت کی حد تک اور نماز روزے کی حد تک اور مسجد کی حد تک، اور وظائف اور تسبیحات کی حد تک

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده، رقم: ۹، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب تفاضل الاسلام وأی أموره أفضل، رقم: ۵۸، سنن الترمذی، کتاب الایمان عن رسول الله صلی الله علیه وسلم، باب ما جاء فی أن المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده، رقم: ۲۵۵۱

محدود کرلیا ہے، اور بندوں کے جو حقوق اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں ان کو ہم نے دین سے بالکل خارج کردیا۔

حقیقی مفلس کون؟

حدیث شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا کہ بتاؤ مفلس کون ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! ہم لوگ تو اس شخص کو مفلس سمجھتے ہیں جس کے پاس روپیہ پیسہ نہ ہو۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ حقیقی مفلس وہ نہیں جس کے پاس روپیہ پیسہ نہ ہو، بلکہ حقیقی مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے جب حاضر ہوگا تو اس طرح حاضر ہوگا کہ اس کے اعمال نامے میں بہت سارے روزے ہوں گے، بہت سی نمازیں اور وظیفے ہوں گے، تسبیحات ونوافل کا ڈھیر ہوگا، لیکن دوسری طرف کسی کا مال کھایا ہوگا، کسی کو دھوکہ دیا ہوگا، کسی کی دل آزاری کی ہوگی، کسی کو تکلیف پہنچائی ہوگی، اور اس طرح اس نے بہت سے انسانوں کے حقوق غصب کیے ہوں گے، اب اصحابِ حقوق اللہ تعالیٰ سے فریاد کریں گے کہ یا اللہ! اس شخص نے ہمارا حق غصب کیا تھا، اس سے ہمارا حق دلوایئے۔ اب وہاں پر روپے پیسے تو چلیں گے نہیں کہ ان کو دے کر حساب کتاب برابر کرلیا جائے، وہاں کی کرنسی تو نیکیاں ہیں، چنانچہ صاحبِ حقوق کو اس کی نیکیاں دینی شروع کی جائیں گی، کسی کو نماز دیدی جائے گی، کسی کو روزے دیدیئے جائیں گے، اس طرح ایک ایک صاحبِ حق اس کی نیکیاں لے کر چلتے جائیں گے یہاں تک کہ اس کی ساری نیکیاں ختم ہو جائیں گی اور یہ شخص خالی ہاتھ رہ جائے گا، نماز روزے کے جتنے ڈھیر لایا تھا، وہ سب ختم ہو جائیں گے، لیکن حق والے اب بھی باقی رہ جائیں گے۔ تو اب اللہ تعالیٰ حکم فرمائیں گے کہ اب حق دلوانے کا طریقہ یہ ہے کہ صاحبِ حق کے اعمال میں جو گناہ ہیں وہ اس شخص کے نامۂ اعمال میں ڈال دیئے جائیں۔ چنانچہ وہ شخص نیکیوں کا انبار لے کر آیا تھا، لیکن بعد میں نیکیاں تو ساری ختم ہو جائیں گی، اور دوسرے لوگوں کے گناہوں کے انبار لے کر واپس جائے گا، یہ شخص حقیقی مفلس ہے۔ (۱)

آج ہم پورے اسلام میں داخل نہیں

اس سے اندازہ لگائیں کہ حقوق العباد کا معاملہ کتنا سنگین ہے، لیکن ہم لوگوں نے اس کو دین

(۱) صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب تحریم الظلم، رقم: ٤٦٧٨، سنن الترمذی، کتاب صفة القیامة والرقائق والورع عن رسول اللّٰه، باب ما جاء فی شان الحساب والقصاص، رقم: ٢٣٤٢، مسند احمد، مسند أبی هريرة، رقم: ٧٦٨٦

سے بالکل خارج کردیا ہے۔قرآن کریم تو کہہ رہا ہے کہ اے ایمان والو! اسلام میں داخل ہو جاؤ، آدھے نہیں، بلکہ پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ تمہارا وجود، تمہاری زندگی، تمہاری عبادت، تمہارے معاملات، تمہاری معاشرت، تمہارے اخلاق، ہر چیز اسلام کے اندر داخل ہونی چاہئے، اس کے ذریعہ تم صحیح معنی میں مسلمان بن سکتے ہو۔ یہی وہ چیز تھی جس کے ذریعہ درحقیقت اسلام پھیلا ہے۔ اسلام محض تبلیغ سے نہیں پھیلا، بلکہ انسانوں کی سیرت اور کردار سے پھیلا ہے، مسلمان جہاں بھی گئے انہوں نے اپنی سیرت اور کردار کا لوہا منوایا، اس سے اسلام کی طرف رغبت اور کشش پیدا ہوئی۔ اور آج ہماری سیرت اور کردار دیکھ کر لوگ اسلام سے متنفر ہو رہے ہیں۔

پورے داخل ہونے کا عزم کریں

آج ہم لوگ جو دین کی باتیں سننے کے لئے اس محفل میں جمع ہوئے ہیں، اس سے کچھ فائدہ اُٹھائیں اور وہ فائدہ یہ ہے کہ ہم یہ عزم کریں کہ اپنی زندگی میں اسلام کو داخل کریں گے، زندگی کے ہر شعبے میں اسلام کو داخل کریں گے، عبادات بھی، معاملات بھی، معاشرت بھی، اخلاق بھی، ہر چیز اسلام کے مطابق بنانے کی کوشش کریں گے۔

دین کی معلومات حاصل کریں

ایک گزارش آپ حضرات سے یہ کرتا ہوں کہ چوبیں گھنٹوں میں سے کچھ وقت دین کی معلومات حاصل کرنے کے لئے نکال لیں، مستند کتابیں چھپی ہوئی ہیں، ان کو اپنے گھروں کے اندر پڑھنے کا معمول بنائیں، جس کے ذریعہ دینی تعلیمات سے واقفیت ہو۔ آج مصیبت یہ ہے کہ ہم لوگ دین کی تعلیمات سے واقف نہیں۔ اگر ہم یہ فائدہ حاصل کرسکیں اور اس کے ذریعہ ہمارے دلوں میں دین پر چلنے کا جذبہ پیدا ہو جائے تو یہ انشاء اللہ یہ مجلس مفید ہوگی، ورنہ کہنے سننے کی مجلسیں تو بہت ہوتی رہتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے مجھے بھی اور آپ سب کو بھی ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.



دین کیا ہے؟☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

اَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.
﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ (۱)

جنابِ صدر اور معزز حاضرین!

دین کا مطلب سمجھنے کی ضرورت ہے

''دین کی حقیقت'' کہنے کو اگرچہ چند لفظوں کا مجموعہ ہے لیکن اگر ہم اس کی تشریح کرنا چاہیں تو ایک طویل موضوع بن جائے گا۔ اور وہ اس طرح کہ پھر اس میں دین کے تمام گوشے آ جائیں گے۔ لیکن میں اس وقت ایک بنیادی نکتہ کی طرف آپ حضرات کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ آج کی فضا میں جب دین کا نام لیا جاتا ہے تو عام طور سے اس کو دنیا کا حریف اور مدِمقابل سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح جب کسی طرف سے یہ پکار بلند ہوتی ہے کہ دین کی طرف آؤ تو اس کا مطلب بسا اوقات یہ سمجھا جاتا ہے کہ دنیا کو بالکل چھوڑ دو اور ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ اگر ہم دین کی طرف آگئے تو ہمیں اپنی دنیا کی ضروریات، تقاضے، خواہشات اور دنیا میں رہنے سہنے کے معروف طریقے چھوڑنے پڑیں گے ورنہ ہم دین کی برکات حاصل نہیں کر سکتے۔ گویا دین و دنیا کو اس طرح ایک دوسرے کا حریف سمجھا جاتا ہے کہ دونوں جمع ہی نہیں ہو سکتے۔ اس لئے میں اس محفل میں یہ بات مختصراً عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس دین کی حقیقت کیا ہے؟ اور یہ کس معنی میں دنیا کا مدمقابل ہے اور کس معنی میں دنیا کا مدمقابل نہیں؟

☆ اصلاحی مواعظ (۲/۱۶۳۔۱۷۶)، سٹاف کلب، فوجی فرٹیلائیزر، کراچی۔

(۱) آل عمران: ۱۹

دین کے لئے ہی انسان کو پیدا کیا گیا ہے

بات دراصل یہ ہے کہ جس شخص کو بھی اللہ جل شانہ کی ذات پر ایمان ہے یعنی وہ اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ یہ کائنات کسی بنانے والے نے بنائی ہے، یہ چاند، سورج اور ستارے وجود میں لانے والا اور انسان کو پیدا کرنے والا کوئی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے اس بنانے اور بنا کر بھیجنے کا بھی تو کوئی مقصد ہوگا اور اس مقصد کو حاصل کرنے کا طریقہ بھی ضرور ہوگا۔ کیونکہ ایسا ممکن نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو بغیر کسی مقصد کے پیدا کردے اور انسان کو ہدایت کی روشنی سے محروم کر کے اندھیرے میں چھوڑ دے۔ حاصل یہ کہ جس شخص کو بھی اللہ جل شانہ کے وجود کا یقین ہے اس کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس نے انسان کو ہدایت اور دنیا میں رہنے سہنے کا طریقہ بھی بتایا ہے۔

دنیا میں دو قسم کے معاملات

اس کو دوسرے عنوان سے یوں بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ عالم الغیب بھی ہے اور حکیمِ مطلق بھی، اس لئے وہ جانتا تھا کہ انسان کے اس کائنات میں پہنچنے کے بعد وہ بعض چیزوں کو تو اطمینان سے سمجھ کر کسی بیرونی رہنمائی کے بغیر، ان کا اعتراف کر کے ان پر عمل کر سکے گا، لیکن ساتھ ساتھ اللہ کو یہ بھی معلوم تھا کہ اگر انسان کو کسی بیرونی رہنمائی کے بغیر چھوڑ دیا گیا تو کچھ معاملات ایسے بھی ہیں کہ جس میں انسان کی عقل ٹھوکر کھائے گی، جس کی وجہ سے انسان کے بھٹکنے کا اندیشہ ہو جائے گا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس اندیشے سے بچاؤ کے لئے انسان کو احکامات کا ایک ایسا مجموعہ عطا فرما دیا کہ جس کی وجہ سے انسان اچھے اور برے کی پہچان کر سکے۔

اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہدایت کا خلاصہ

جس جگہ عقل کو کسی بیرونی رہنمائی کی ضرورت نہیں اس کی مثال ایسے ہے کہ اگر ایک طرف گندگی پڑی ہوئی ہو اور دوسری طرف صفائی ستھرائی ہو تو جس انسان کے اندر انسانیت کا ذرا سا بھی شائبہ ہے وہ کبھی بھی گندگی کو پسند نہیں کرے گا بلکہ ہمیشہ صفائی کو پسند کرے گا۔ معلوم ہوا کہ ایسی چیزوں میں احکام کی ضرورت ہی نہیں اس لئے کہ عقل اس بات کا صحیح فیصلہ کر دیتی ہے کہ گندگی کے مقابلے میں صفائی زیادہ پسندیدہ ہے۔

اسی طرح لذیذ اور بدمزہ، میٹھی اور کڑوی چیزوں کے بارے میں کسی بیرونی رہنمائی کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن جن چیزوں میں انسان کی عقل دھوکہ دے سکتی تھی وہاں اللہ تعالیٰ نے

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ذریعے ہدایت کا سامان مہیا کیا اور بتایا کہ یہ چیز اچھی ہے اور یہ بری ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی ہوئی ہدایت کا خلاصہ ہے۔

حقیقی دین کونسا ہے؟

جب گزشتہ کی ہوئی بات سمجھ میں آ گئی تو اب یہ سمجھئے کہ دین کی حقیقت کیا ہے؟ چنانچہ شروع میں تلاوت کردہ آیت میں ارشاد خداوندی ہے:

﴿إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ﴾ (۱)

''بے شک اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین اسلام ہی ہے''

یعنی وہ حقیقی دین جو اللہ نے بندوں کے لئے چنا اور پسند فرمایا ہے وہ اسلام ہے۔ اسلام کے مصداق کے متعلق تو الحمدللہ ہر مسلمان کو علم ہے کہ اس کا مصداق توحید و رسالت، آخرت اور عقائد ہیں۔

اسلام کا معنی کیا ہے؟

لیکن جس چیز کی طرف میں آپ حضرات کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اسلام کا لفظی معنی ہے ''سر جھکا دینا'' اور ''تابع بن جانا'' یعنی جس شخص کا تابع ہوا ہے اس کے ہر قول پر سرِ تسلیم خم کر دینا۔ جیسا کہ ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً﴾ (۲)

''اے ایمان والو، اسلام میں داخل ہو جاؤ پورے کے پورے''

یہاں اس بات میں غور یہ کرنا ہے کہ ایک طرف تو اس آیت میں خطاب ہی ان لوگوں سے ہے جو ایمان لا چکے ہیں، اور دوسری طرف یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ معلوم ہوا کہ کلمۂ توحید جس سے انسان کا ایمان لانا ثابت ہوتا ہے اس کو پڑھ لینا ہی کافی نہیں اور صرف اس پر ہی ایمان مکمل نہیں ہوتا بلکہ ایک اور کام ہے جس کو سرانجام دینے سے انسان اسلام میں داخل ہو سکے گا، اور وہ کام یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے احکام کے آگے اس طرح سر جھکا دے کہ اس کے آگے کسی طرح کی چون و چرا کی گنجائش نہ رہے۔

اسلام کی حقیقت

اور میں اس موقع پر یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ ''سورہ صٰفّٰت'' میں جہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم

(۱) آل عمران:۱۹ (۲) التوبۃ:۲۰۸

خلیل اللہ اور حضرت اسماعیل ذبیح اللہ علیہما السلام کا واقعہ ذکر کیا ہے وہاں اسلام کا لفظ لایا گیا ہے۔ مختصراً اس واقعہ کو عرض کیے دیتا ہوں کہ ایک مرتبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے لختِ جگر حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اپنے ہاتھوں سے ذبح کر رہے ہیں۔ چونکہ انبیاء علیہم السلام کا خواب بھی وحی ہوتا ہے اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس حکم کو پورا کرنے اور بیٹے کو آزمانے کے لئے فرمایا:

﴿يَا بُنَيَّ إِنِّيٓ أَرٰى فِي الْمَنَامِ أَنِّيٓ أَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى﴾ (۱)

اب اگر آپ غور کریں کہ ایک انسان کو قتل کرنا تو ویسے ہی گناہِ کبیرہ ہے اور قرآن حکیم میں ارشاد بھی ہے:

﴿مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا﴾ (۲)

”جو کوئی ایک جان کو بغیر کسی جان کے بدلے قتل کرے یا زمین میں بغیر فساد کرنے کے قتل کرے تو گویا اس نے سب لوگوں کو قتل کر ڈالا“

اور قتل بھی نابالغ بچہ کا ہو تو وہ اور زیادہ گناہ کا باعث ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حالتِ جنگ میں بھی نابالغ بچے کے قتل سے روکا ہے۔

((نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ قَتْلِ النِّسَاءِ وَالصِّبْيَانِ)) (۳)

”رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حالتِ جنگ میں عورتوں اور بچوں کو قتل سے منع فرمایا ہے۔“

پھر اگر وہ نابالغ بچہ خود اپنا بیٹا ہو اور اس کو قتل کرنے کا حکم آجائے تو عقل اس بات کو تسلیم نہیں کرتی کہ نابالغ بیٹے کو قتل کر دیا جائے۔ لیکن وہ بیٹا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تھا اور جس کی صلب سے جناب نبی اکرم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لانے والے تھے، اس نے جواب دیا:

﴿يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ﴾ (۴)

”اے ابا جان! آپ کو جو حکم دیا جاتا ہے اس کو کر گزریئے“

اس تمام واقعہ کو نقل کرنے کے بعد قرآن اس قصے کو یوں پورا کرتا ہے:

---

(۱) الصّٰفّٰت:۱۰۲ (۲) المائدۃ:۳۲

(۳) صحیح البخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب قتل النساء فی الحرب، رقم: ۲۷۹۲، صحیح مسلم، کتاب الجهاد والسیر، باب تحریم قتل النساء والصبیان فی الحرب، رقم: ۳۲۷۹، سنن الترمذی، کتاب السیر عن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم، باب ما جاء فی النهی عن قتل النساء والصبیان، رقم: ۱۴۹۴

(۴) الصّٰفّٰت:۱۰۲

﴿فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ﴾ (۱)

''جب باپ اور بیٹے نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا''

تو یہاں جو لفظ اسلام لایا گیا ہے اس سے اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ حقیقت اسلام کی یہ ہے کہ جب اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے کوئی حکم آ جائے تو انسان آگے سے ''کیوں'' کا سوال نہ کرے بلکہ اس پر سرِ تسلیم خم کر کے اس کے مطابق عمل کرے اس لئے کہ ''کیوں'' کا سوال بندگی کا نہیں بلکہ اعتراض کا ہے۔

احکامِ اسلام کے بارے میں ایک گمراہانہ روش

جیسا کہ ہمارے یہاں جب بھی دین سے متعلق کوئی حکم بیان کیا جاتا ہے تو اس میں ایک گمراہانہ طریقہ رائج ہے کہ ایسا حکم کیوں ہے؟ اور بعض اوقات اس کے پیچھے یہ جذبہ ہوتا ہے کہ اگر یہ بات ہماری سمجھ میں آ گئی تو ہم اس کو مان کر اس پر عمل کریں گے ورنہ نہیں۔ یہ چیز اسلام کی روح کے خلاف ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی مواقع پر حکم بھیجے ہیں جہاں انسانی عقل کے ٹھوکر کھانے کا اندیشہ تھا۔ لہٰذا اگر کسی حکم کی مصلحت سمجھ میں نہ آئے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

دین کے احکام میں تاویلات کی تلاش کا رویہ

اگر آپ مغربی فلسفے کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ایک ایسا طبقہ بھی گذرا ہے جس کا دعویٰ ہی یہ ہے کہ اس کائنات میں خیر و شر یعنی اچھائی اور برائی سب اضافی چیزیں ہیں۔ لہٰذا جس ماحول میں جو چیز جس حیثیت سے رائج ہو گی اس کا اعتبار کیا جائے گا۔ اور وہ لوگ احکامات میں طرح طرح کی تاویلات کرتے ہیں۔ مثلاً حکم شرعی ہے کہ خنزیر کا گوشت حرام ہے، اگرچہ طبی نقطۂ نظر سے اس کی کچھ وجوہات ہماری سمجھ میں آ جاتی ہیں لیکن حقیقی وجہ اللہ ہی کے علم میں ہے، لیکن وہ خنزیر کے گوشت کے جواز کا دعویٰ کر کے اس کی دلیل یوں پیش کرتے ہیں کہ جس وقت خنزیر کا گوشت حرام کیا گیا اس وقت عرب میں خنزیر گندی جگہوں پر پھرتے تھے اور نجاست کھاتے تھے جس کی وجہ سے ان سے بیماریاں پیدا ہوتی تھیں۔ لیکن آج کل خنزیروں کی تربیت بہت اچھے انداز میں ہو رہی ہے لہٰذا علت ختم ہو جانے کی وجہ سے حکم بھی باقی نہ رہا۔ اور بات اتنی بڑھ چکی ہے کہ ایک صاحب تو مجھ سے اس بات پر بحث کرنے کو بھی تیار تھے اور کہتے تھے کہ علماء کو چاہئے کہ خنزیر کے حرام ہونے کے حکم کے بارے میں اجتہاد کریں کہ خنزیر فلاں وجہ سے حرام تھا، اب چونکہ وہ وجہ ختم ہو گئی ہے اس لئے وہ حکم بھی

(۱) الصّٰفّٰت: ۱۰۲

ختم ہو گیا ہے اور خنزیر کا گوشت حلال ہے۔ یہ صرف اس وجہ سے ہے کہ انسان نے اپنی عقل کو وہاں استعمال کیا جہاں انسانی عقل کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ہماری رہنمائی فرمائی ہے۔ لہٰذا یہ طرزِ عمل کہ احکاماتِ دینیہ کے بارے میں حقیقی مصلحت کا سوال کرنا اور مصلحت کے سمجھنے پر عمل کو موقوف کرنا دین کی حقیقت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

حکمتِ دین کا سوال کرنا مناسب نہیں

اس بات کو میں ایک مثال سے سمجھایا کرتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ دنیا میں انسانوں کے دو درجے ہوتے ہیں جن میں سے ایک درجہ غلامی جو الحمد للہ ختم ہو چکا ہے اور اس کی جگہ ملازمت آ گئی ہے، جو غلامی سے بہت کم درجہ کی نسبت رکھتی ہے۔ کیونکہ غلامی میں غلام کو چوبیس گھنٹے کام کاج اور خدمت وغیرہ کے لئے موجود ہونا ضروری ہوتا تھا اور ان کی کوئی تنخواہ بھی مقرر نہیں ہوتی تھی۔ جبکہ ملازمت میں چوبیس گھنٹوں میں سے مخصوص وقت تک کام کاج کرنے پڑتے ہیں نیز ملازم کو تنخواہ بھی دی جاتی ہے۔

آپ کے گھر میں ایک ملازم ہو اور آپ اس سے یہ کہیں کہ مجھے ۵ گڑوی دودھ لا کر دو! اور وہ ملازم کہے کہ آپ یہ دودھ کیوں منگوا رہے ہیں؟ اس کی وجہ بتائیں جب تک آپ مجھے اس کی وجہ نہ بتائیں گے میں آپ کو دودھ لا کر نہیں دوں گا۔ تو بتائیے کہ اس کے مقابلے میں آپ کا کیا ردِّ عمل ہو گا ظاہر ہے آپ اس سے ناراض ہوں گے حالانکہ وہ بھی آپ ہی کی طرح کا ایک انسان ہے۔ تو وہ اللہ جو خالق و مالک اور کائنات کی تمام چیزوں کا عالم ہے اس کے مقابلے میں تمہارا علم کیا حقیقت رکھتا ہے؟ لہٰذا بندے کو یہ حق کیسے دیا جا سکتا ہے کہ وہ کہے کہ پہلے مجھے اس کی حکمت بتاؤ پھر اس پر عمل کروں گا۔ اس بارے میں قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ﴾ (۱)

''جب اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے کوئی حکم آ جائے تو مؤمن مرد و عورت کے لئے اپنے کام میں کوئی اختیار نہیں رہتا''

زاویۂ نگاہ تبدیل کرنے سے دین حاصل ہو سکتا ہے

البتہ یہ بات سمجھ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے جو احکام دیے ہیں جن کے آگے سرِ تسلیم خم

(۱) الاحزاب: ۳۶

کرنا پڑتا ہے وہ احکام انسان کی زندگی میں معدودے چند (گنتی کے چند) ہیں اور ان کے علاوہ زندگی کا سارا حصہ آزاد ہے۔ مثلاً کھانا پکانا اور معیشت کا انتظام وغیرہ بے شمار دائرے غیر معین ہیں۔

دین کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اللہ کے دیے ہوئے احکام کا پابند ہو جائے، خواہ وہ احکام اوامر ہوں یا نواہی، اور باقی امور میں بھی اگر انسان ان کا پابند ہو جائے تو وہ بھی دین بن جائے گا۔ جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ دین اور دنیا ایک دوسرے کے حریف نہیں بلکہ ایک دوسرے کے مؤید اور مکمِّل (تکمیل کرنے والے) ہیں۔

یعنی دنیوی زندگی میں اگر ذرا سا زاویۂ نگاہ بدل لیا جائے تو یہی دنیا دین بن جاتی ہے۔ مثلاً کھانا تو ہر شخص کھاتا ہے لیکن اگر اس نقطۂ نظر سے کھانا کھایا جائے کہ یہ میرے اللہ کی عطا ہے اور اس کی ایسی نعمت ہے جو میں نے حلال طریقے سے کمائی ہے اور میں اس کو اس لئے کھا رہا ہوں تاکہ جو حق اللہ نے میرے نفس کا مجھ پر عائد کیا ہے میں اس حق کو ادا کر دوں، تو یہ بھی دین بن جائے گا۔ جیسے آپ نے وہ تصویریں تو دیکھی ہی ہوں گی جن کو ایک طرف دیکھنے سے ایک چیز اور دوسری طرف دیکھنے سے دوسری چیز نظر آتی ہے بالکل اسی طرح دین اور دنیا کا معاملہ ہے۔

دین اور دنیا ایک دوسرے کے حریف نہیں

میں ایک پریکٹیکل بات عرض کرتا ہوں کہ صبح اُٹھنے کے بعد انسان یہ تہیہ کر لے کہ میں آج کے دن جو بھی کام کروں گا وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق انجام دوں گا اور ہر کام اللہ تعالیٰ کے عائد کیے ہوئے حقوق کی ادائیگی کے لئے کروں گا۔ بس اگر آپ اپنی ڈیوٹی پر جا رہے ہیں تو اس تہیہ کے ذریعے آپ کا سارا دن دین بن جائے گا۔ اگر آپ بیوی بچوں کے ساتھ اسی نیت سے خوش طبعی کر رہے ہیں تو یہ بھی دین ہے۔ اور اس میں صرف ایک شرط ہے کہ وہ کام ناجائز یا حرام طریقے کے حصول کے لئے نہ کر رہا ہو تو یہی عمل آخرت میں اس کے دخولِ جنت کا سبب بن جائے گا۔ حاصل یہ کہ دین اور دنیا ایک دوسرے کے حریف نہیں ہیں۔

امام شیبانی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک سوال

اسی طرح معیشت کو انجام دینے کے جو طریقے اللہ تعالیٰ نے رکھے ہیں مثلاً زراعت، ملازمت، صنعت اور تجارت غرض یہ کہ تمام کام نیت کی بنا پر دین بن جاتے ہیں۔

امام محمد بن حسن شیبانی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت! آپ نے کتابیں تو بہت تصنیف کی ہیں لیکن تصوف اور روحانیت کے موضوع پر آپ نے کوئی کتاب نہیں لکھی؟ تو انہوں نے فرمایا کہ میں

نے انسان کی معیشت کے بارے میں جو کتاب لکھی ہے وہ تصوف ہی تو ہے۔ اس لئے کہ میں نے اس میں لکھا ہے کہ معیشت حاصل کرنے کے جو بھی طریقے ہیں ان کو انسان اللہ کی رضامندی کے لئے استعمال کرلے تو یہی چیزیں انسان کے لئے دین اور آخرت میں نجات کا ذریعہ بن جاتی ہیں اور درحقیقت یہ بھی تصوف ہی کی بات ہے۔

انسان کا ہر لمحہ دین بن سکتا ہے

انسان کا کوئی لمحہ ایسا نہیں ہے جس کو وہ دین نہ بنا سکے۔ صرف اور صرف اخلاصِ نیت سے انسان اپنی دنیا کو دین بنا سکتا ہے بشرطیکہ احکامِ الٰہیہ کے مطابق ہو۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اتنا کام اور کرے کہ جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے ان سے بچنے کا اہتمام کرے تو ساری دنیا دین بن جائے گی۔

رہی یہ بات کہ آپ کو حلال اور حرام چیزوں کے بارے میں علم کیسے ہو تو اس کے لئے اگر آپ روزانہ پانچ منٹ بھی نکالیں تو آہستہ آہستہ آپ کو یہ ساری باتیں معلوم ہو جائیں گی۔ اور ایک دوسرا کام یہ ہے کہ آپ حضرات اپنے اپنے گھروں میں چوبیس گھنٹوں میں سے صرف دس منٹ نکال کر سب گھر والوں کو جمع کر کے کوئی ایسی کتاب پڑھ کر سنا دیا کریں جس میں رسول اللہ ﷺ کی سیرت، حلال و حرام اور فرائض و واجبات کی نشاندہی کی گئی ہو۔ اور آخر میں اللہ تعالیٰ سے اس پر عمل کی توفیق کی دعا مانگ لیا کریں تو آپ کی دنیا بھی دین بن جائے گی۔

اس کے لئے میں آپ کے سامنے اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب عارفی قدس اللہ سرہ کی کتاب ''اُسوۂ رسولِ اکرم ﷺ'' کی تجویز پیش کرتا ہوں جو حضور ﷺ کی سیرت اور آپ کی سنتوں پر مشتمل ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے مجھے اور آپ سب کو اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے اور دین کی صحیح سمجھ عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.



دین کی حقیقت ☆

تسلیم و رضا

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

((عَنْ أَبِیْ مُوْسَی الْأَشْعَرِیِّ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ كَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ إِذَا مَرِضَ الْعَبْدُ أَوْ سَافَرَ كُتِبَ لَهُ مِثْلَ مَا كَانَ یَعْمَلُ مُقِیْمًا صَحِیْحًا))(۱)

بیماری اور سفر میں نیک اعمال لکھے جاتے ہیں

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اجل صحابہ اور فقہاء صحابہ میں سے ہیں، اور ان حضرات میں سے ہیں جنہوں نے دو مرتبہ ہجرت فرمائی۔ ایک مرتبہ حبشہ کی طرف، اور دوسری مرتبہ مدینہ طیبہ کی طرف۔ وہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

> ''جب کوئی بندہ بیمار ہوتا ہے، یا سفر کی حالت میں ہوتا ہے تو جو عبادات اور نیک اعمال صحت کی حالت میں یا اقامت کی حالت میں کیا کرتا تھا، جب بیماری یا سفر کی وجہ سے وہ چھوٹ جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ وہ سارے اعمال اس کے نامۂ اعمال میں لکھتے رہتے ہیں، باوجودیکہ وہ بیماری یا سفر کی وجہ سے وہ اعمال نہیں کر پا رہا ہے، اس لئے کہ اگر وہ تندرست ہوتا، یا اپنے گھر میں ہوتا تو یہ اعمال کرتا''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنی بڑی تسلی اور نعمت کی بات بتادی کہ بیماری میں معذوری اور مجبوری کی

☆ اصلاحی خطبات (۱/۱۸۱۔۲۰۶)

(۱) صحیح البخاری، کتاب الجهاد باب یکتب للمسافر مثل ما کان یعمل فی الاقامة، رقم: ۲۷۷۴، سنن أبی داؤد، کتاب الجنائز، رقم: ۲۶۸۷، مسند أحمد، رقم: ۱۸۸٤۸

وجہ سے جب معمولات چھوٹ رہے ہیں تو اس پر بہت صدمہ کرنے کی ضرورت نہیں کہ اگر تندرست ہوتا تو یہ کام کر لیتا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ان کو لکھ رہے ہیں۔

نماز کسی حالت میں معاف نہیں

لیکن اس کا تعلق صرف نفلی عبادت سے ہے۔ جو عبادات فرض ہیں، ان میں اللہ تعالیٰ نے جو تخفیف کر دی، اس تخفیف کے ساتھ ان کو انجام دینا ہی ہے۔ مثلاً نماز ہے۔ انسان کتنا ہی بیمار ہو، بسترِ مرگ پر ہو، اور مرنے کے قریب ہو، تب بھی نماز ساقط نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آسانی تو فرما دی کہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی طاقت نہیں تو بیٹھ کر پڑھ لو۔ بیٹھ کر پڑھنے کی طاقت نہیں تو لیٹ کر پڑھ لو۔ وضو نہیں کر سکتے تو تیمم کر لو، اگر کپڑے پاک رکھنا بالکل ممکن نہیں تو اسی حالت میں پڑھ لو، لیکن نماز کسی حالت میں معاف نہیں۔ جب تک انسان کے دم میں دم ہے۔ ہاں! اگر کوئی بے ہوش ہو جائے، یا غشی طاری ہو جائے، اور اسی حالت میں چھ نمازوں کا وقت گزر جائے تو اس وقت نماز معاف ہو جاتی ہے، لیکن جب تک ہوش میں ہے، اور دم میں دم ہے، اس وقت تک نماز معاف نہیں۔

بیماری میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان بیمار ہوا۔ اور اب کھڑے ہونے کے بجائے بیٹھ کر نماز پڑھ رہا ہے۔ بیٹھ کر پڑھنے کی قدرت نہیں تو لیٹ کر پڑھ رہا ہے۔ ایسے موقع پر بہت سے لوگوں کو دیکھا کہ وہ دل تنگ کرتے رہتے ہیں کہ اس حالت میں اب کھڑے ہو کر پڑھنے کا موقع نہیں مل رہا ہے، اور بیٹھ کر پڑھنے کا بھی موقع نہیں مل رہا ہے، لیٹے لیٹے نماز پڑھ رہا ہوں، پتہ نہیں کہ وضو بھی ٹھیک ہو رہا ہے یا نہیں، تیمم بھی صحیح ہو رہا ہے یا نہیں، ان چیزوں میں پریشان رہتے ہیں۔ حالانکہ سرکارِ دو عالم ﷺ تسلی دے رہے ہیں کہ جب تم مجبوری کی وجہ سے ان چیزوں کو چھوڑ رہے ہو تو اللہ تعالیٰ ان کو تمہارے نامۂ اعمال میں لکھ رہے ہیں جو تندرستی کی حالت میں تم کیا کرتے تھے۔

اپنی پسند کو چھوڑ دو

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ أَنْ تُؤْتٰى رُخَصُهٗ كَمَا يُحِبُّ أَنْ تُؤْتٰى عَزَائِمُهٗ)) (۱)

یعنی جس طرح عزیمت جو اعلیٰ درجے کا کام ہے اس پر عمل کرنا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، اسی

(۱) مجمع الزوائد (۱۶۲/۳)

طرح مجبوری کی وجہ سے اگر رخصت پر عمل کریں تو اللہ تعالیٰ اس کو بھی پسند کرتے ہیں۔لہٰذا اپنی پسند کی فکر نہ کرو۔اللہ تعالیٰ کو جو حالت پسند ہے، وہی حالت مطلوب ہے۔

آسانی اختیار کرنا سنت ہے

بعض لوگوں کی طبیعت سخت کوشی کی ہوتی ہے، وہ چاہتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ مشقت کا کام کریں، بلکہ مشقت ڈھونڈتے ہیں، اس لئے ڈھونڈتے ہیں کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس میں زیادہ ثواب ہے، چونکہ بہت سے بزرگوں سے بھی اس قسم کی باتیں منقول ہیں، لہٰذا ان کی شان میں کوئی گستاخی کا کلمہ نہیں کہنا چاہئے۔لیکن سنت کا طریقہ وہ نہیں۔سنت کا طریقہ یہ ہے جو حدیث میں منقول ہے:

((مَا خُيِّرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ أَمْرَيْنِ قَطُّ اِلَّا أَخَذَ أَيْسَرَهُمَا))(۱)

جب حضورِ اقدس ﷺ کو دو چیزوں کے درمیان اختیار دیا جاتا تو آپ ان میں سے آسان تر کو اختیار فرماتے۔اب سوال یہ ہے کہ کیا حضورِ اقدس ﷺ کا آسانی اختیار کرنا۔ معاذ اللہ۔ تن آسانی کے لئے تھا؟ اور کیا مشقت اور تکلیف سے بچنے کے لئے یا دنیاوی راحت اور آرام حاصل کرنے کے لئے تھا؟ ظاہر ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں ہوسکتا کہ آپ تن آسانی اور راحت و آرام حاصل کرنے کے لئے آسان راستہ اختیار فرماتے تھے۔لہٰذا اس کی وجہ وہی ہے کہ آسان راستہ اختیار کرنے میں عبدیت زیادہ ہے، اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادری نہیں ہے، بلکہ شکستگی ہے، میں تو عاجز بندہ ہوں، ناکارہ ہوں، میں تو آسان راستہ اختیار کرتا ہوں۔یہ بندگی کا اظہار ہے۔اور اگر مشکل راستہ اختیار کیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادری جتاتا ہے۔

دین "اتباع" کا نام ہے

دین کی ساری بنیاد یہ ہے کہ کسی خاص عمل کا نام دین نہیں۔کسی خاص شوق کا نام دین نہیں۔ اپنے معمولات پورے کرنے کا نام دین نہیں۔اپنی عادت پوری کرنے کا نام دین نہیں۔دین نام ہے ان کی اتباع کا۔وہ جیسا کہیں ویسا کرنے کا نام دین ہے۔ان کو جو چیز پسند ہے، اس کو اختیار کرنے کا نام دین ہے۔اور اپنے آپ کو ان کے حوالے کردینے کا نام دین ہے۔وہ جیسا کرا رہے ہیں، وہی بہتر ہے۔یہ جو صدمہ اور حسرت ہوتی رہتی ہے کہ ہم تو بیمار ہوگئے، اس واسطے کھڑے ہوکر نماز نہیں پڑھی

(۱) صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب صفة النبی صلی اللہ علیہ وسلم، رقم: ۳۲۹۶، صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب مباعدتہ للآثام...... رقم: ۴۲۹۴

جارہی ہے، لیٹ کر پڑھ رہے ہیں، یہ صدمہ کرنے کی بات نہیں۔ ارے اللہ تعالیٰ کو وہی پسند ہے۔ اور جب یہی پسند ہے تو اس وقت کا تقاضا یہی ہے کہ یہ کرو۔ اور ان کو ویسا ہی کرنا پسند ہے۔ اگرچہ اس وقت تم کو زبردستی کھڑے ہو کر نماز پڑھنا پسند ہے۔ لیکن اپنی تجویز کو فنا کر دینے اور اللہ جل جلالہ نے جیسا مقدر کر دیا اس پر راضی رہنے کا نام بندگی ہے۔ اپنی طرف سے تجویز کرنا کہ یوں ہوتا تو یوں کر لیتا، یہ کوئی بندگی نہیں۔

اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادری مت دکھاؤ

جب اللہ تعالیٰ یہ چاہ رہے ہیں کہ بندہ تھوڑا سا ہائے ہائے کرے۔ تو ہائے ہائے کرو۔ ایک بزرگ دوسرے بزرگ کے پاس عیادت کے لئے گئے تو دیکھا کہ وہ بزرگ بڑی سخت تکلیف میں ہیں، لیکن بجائے کچھ کراہنے کے ''اللہ اللہ'' اور ''الحمد للہ، الحمد للہ'' کا ورد کر رہے ہیں۔

ان بزرگ نے فرمایا: بھائی! یہ تمہارا ''الحمد للہ'' کرنا بڑا قابلِ مبارک باد ہے۔ لیکن یہ موقع اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنے کا ہے کہ ''یا اللہ! مجھے عافیت عطا فرما دیجئے''، اس وقت میں ''الحمد للہ'' کہنا، یہ اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادری دکھانا ہے کہ اللہ میاں! آپ تو مجھے بیمار کر رہے ہیں، لیکن میں اتنا بہادر ہوں کہ میری زبان پر کبھی آہ نہیں آئے گی۔ تو اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادری دکھانا یہ کوئی بندگی نہیں، اللہ تعالیٰ کے سامنے شکستگی دکھانا بندگی ہے۔ وہ جب چاہ رہے ہیں کہ بندہ تھوڑا سا ہائے ہائے کر کے پکارے تو عاجز اور بے بس بن کر اللہ میاں کو پکارو۔ کیسے پکارو؟ جیسے حضرت ایوب علیہ السلام نے پکارا تھا:

﴿اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ﴾ (۱)

پیغمبر سے زیادہ کون بہادر ہوگا۔ اتنی زبردست بیماری اور اتنی زبردست تکلیف، لیکن اللہ میاں کو پکار رہے ہیں کہ ''مَسَّنِیَ الضُّرُّ'' اے اللہ! مجھے تکلیف پہنچ گئی ہے، ''وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ'' لہٰذا وہ جب چاہ رہے ہیں کہ ان کو پکارا جائے، اور آدمی تھوڑا سا کراہے تو پھر کراہنے میں ہی مزہ ہے۔ وہ جیسا کہیں اسی کے کرنے میں مزہ ہے، اللہ میاں کے سامنے اتنا ضبط بھی اچھا نہیں، یہ بھی بندگی کے خلاف ہے۔

انسان کا اعلیٰ ترین مقام

یاد رکھو! انسان کا اعلیٰ ترین مقام، جس سے اونچا مقام کوئی اور نہیں ہو سکتا، وہ ''عبدیت'' اور اللہ تعالیٰ کی بندگی کا مقام ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کتنے اوصاف بیان

(۱) الانبیاء: ۸۳

فرمائے، ایک جگہ فرمایا:

﴿اِنَّا اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا﴾ (۱)

یعنی ہم نے آپ کو شاہد، مبشر، نذیر، داعی اور سراج منیر بنا کر بھیجا۔ دیکھئے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضورِ اقدس ﷺ کے کتنے اوصاف ذکر فرمائے۔ لیکن جہاں معراج کا ذکر آیا، اور اپنے پاس بلانے کا ذکر فرمایا، وہاں حضورِ اقدس ﷺ کے لئے ''عبد'' کا لفظ ذکر کیا۔ فرمایا:

﴿سُبْحَانَ الَّذِيْ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ﴾ (۲)

یعنی ''وہ ذات پاک ہے جو اپنے بندے کو لے گیا'' یہاں ''شاہد'' ''مبشر'' اور ''سراج منیر'' کے الفاظ نہیں لائے بلکہ صرف ایک لفظ ''عبد'' لائے۔ یہ بتلانے کے لئے کہ انسان کا سب سے اُونچا مقام عبدیت کا مقام ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی بندگی، شکستگی اور عاجزی کا مقام ہے۔

توڑنا ہے حسن کا پندار کیا؟

ہمارے بڑے بھائی تھے محمد ذکی کیفی مرحوم۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ شعر بہت اچھے کہا کرتے تھے۔ انہوں نے ایک بہت اچھا شعر کہا ہے۔ لوگ اس کا صحیح مطلب نہیں سمجھتے۔ اسی بات کو انہوں نے بڑے خوبصورت پیرائے میں کہا ہے۔ کہتے ہیں کہ؂

اس قدر بھی ضبطِ غم اچھا نہیں
توڑنا ہے حسن کا پندار کیا؟ (۳)

یہ جو غم کو اتنا ضبط کر رہے ہو کہ منہ سے ''آہ'' بھی نہ نکلے ''کراہ'' بھی نہ نکلے، تو کیا تم اس کے پندار کو توڑنا چاہتے ہو جو تمہیں اس غم میں مبتلا کر رہا ہے؟ اس کا پندار توڑنا مقصود ہے؟ اس کے آگے بہادری دکھانا چاہتے ہو؟ یہ بندہ کا کام نہیں۔ بندہ کا کام تو یہ ہے کہ جب اس نے ایک تکلیف دی تو اس تکلیف کا تقاضا یہ ہے کہ اس تکلیف کے ازالے کے لئے اس کو پکارا جائے۔ اگر اس نے غم دیا ہے تو اس غم کا اظہار شرعی حدود میں رہ کر کیا جائے۔ جیسا کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے کیا کہ جب بچے کا انتقال ہو گیا تو فرمایا:

((اِنَّا بِفِرَاقِكَ يَا اِبْرَاهِيْمُ لَمَحْزُوْنُوْنَ))

''اے ابراہیم! ہم تمہاری جدائی پر بڑے غمگین ہیں'' (۴)

---

(۱) الاحزاب: ۴۵۔ ۴۶ (۲) بنی اسرائیل: ۱ (۳) کیفیات: ذکی کیفی، ص: ۱۴۱

(٤) صحيح البخاری، كتاب الجنائز، باب قول النبی صلی الله عليه وسلم: انا بك لمحزونون، رقم: ۱۲۲۰، صحيح مسلم، كتاب الفضائل (٤٢٧٩)

بات یہ ہے کہ جس حالت میں اللہ تعالیٰ رکھتے ہیں وہی حالت پسندیدہ ہے۔ جب وہ چاہ رہے ہیں کہ لیٹ کر نماز پڑھو تو پھر لیٹ کر ہی نماز پڑھو۔ اس وقت لیٹ کر پڑھنے ہی میں وہ ثواب اور وہ اجر ہے جو عام حالت میں کھڑے ہو کر پڑھنے میں ہے۔

رمضان کا دن لوٹ آئے گا

ہمارے حضرت ڈاکٹر محمد عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی بات نقل فرماتے تھے کہ ایک شخص رمضان میں بیمار ہو گیا۔ اور بیماری کی وجہ سے روزہ چھوڑ دیا، اب اس کو غم ہو رہا ہے کہ رمضان کا روزہ چھوٹ گیا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ غم کرنے کی کوئی بات نہیں، یہ دیکھو کہ تم روزہ کس کے لئے رکھ رہے ہو؟ اگر یہ روزہ اپنی ذات کے لئے رکھ رہے ہو، اپنی خوشی کے لئے اور اپنا شوق پورا کرنے کے لئے روزہ رکھ رہے ہو تو بے شک اس پر صدمہ کرو کہ بیماری آ گئی اور روزہ چھوٹ گیا۔ لیکن اگر اللہ تبارک وتعالیٰ کے لئے روزہ رکھ رہے ہو، اور اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ بیماری میں روزہ چھوڑ دو، تو مقصود پھر بھی حاصل ہے۔ اس لئے کہ حدیث شریف میں ہے:

((لَیْسَ مِنَ الْبِرِّ الصِّیَامُ فِی السَّفَرِ))[1]

سفر کی حالت میں جب کہ شدید مشقت ہو، اس وقت روزہ رکھنا کوئی نیکی کا کام نہیں۔ لیکن قضا کرنے کے بعد جب عام دنوں میں روزہ رکھو گے تو اس میں وہ تمام انوار و برکات حاصل ہوں گے جو رمضان کے مہینے میں حاصل ہوتے تھے۔ گویا کہ اس شخص کے حق میں رمضان کا دن لوٹ آئے گا، اور رمضان کے دن روزہ رکھنے میں جو فائدہ حاصل ہوتا، وہ فائدہ اس دن قضا کرنے میں حاصل ہو جائے گا۔ لہٰذا اگر شرعی عذر کی وجہ سے روزے قضا ہو رہے ہیں، مثلاً بیماری ہے، سفر ہے، یا خواتین کی طبعی مجبوری ہے، اس کی وجہ سے روزے قضا ہو رہے ہیں تو غمگین ہونے کی کوئی بات نہیں۔ اس وقت میں روزہ چھوڑ دینا اور کھانا پینا ہی اللہ کو پسند ہے، اور لوگوں کو روزہ رکھ کر جو ثواب مل رہا ہے، تمہیں روزہ نہ رکھ کر وہی ثواب مل رہا ہے، اور عام لوگوں کو بھوکا رہ کر جو ثواب مل رہا ہے، تمہیں کھانا کھا کر مل رہا ہے، اور اللہ تعالیٰ وہی انوار و برکات عطا فرما رہے ہیں، جو عام روزہ داروں کو عطا فرما رہے ہیں۔ اور پھر جب بعد میں اس روزے کی قضا کرو گے تو قضا کے دن رمضان کی ساری برکتیں اور سارے انوار حاصل ہوں گے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الصوم، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم: لیس من البر الصوم فی السفر، رقم: ۱۹٤٦، سنن الترمذی، کتاب الصوم عن رسول اللہ رقم: ٦٤٤

اللہ تعالیٰ ٹوٹے ہوئے دل میں رہتے ہیں

اور اللہ تعالیٰ ٹوٹے ہوئے دلوں کے ساتھ ہوتے ہیں۔ بیماری کے اندر جو صدمہ ہو رہا ہے کہ ''روزہ'' چھوٹ گیا، اس صدمہ سے دل ٹوٹا، دل شکستہ ہوا۔ دل کی اس شکستگی کے بعد اللہ تعالیٰ اس کو نواز دیتے ہیں، چاہے صدموں سے دل ٹوٹے، یا غموں سے ٹوٹے، یا افکار سے ٹوٹے، یا خوفِ خدا سے ٹوٹے، یا فکرِ آخرت سے۔ کسی بھی طرح ہو۔ بس جب دل ٹوٹتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمتوں کا مورد بن جاتا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

((أَنَا عِنْدَ الْمُنْكَسِرَةِ قُلُوبُهُمْ مِنْ أَجْلِيْ))(۱)

''میں ان لوگوں کے پاس ہوں جن کے دل میری وجہ سے ٹوٹے ہوں''

دل پر یہ چوٹیں جو پڑتی رہتی ہیں، اس طرح کہ کبھی کوئی تکلیف آگئی، کبھی کوئی صدمہ آ گیا، کبھی کوئی پریشانی آگئی، یہ دل کو توڑا جا رہا ہے، کیوں توڑا جا رہا ہے؟ اس کو اس لئے توڑا جا رہا ہے کہ اس کو اپنی رحمتوں اور اپنے فضل وکرم کا مورد بنایا جا رہا ہے۔

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں

یہ دل جتنا ٹوٹے گا، اتنا ہی آئینہ ساز یعنی اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں عزیز ہوگا۔

ہمارے حضرت ڈاکٹر محمد عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ ایک شعر سنایا کرتے تھے، فرماتے تھے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے دل کو توڑتے ہیں، تو اس کے ذریعہ اس کو بلندیوں تک پہنچانا مقصود ہوتا ہے۔ یہ صدمے، یہ افکار، یہ غم جو انسان کو آتے ہیں، یہ مجاہداتِ اضطراری ہوتے ہیں، جس سے انسان کے درجات میں اتنی ترقی ہوتی ہے کہ عام حالات میں اتنی ترقی نہیں ہوتی۔ چنانچہ یہ شعر اکثر سناتے۔

یہ کہہ کے کوزہ گر نے پیالہ پٹک دیا
اب اور کچھ بنائیں گے اس کو بگاڑ کے

جب یہ دل ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتا ہے تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کی تجلیات اور اس کی رحمتوں کا مورد بنتا ہے۔ ایک غزل کا شعر حضرت والا سنایا کرتے تھے۔ فرماتے تھے۔

بتانِ ماہ وش اُجڑی ہوئی منزل میں رہتے ہیں
جسے برباد کرتے ہیں اسی کے دل میں رہتے ہیں

---

(۱) اتحاف السادة المتقين (٦/٢٩٠)، اگرچہ محدثین نے حدیث کی حیثیت سے اس کو بے اصل کہا ہے، لیکن جو معنی اس میں بیان کیے گئے ہیں وہ صحیح ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ٹوٹے ہوئے دل میں تجلی فرماتے ہیں۔ اس لئے ان غموں اور صدموں سے ڈرو نہیں، یہ آنسو جو گر رہے ہیں، یہ دل جو ٹوٹ رہا ہے، یہ آہیں جو نکل رہی ہیں، اگر اللہ جل جلالہ پر ایمان ہے، اگر اللہ تعالیٰ کی تصدیق دل میں ہے تو یہ سب چیزیں تمہیں کہیں سے کہیں پہنچا رہی ہیں۔

وادی عشق بسے دور و دراز است ولے
طے شود جادہ صد سالہ بہ آہے گاہے

وادی عشق کا راستہ بڑا لمبا چوڑا راستہ ہے، لیکن بعض اوقات سو سال کا فاصلہ ایک آن میں طے ہو جاتا ہے۔ اس لئے ان صدموں اور غموں اور پریشانیوں سے گھبرانا نہیں چاہئے۔

دین تسلیم و رضا کے سوا کچھ نہیں

اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں یہ بات اُتار دے کہ دین اپنا شوق پورا کرنے کا نام نہیں، اپنی عادت پوری کرنے کا نام دین نہیں۔ دین اس کا نام ہے کہ جس وقت جو کام کرنے کو کہا جا رہا ہے وہ کریں۔ نہ کسی عمل میں کچھ رکھا ہے۔ نہ نماز میں کچھ رکھا ہے۔ نہ روزے میں کچھ رکھا ہے۔ کسی عمل میں کچھ نہیں رکھا۔ جو کچھ ہے وہ ان کی رضا میں ہے۔

عشق تسلیم و رضا کے ماسوا کچھ بھی نہیں
وہ وفا سے خوش نہ ہوں تو پھر وفا کچھ بھی نہیں

اللہ تبارک وتعالیٰ جس کام سے خوش ہوں، وہی کام کرنے کا ہے، اسی کام میں مزہ ہے۔

نہ تو ہے ہجر ہی اچھا نہ وصال اچھا ہے
یار جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے یہ بات ہمارے دلوں میں پیوست فرما دے تو دین کو سمجھنے کے راستے کھل جائیں۔

تیمارداری میں معمولات کا چھوٹنا

اور یہ جو بتایا کہ بیماری کی حالت میں اگر معمولات چھوٹ جائیں تو اس پر وہی کچھ لکھا جا رہا ہے جو صحت کی حالت میں کرنے سے ملتا۔ علماء کرام نے فرمایا کہ اس میں جس طرح اپنی بیماری داخل ہے، ان لوگوں کی بیماری بھی داخل ہے جن کی تیمارداری اور خدمت انسان کے فرائض میں شامل ہے۔ کسی کے والدین بیمار ہو گئے۔ اب دن رات ان کی خدمت میں لگا ہوا ہے۔ ان کی خدمت میں لگے رہنے کی وجہ سے معمولات چھوٹ گئے۔ اب نہ تلاوت ہو رہی ہے۔ نہ نوافل ہو رہے ہیں۔ نہ ذکر ہے

نہ تسبیح ہے۔ سب کچھ چھوٹا جا رہا ہے۔ اور دن رات ماں باپ کی خدمت میں لگا ہوا ہے۔ اس کا بھی یہی حکم ہے۔ اگرچہ خود بیمار نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی جو اعمال چھوٹ رہے ہیں، وہ اعمال اللہ تعالیٰ کے یہاں لکھے جا رہے ہیں۔ کیوں؟

وقت کا تقاضا دیکھو

اس لئے کہ ہمارے حضرت ڈاکٹر محمد عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ بڑے کام کی بات فرمایا کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ بزرگوں کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے انسان کی زندگی درست کرنے کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ فرماتے تھے: میاں! ہر وقت کا تقاضا دیکھو۔ اس وقت کا تقاضا کیا ہے؟ اس وقت مجھ سے مطالبہ کیا ہے؟ یہ نہ سوچو کہ اس وقت میرا کس کام کو دل چاہ رہا ہے۔ دل چاہنے کی بات نہیں۔ بلکہ یہ دیکھو اس وقت تقاضا کس کام کا ہے؟ اس تقاضے کو پورا کرو۔ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی مرضی ہے۔ تم نے تو اپنے ذہن میں بٹھا رکھا تھا کہ روزانہ تہجد پڑھا کروں گا، روزانہ اتنے پارے تلاوت کیا کروں گا، روزانہ اتنی تسبیحات پڑھا کروں گا، اب جب ان کاموں کا وقت آیا تو دل چاہ رہا ہے کہ یہ کام میں پورے کروں۔ اور ذہن پر اس کام کا بوجھ ہے۔ اب عین وقت پر گھر میں سے بیمار ہو گئیں۔ اور اس کے نتیجے میں اس کی تیمارداری، علاج اور دوا دارو میں لگنا پڑا۔ اور اس میں لگنے کی وجہ سے وہ معمول چھوٹنے لگا۔ اس وقت بڑا دل کڑھتا ہے کہ کیا ہو گیا۔ میرا تو آج کا معمول قضا ہو جائے گا۔ اس وقت تو میں بیٹھ کر تلاوت کرتا، ذکر و اذکار کرتا، اب مارا مارا پھر رہا ہوں کہ کبھی ڈاکٹر کے پاس، کبھی حکیم کے پاس، کبھی دواخانے، یہ میں کس چکر میں پھنس گیا۔ ارے! اللہ تعالیٰ نے جس چکر میں ڈالا، اس وقت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ کرو، اگر اس وقت وہ کام چھوڑ کر تلاوت کرنے بیٹھ جاؤ گے تو وہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔ اب وقت کا تقاضا یہ ہے کہ یہ کام کرو۔ اب اسی میں وہ ثواب ملے گا جو تلاوت کرنے میں ملتا۔ اسی میں وہ ثواب ملے گا جو تسبیحات میں ملتا۔ یہ ہے اصل دین۔

اپنا شوق پورا کرنے کا نام دین نہیں

ہمارے حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ ۔۔۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین ۔۔۔ ان حضرات میں سے تھے جن کے قلب پر اللہ تعالیٰ کانٹے کی بات القا فرماتے تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ بھائی! اپنا شوق پورا کرنے کا نام دین نہیں، اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا نام دین ہے۔ اس کا نام دین نہیں کہ فلاں کام کا شوق ہو گیا۔ لہٰذا اب تو وہی کام کریں گے۔ مثلاً علم دین پڑھنے اور عالم بننے کا شوق ہو گیا۔ اس سے قطع نظر کہ تمہارے لئے عالم بننا جائز بھی ہے یا نہیں؟ گھر

میں ماں بیمار پڑی ہے، باپ بیمار پڑا ہے، اور گھر میں دوسرا کوئی تیمارداری کرنے والا اور ان کی دیکھ بھال کرنے والا موجود نہیں، لیکن آپ کو شوق ہو گیا کہ عالم بنیں گے، چنانچہ ماں باپ کو بیمار چھوڑ کر مدرسہ میں پڑھنے چلے گئے۔ یہ دین کا کام نہیں ہے، یہ اپنا شوق پورا کرنا ہے۔ دین کا کام تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ چھوڑ کر ماں کی خدمت کرو۔ باپ کی خدمت کرو۔

مفتی بننے کا شوق

یا مثلاً تخصص پڑھنے اور مفتی صاحب بننے کا شوق ہو گیا۔ بہت سے طلبہ مجھ سے کہتے ہیں کہ ہمیں تخصص پڑھنے کا بڑا شوق ہے، اور ہم فتویٰ نویسی سیکھنا چاہتے ہیں۔ ان سے پوچھا کہ آپ کے والدین کا کیا منشا ہے؟ جواب دیا کہ والدین تو راضی نہیں ہیں۔ اب دیکھئے کہ والدین تو راضی نہیں ہیں اور یہ مفتی صاحب بننا چاہتے ہیں۔ یہ دین نہیں ہے، یہ اپنا شوق پورا کرنا ہے۔

تبلیغ کرنے کا شوق

یا مثلاً! تبلیغ کرنے اور چلّے میں جانے کا شوق ہو گیا۔ ویسے تو تبلیغ کرنا بڑی فضیلت اور ثواب کا کام ہے، لیکن گھر میں بیوی بیمار پڑی ہے، کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہیں ہے۔ اور آپ کو چلّہ لگانے کا شوق ہو گیا، یہ دین نہیں ہے، یہ اپنا شوق پورا کرنا ہے۔ اب اس وقت دین کا تقاضا اور وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اس بیمار کی تیمارداری کرو، اور اس کا خیال کرو، اور اس کا علاج کرو، یہ دنیا نہیں ہے۔ یہ بھی دین ہے۔

مسجد میں جانے کا شوق

حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ مجلس میں اس پر یہ مثال دی کہ ایک شخص جنگل اور ویرانے میں اپنی بیوی کے ساتھ رہتا ہے۔ اور آس پاس کوئی آبادی بھی نہیں۔ بس میاں بیوی دونوں اکیلے رہتے ہیں۔ اب میاں صاحب کو آبادی کی مسجد میں جا کر جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا شوق ہو گیا، اب بیوی کہتی ہے کہ یہ تو جنگل اور ویرانہ ہے۔ اگر تم نماز پڑھنے آبادی کی مسجد میں چلے گئے تو مجھے اس ویرانے میں ڈر لگے گا۔ اور ڈر کے مارے میری جان نکل جائے گی، اس لئے بجائے مسجد جانے کے آج تم یہیں نماز پڑھ لو ــــ حضرت والا فرماتے ہیں کہ وہ میاں صاحب تو تھے شوقین، چنانچہ شوق میں آ کر اپنی بیوی کو وہیں جنگل میں اکیلا چھوڑ چھاڑ کر چلے گئے۔ فرمایا کہ یہ شوق پورا کرنا ہے۔ یہ دین نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس وقت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ گھر میں نماز پڑھتا۔ اور اپنی

بیوی کی یہ پریشانی دور کرتا۔

یہ اس وقت ہے جہاں بالکل ویرانہ ہے، کوئی آبادی نہیں ہے، البتہ جہاں آبادی ہو تو وہاں مسجد میں جا کر نماز پڑھنی چاہئے۔

لہٰذا اپنا شوق پورا کرنے کا نام دین نہیں۔ کسی کو جہاد میں جانے کا شوق۔ کسی کو تبلیغ میں جانے کا شوق۔ کسی کو مولوی بننے کا شوق۔ کسی کو مفتی بننے کا شوق۔ اور اس شوق کو پورا کرنے کے نتیجے میں ان حقوق کا کوئی خیال نہیں جو اس پر عائد ہو رہے ہیں۔ اس بات کا کوئی خیال نہیں کہ اس وقت میں ان حقوق کا تقاضا کیا ہے؟

یہ جو کہا جاتا ہے کہ کسی شیخ سے تعلق قائم کرو، یہ درحقیقت اسی لئے ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ اس وقت کا کیا تقاضا ہے؟ اس وقت تمہیں کونسا کام کرنا چاہئے؟ اب یہ باتیں جو اس وقت کہہ رہا ہوں، اس کو کوئی آگے اس طرح نقل کر دے گا کہ وہ مولانا صاحب تو یہ کہہ رہے تھے کہ مفتی بننا بُری بات ہے۔ یا تبلیغ کرنا بُری بات ہے۔ وہ صاحب تو تبلیغ کے مخالف ہیں۔ کہ تبلیغ میں اور چلے میں نہیں جانا چاہئے۔ یا جہاد میں نہیں جانا چاہئے۔ ارے بھائی! یہ سب کام اپنے اپنے وقت پر اللہ تعالیٰ کی رضا کے کام ہیں۔ یہ دیکھو کہ کس وقت کا کیا تقاضا ہے؟ تم سے کس وقت کیا مطالبہ ہو رہا ہے؟ اس مطالبے اور تقاضے پر عمل کرو۔ اپنے دل و دماغ سے ایک راستہ متعین کر لیا اور اس پر چل کھڑے ہوئے، یہ دین نہیں ہے۔ دین یہ ہے کہ یہ دیکھو کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ اس وقت کس بات کا حکم دے رہے ہیں؟

سہاگن وہ جسے پیا چاہے

میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہندی زبان کی ایک مثل بہت کثرت سے سنایا کرتے تھے۔ فرماتے کہ:

سہاگن وہ جسے پیا چاہے

قصہ یوں ہے کہ ایک لڑکی کو دلہن بنایا جا رہا تھا۔ اور اس کا سنگھار پٹار کیا جا رہا تھا، اب جو کوئی آتا اس کی تعریف کرتا کہ تو بڑی خوبصورت لگ رہی ہے۔ تیرا چہرہ اتنا خوبصورت ہے۔ تیرا جسم اتنا خوبصورت ہے۔ تیرا زیور اتنا خوبصورت ہے۔ اس کی ایک ایک چیز کی تعریف کی جا رہی تھی۔ لیکن وہ لڑکی ہر ایک کی تعریف سنتی، لیکن خاموش رہتی۔ اور سنی اَن سُنی کر دیتی۔ کسی خوشی کا اظہار نہ کرتی۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ یہ تیری سہیلیاں تیری اتنی تعریفیں کر رہی ہیں، تجھے اس سے کوئی خوشی نہیں ہو رہی ہے؟ اس لڑکی نے جواب دیا کہ ان کی تعریف سے کیا خوشی ہو۔ اس لئے کہ یہ جو کچھ تعریفیں کریں گی، وہ ہوا میں اُڑ جائیں گی۔ بات جب ہے کہ جس کے لئے مجھے سنوارا جا رہا ہے، وہ تعریف کرے۔ وہ پسند کر کے

کہہ دے کہ ہاں! تو اچھی لگ رہی ہے، تب تو فائدہ ہے۔ اور اس کے نتیجے میں میری زندگی سنور جائے گی۔ لیکن اگر یہ عورتیں تو تعریف کر کے چلی گئیں اور جس کے لئے مجھے سنوارا گیا تھا، اس نے ناپسند کر دیا تو پھر اس دلہن بننے اور اس سنگھار پٹار کا کیا فائدہ؟

یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

یہ قصہ سنانے کے بعد حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ یہ دیکھو کہ جو کام تم کر رہے ہو، جس کے لئے کر رہے ہو اس کو پسند ہے یا نہیں؟ لوگوں نے تو تعریف کر دی کہ بڑے مفتی صاحب ہیں۔ بڑے عالم اور بڑے مولانا صاحب ہیں۔ لوگوں نے تعریف کر دی کہ تبلیغ میں بہت وقت لگاتا ہے۔ اور اللہ کے راستے میں نکلتا ہے۔ کسی کے بارے میں کہہ دیا کہ یہ مجاہدِ اعظم ہے۔ ارے ان لوگوں کے کہنے سے کیا حاصل! جس کے لئے کر رہے ہو وہ یہ کہہ دے کہ۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

اس وقت فائدہ ہے۔ لہٰذا جب ہر کام کا مقصد ان کو راضی کرنا ہے تو پھر ہر وقت انسان کو یہ فکر رہنی چاہئے کہ اس وقت مجھ سے کیا مطالبہ ہو رہا ہے؟

اذان کے وقت ذکر چھوڑ دو

اچھے خاصے ذکر اللہ میں مشغول تھے۔ لیکن جیسے ہی اذان کی آواز کان میں پڑی، حکم آ گیا کہ ذکر چھوڑ دو اور خاموش ہو کر مؤذن کی آواز سنو اور اس کا جواب دو۔ اگرچہ وقت ضائع ہو رہا ہے۔ اذان کے وقت اگر ذکر کرتے رہتے تو کئی تسبیحات اور پڑھ لیتے۔ مگر ذکر سے روک دیا گیا۔ جب روک دیا تو اب رک جاؤ۔ اب ذکر میں فائدہ نہیں۔ اب اذان سننے اور اس کا جواب دینے میں فائدہ ہے۔

جو کچھ ہے وہ ہمارے حکم میں ہے

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حج بڑی عجیب وغریب عبادت بنائی ہے۔ اگر آپ حج کی عاشقانہ عبادت کو شروع سے آخر تک دیکھیں گے تو یہ نظر آئے گا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قدم قدم پر قاعدوں کے بت توڑے ہیں۔ اب دیکھیں کہ مسجد حرام میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے۔ لیکن آٹھ ذی الحجہ کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ مسجدِ حرام چھوڑو، اور منیٰ میں جا کر پڑاؤ ڈالو۔ وہاں نہ حرم، نہ کعبہ، اور نہ وہاں پہ کوئی کام، نہ وقوف ہے، نہ رمی جمرات ہے۔ بس یہ حکم دے دیا کہ ایک لاکھ نمازوں

کا ثواب چھوڑو، اور منیٰ کے جنگل میں جاکر پانچ نمازیں ادا کرو، یہ سب کیوں ہے؟ اس لئے کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ نہ اس کعبہ میں کچھ رکھا ہے اور نہ حرم میں کچھ رکھا ہے۔ نہ مسجدِ حرام میں کچھ رکھا ہے۔ جو کچھ ہے وہ ہمارے حکم میں ہے۔ جب ہم نے کہہ دیا کہ مسجدِ حرام میں جاکر نماز پڑھو، تو اب ایک لاکھ نمازوں کا ثواب ملے گا۔ اور جب ہم نے کہہ دیا کہ مسجدِ حرام کو چھوڑو۔ اب اگر کوئی شخص مسجدِ حرام میں نماز پڑھے گا تو ایک لاکھ نمازوں کا ثواب تو کیا ملے گا، بلکہ اُلٹا گناہ ہوگا۔ اس لئے کہ اس نے ہمارے حکم کو توڑ دیا۔

نماز اپنی ذات میں مقصود نہیں

قرآن وسنت میں نماز وقت پر پڑھنے کی بہت تاکید وارد ہے۔ فرمایا:

﴿إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتَابًا مَّوْقُوْتًا﴾ (۱)

نماز کو وقت کے ساتھ پابند کیا گیا ہے۔ وقت گزرنے سے پہلے نماز پڑھ لو۔ مغرب کی نماز کے بارے میں حکم دے دیا کہ تعجیل کرو۔ جتنی جلدی ہو سکے پڑھ لو۔ تاخیر نہ ہو۔ لیکن عرفات کے میدان میں مغرب کی نماز جلدی پڑھو گے تو نماز ہی نہ ہوگی۔ حضورِ اقدس ﷺ مغرب کے وقت عرفات کے میدان سے نکل رہے ہیں۔ اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ بار بار فرمارہے ہیں کہ "الصلاة یا رسول اللّٰہ" "الصلاة یا رسول اللّٰہ" اور حضورِ اقدس ﷺ فرمارہے ہیں کہ "الصلاة امامك" (نماز تمہارے آگے ہے)

سبق یہ دیا جارہا ہے کہ یہ مت سمجھ لینا کہ اس مغرب کے وقت میں کچھ رکھا ہے۔ ارے بھائی! جو کچھ ہے وہ ہمارے حکم میں ہے۔ جب ہم نے کہا کہ جلدی پڑھو تو جلدی پڑھنا باعثِ ثواب تھا۔ اور جب ہم نے کہا کہ مغرب کا یہ وقت گزار دو، اور مغرب کی نماز عشاء کی نماز کے ساتھ ملاکر پڑھو، تو اب تمہارے ذمے وہی فرض ہے۔ حج میں قدم قدم پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے قاعدوں کے بت توڑے ہیں۔ عصر کی نماز میں تقدیم کرادی، اور مغرب میں تاخیر کرادی۔ ہر کام اُلٹا کرایا جارہا ہے۔ اور تربیت اس بات کی دی جارہی ہے کہ کسی چیز کو اپنی ذات میں مقصود نہ سمجھنا۔ نہ نماز اپنی ذات میں مقصود ہے۔ نہ روزہ اپنی ذات میں مقصود ہے۔ نہ کوئی اور عبادت اپنی ذات میں مقصود ہے۔ مقصود اللہ جل جلالہ کی اطاعت ہے۔

---

(۱) النساء: ۱۰۳

افطار میں جلدی کیوں؟

یہ جو حکم دیا گیا کہ افطار میں جلدی کرو، اور بلاوجہ افطار میں تاخیر کرنا مکروہ ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اب تک تو بھوکا رہنا اور نہ کھانا باعثِ ثواب تھا۔ پیاسا رہنا باعثِ ثواب تھا، اس کی بڑی فضیلت اور بڑا اجر وثواب تھا۔ لیکن جب ہم نے کہہ دیا کہ کھاؤ اب کھانے میں تاخیر کرنا گناہ ہے۔ اس لئے کہ اب اگر کھانے میں تاخیر کرو گے تو اپنی طرف سے روزے میں اضافہ کرنا لازم آئے گا۔

سحری میں تاخیر کیوں؟

سحری میں تاخیر افضل ہے۔ اگر کوئی شخص پہلے سے سحری کھا کر سو جائے تو یہ سنت کے خلاف ہے۔ بلکہ عین وقت پر جب سحری کا وقت ختم ہو رہا ہو، اس وقت کھانا افضل ہے۔ کیوں؟ اس لئے اگر پہلے سے کوئی شخص سحری کھا کر سو گیا تو اس نے اپنی طرف سے روزے کی مقدار میں اضافہ کر دیا۔ وہ اتباع میں نہیں کر رہا ہے۔ بلکہ اپنی طرف سے کر رہا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ساری بات ان کی اتباع میں ہے۔ ہم ان کے بندے ہیں۔ اور بندے کے معنی یہ ہیں کہ جو کہیں وہ کرو۔

"بندہ" اپنی مرضی کا نہیں ہوتا

حضرت مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ بھائی! ایک ہوتا ہے ملازم اور نوکر، ملازم اور نوکر خاص وقت اور خاص ڈیوٹی کا ہوتا ہے۔ مثلاً ایک ملازم کا کام صرف جھاڑو دینا ہے۔ کوئی دوسرا کام اس کے ذمے نہیں۔ یا ایک ملازم آٹھ گھنٹے کا ملازم ہے۔ آٹھ گھنٹے کے بعد اس کی چھٹی۔ اور ایک ہوتا ہے "غلام" جو نہ وقت کا ہوتا ہے اور نہ ڈیوٹی کا ہوتا ہے۔ وہ تو حکم کا ہے۔ اگر آقا اس سے کہے کہ تم یہاں قاضی اور جج بن کر بیٹھ جاؤ اور لوگوں کے درمیان فیصلے کرو تو وہ قاضی بن کر فیصلے کرے گا۔ اور اگر آقا اس سے کہہ دے کہ پاخانہ اٹھاؤ تو وہ پاخانہ اٹھائے گا۔ اس کے لئے نہ وقت کی قید ہے اور نہ کام کی قید، بلکہ آقا جیسا کہہ دے غلام کو ویسا ہی کرنا ہوگا۔

"غلام" سے آگے بھی ایک درجہ اور ہے۔ وہ ہے "بندہ" وہ غلام سے بھی آگے ہے۔ اس لئے کہ "غلام" کم از کم اپنے آقا کی پرستش تو نہیں کرتا ہے۔ لیکن "بندہ" اپنے آقا کی عبادت اور پرستش بھی کرتا ہے۔ اور "بندہ" اپنی مرضی کا نہیں ہوتا ہے، بلکہ اپنے آقا کی مرضی کا ہوتا ہے۔ وہ جو کہے وہ کرے، دین کی روح اور حقیقت یہی ہے۔

بتاؤ! یہ کام کیوں کر رہے ہو؟

میں نے صبح سے شام تک کا ایک نظام بنا رکھا ہے کہ اس وقت تصنیف کرنی ہے۔ اس وقت درس دینا ہے۔ اس وقت فلاں کام کرنا ہے۔ تصنیف کے وقت جب تصنیف کرنے بیٹھے، مطالعہ کیا، اور ابھی ذہن کو لکھنے کے لئے تیار کیا، اور قلم اُٹھایا تھا سوچ کر یوں لکھنا چاہئے کہ اتنے میں ایک صاحب آگئے، اور آکر ''السلام علیکم'' کہا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیئے۔ اب اس وقت بڑا دل کڑھتا ہے کہ یہ خدا کا بندہ ایسے وقت آگیا، بڑی مشکل سے ابھی تو کتابیں دیکھ کر لکھنے کے لئے ذہن بنایا تھا۔ اور یہ صاحب آگئے۔ اور اس کے ساتھ پانچ دس منٹ باتیں کیں، اتنے میں جو کچھ ذہن میں آیا تھا، وہ سب نکل گیا۔ اب اس کو از سرِ نو ذہن میں جمع کیا۔ اس طرح صبح سے شام تک یہ دھندہ ہوتا رہتا ہے۔ ایسے وقت میں بڑی کڑھن ہوتی تھی کہ ہم نے سوچا تھا کہ اس وقت میں اتنا کام ہو جائے گا۔ دو تین صفحے لکھ لیں گے۔ لیکن صرف چند سطروں سے زیادہ کام نہیں ہوا۔۔ اللہ تعالیٰ حضرت ڈاکٹر محمد عبدالحیؒ صاحب کے درجات بلند فرمائے۔ فرماتے تھے کہ میاں! یہ بتاؤ کہ یہ کام کیوں کر رہے ہو؟ یہ تصنیف، یہ تدریس، یہ فتویٰ کس کے لئے ہے؟ کیا یہ سب اس لئے ہے کہ تمہاری سوانحِ حیات میں لکھا جائے کہ اتنے ہزار صفحات تصنیف کر گیا۔ اور اتنی بہت سی تصانیف اور کتابیں لکھیں۔ یا اتنے بہت شاگرد پیدا کر دیئے۔ اگر یہ سب کام اس لئے کر رہے ہو تو بے شک اس پر افسوس کرو کہ اس شخص کی ملاقات کی وجہ سے حرج ہوا۔ اور تعداد میں اتنی کمی ہوگئی۔ جتنے صفحات لکھنے چاہئیں تھے، اتنے نہ لکھے۔ جتنے شاگردوں کو پڑھانا چاہئے تھا، اُتنوں کو نہ پڑھایا، اس پر افسوس کرو۔ لیکن یہ سوچو کہ اس کا حاصل کیا ہے؟ محض لوگوں کی طرف سے تعریف، توصیف، شہرت، پھر تو یہ سب کام اکارت ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں اس کی ایک دھیلہ قیمت نہیں، اور اگر مقصود ان کی رضا ہے کہ وہ راضی ہو جائیں، یہ قلم اس لئے ہل رہا ہے کہ وہ راضی ہو جائیں، ان کے یہاں یہ عمل مقبول ہو جائے، تو جب مقصود ان کی رضا ہے، وہ قلم ہلے، یا نہ ہلے، وہ قلم ہلنے سے راضی ہوں تو قلم ہلانا بہتر ہے، اگر قلم نہ ہلنے سے راضی ہو جائیں تو وہی بہتر ہے، بس دیکھو کہ وقت کا تقاضا کیا ہے۔ تم نے بے شک اپنے ذہن میں یہ منصوبہ بنایا تھا کہ آج دو صفحے ہو جانے چاہئیں۔ لیکن وقت کا تقاضا یہ ہوا کہ ایک ضرورت مند آگیا۔ وہ کوئی مسئلہ پوچھ رہا ہے۔ کوئی اپنی ضرورت لے کر آیا ہے۔ اس کا بھی حق ہے۔ اس کا حق ادا کرو۔ اب وہ اس کا حق ادا کرنے میں راضی ہیں۔ اس سے بات کرنے میں، اس کو مسئلہ بتانے میں وہ راضی ہیں۔ تو پھر گھبرانے کی کیا ضرورت ہے کہ میرا یہ معمول رہ گیا۔ اب تمہاری تصنیف میں اتنا ثواب نہیں، جتنا اس شخص کی حاجت پوری کرنے میں ثواب ہے۔ بس! یہ دیکھو کہ وقت کا تقاضا کیا ہے؟ جس وقت کا جو

تقاضا ہو، اس کے مطابق عمل کرو۔ یہ ہے دین کی فہم اور سمجھ کہ اپنی طرف سے کوئی تجویز نہیں، ہر بات ان کے حوالے ہے۔ وہ جیسا کرا رہے ہیں، انسان ویسا کر رہا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اسی میں راضی ہیں۔ ہر چیز میں یہ دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کس میں ہے۔ اس کے مطابق عمل کرو۔ بیماری ہو تو، سفر ہو تو، حضر ہو تو، صحت ہو تو، ہر حالت میں ان کی رضا کی فکر کرو۔ اس لئے یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ ہم نے منصوبے بنائے تھے۔ وہ منصوبے ٹوٹ گئے۔ ارے وہ منصوبے تو تھے ہی ٹوٹنے کے لئے۔ انسان کیا اور اس کا منصوبہ کیا؟ منصوبہ تو انہی کا چلتا ہے۔ کسی کا منصوبہ نہیں چلتا۔ جب بیماری آئیگی تو منصوبہ ٹوٹے گا۔ سفر آئے گا تو منصوبہ ٹوٹے گا۔ جب عوارض پیش آئیں گے تو منصوبہ ٹوٹے گا۔ منصوبوں کے پیچھے مت چلو۔ ان کی رضا کو دیکھو۔ انشاء اللہ مقصد حاصل ہو جائے گا۔

حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ

حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار نہ ملا۔ کون مسلمان ایسا ہوگا جس کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت اور دیدار کی خواہش نہ ہو۔ خواہش تو کیا؟ تڑپ نہ ہو۔ جب کہ دیدار ہو بھی سکتا ہو۔ آپ کے عہد مبارک میں موجود بھی ہو۔ لیکن سرکار کی طرف سے حکم یہ ہو گیا کہ تمہیں دیدار نہیں کرنا۔ تمہیں اپنی ماں کی خدمت کرنی ہے۔ اب ماں کی خدمت ہو رہی ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار چھوڑا جا رہا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ ان کو یہ فرما دیا کہ فائدہ اس میں ہے کہ ہمارا حکم مانو، ہمارا حکم یہ ہے کہ مدینہ نہ جاؤ۔ ہمارا حکم یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر نہ ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نہ کرو۔ بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کہی ہوئی بات پر عمل کرو۔ اب ماں کی خدمت کر رہے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار سے محروم ہیں۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت پر عمل کیا، اور دیدار سے محروم رہے تو جو لوگ دیدار سے بہرہ ور ہوئے تھے، جن کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار ہوا تھا یعنی صحابہ کرام، وہ آ آ کر حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ سے دعائیں کراتے تھے کہ خدا کے واسطے ہمارے لئے دعا کر دو۔ بلکہ حدیث میں آتا ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ وہاں قرن میں میرا ایک اُمتی ہے۔ جس نے میرے حکم کی خاطر اور اللہ کی رضا کی خاطر میرے دیدار کو قربان کیا ہے۔ اے عمر! وہ جب کبھی مدینہ آئیں تو جا کر ان سے اپنے حق میں دعا کرانا۔ اگر کوئی شوقین ہوتا تو کہتا کہ مجھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار کا شوق ہے۔ اور یہ دیکھے بغیر کہ میری ماں بیمار ہے، اور اس کو میری خدمت کی حاجت ہے، دیدار کے شوق میں چل کھڑا ہوتا۔ کیوں؟ صرف اپنا شوق پورا کرنے کے لئے۔ لیکن وہ اللہ کے بندے ہیں۔ اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے ہوئے ہیں۔ لہٰذا جو آپ نے فرمایا وہ کرتے ہیں۔ میرا شوق کچھ نہیں۔ میری تجویز کچھ نہیں۔ میری رائے کچھ نہیں۔ بلکہ

جوانہوں نے فرمایا، وہی برحق ہے، اس پر عمل کرنا ہے۔[1]

تمام بدعات کی جڑ ـــــ نفس پرستی

اور یہ ساری بدعتیں جتنی رائج ہیں، ان سب کی جڑ یہاں سے کٹتی ہے۔ اگر یہ فہم دل میں پیدا ہو جائے کہ ہمارا شوق کچھ نہیں۔ وہ جو حکم دیں، اس پر عمل کرنا ہے۔ بدعت کے معنی کیا ہیں؟ بدعت کے معنی یہ ہیں کہ ہم خود راستہ نکالیں گے کہ اللہ کو راضی کرنے کا کیا راستہ ہے؟ اللہ تعالیٰ سے نہیں پوچھیں گے۔ ہمیں یہ سمجھ میں آرہا ہے کہ ۱۲ ربیع الاول کو عید میلاد النبی منانا اور میلاد پڑھنا یہ صحیح طریقہ ہے، اپنے دماغ سے یہ راستہ نکالا۔ اور اس پر عمل شروع کر دیا۔ نہ حضور ﷺ نے فرمایا۔ نہ اللہ تعالیٰ نے کہا۔ اور نہ صحابہ کرام نے اس پر عمل کیا۔ بلکہ ہم نے اپنے دماغ سے نکال دیا کہ یہ طریقہ موجبِ ثواب ہے۔ کسی کے مرنے کے بعد اس کا تیجہ کرنا اپنے دماغ سے نکال لیا، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے پوچھے بغیر اس پر چل کھڑا ہو، اسی کا نام بدعت ہے۔ اسی کے بارے میں فرمایا:

((كُلُّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ))[2]

''ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے''

اب بظاہر دیکھنے میں تیجہ ایک اچھا عمل ہے کہ بیٹھ کر قرآن شریف پڑھ رہے ہیں۔ کھانا پکا کر لوگوں میں تقسیم کر رہے ہیں۔ اس میں کیا حرج ہے؟ اور اس میں کیا گناہ ہیں؟ گناہ اس میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے پوچھے بغیر کیا ہے۔ اور جو کام بظاہر نیک ہو، لیکن ان کے بتائے ہوئے طریقے کے خلاف کیا جائے، وہ اللہ کے ہاں قبول نہیں۔

میرے محبوب مری ایسی وفا سے توبہ
جو ترے دل کی کدورت کا سبب بن جائے

یعنی جو چیز بظاہر وفاداری نظر آرہی ہے، لیکن حقیقت میں تیرے دل کی کدورت کا سبب بن رہی ہے، ایسی وفاداری سے توبہ مانگتا ہوں۔ اور اسی کا نام بدعت ہے۔ جس حال میں اللہ تعالیٰ رکھیں، بس! اسی حال میں خوش رہو۔ اور اس کا تقاضا پورا کرو۔

---

(۱) صحيح مسلم، كتاب الفضائل، باب من فضائل اويس القرني رضي الله عنه، رقم: ٤٦١٢، مسند احمد، أول مسند عمر بن الخطاب، رقم: ٢٥٧۔

(۲) سنن النسائي، كتاب صلاة العيدين، باب كيف الخطبة، رقم: ١٥٧٨۔ سنن أبي داؤد، كتاب السنة، باب في لزوم السنة، رقم: ٣٩٩١۔ سنن ابن ماجه، المقدمة، باب اجتناب البدع والجدل، رقم: ٤٥

اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دو

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا اچھی بات ارشاد فرمائی کہ ؎

چونکہ بر میخت ببندد بستہ باش
چوں کشاید چابک و برجستہ باش

وہ اگر تمہیں ہاتھ پاؤں باندھ کر ڈال دیں تو بندھے پڑے رہو۔ اور جب کھول دیں تو پھر چھلانگیں لگاؤ۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہی تلقین فرما رہے ہیں کہ بیماری کی وجہ سے گھبراؤ نہیں، رخصت پر عمل کرنا بھی بڑا ثواب کا کام ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے کہ میرے بندے نے میری دی ہوئی رخصت پر عمل کیا۔ اور اس رخصت کو بھی پورے اہتمام کے ساتھ استعمال کرو۔ اللہ تعالیٰ یہ بات ہمارے دلوں میں اُتار دے۔ آمین

شکر کی اہمیت اور اس کا طریقہ

اس باب کی آخری حدیث ہے:

((عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ اللّٰهَ لَيَرْضَى عَنِ الْعَبْدِ أَنْ يَأْكُلَ الْاَكْلَةَ فَيَحْمَدُهُ عَلَيْهَا أَوْ يَشْرِبَ الشَّرْبَةَ فَيَحْمَدُهُ عَلَيْهَا))(۱)

''حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس بندے کو بہت پسند فرماتے ہیں اور اس سے راضی ہو جاتے ہیں جو بندہ کوئی لقمہ کھاتا ہے تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہے اور پانی کا کوئی گھونٹ پیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے''

مطلب یہ ہے کہ جو بندہ اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت پر کثرت سے شکر ادا کرتا رہتا ہے، اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہو جاتے ہیں۔

یہ بات بار بار عرض کر چکا ہوں کہ شکر سو عبادتوں کی ایک عبادت ہے۔ اور ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ کہاں کرو گے مجاہدات اور ریاضتیں۔ اور کہاں وہ مشقتیں اُٹھاؤ گے جیسی صوفیاء کرام نے اُٹھائیں، لیکن یہ ایک چٹکلا اختیار کر لو کہ ہر بات پر شکر ادا

(۱) صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب استحباب حمد اللہ تعالیٰ بعد الاکل والشرب، رقم: ۲۷۳۴

کرنے کی عادت ڈال لو۔ کھانا کھاؤ تو شکر، پانی پیو تو شکر، ہوا چلے تو شکر، بچہ سامنے آئے، اچھا لگے تو شکر، گھر والوں کو دیکھو، اور دیکھ کر راحت ہو تو شکر ادا کرو۔ شکر ادا کرنے کی عادت ڈالو، اور رٹ لگاؤ "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، یاد رکھو کہ یہ شکر کی عادت ایسی چیز ہے کہ یہ بہت سارے امراضِ باطنی کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔ یہ تکبر، یہ حسد، یہ عجب ان سب کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔ جو آدمی کثرت سے شکر ادا کرتا ہے، وہ عام طور سے تکبر میں مبتلا نہیں ہوتا۔ یہ بزرگوں کا تجربہ ہے۔ بلکہ اس پر نص وارد ہے۔

شیطان کا بنیادی داؤ — ناشکری پیدا کرنا

جب اللہ تعالیٰ نے شیطان کو راندہ درگاہ کیا، اور نکال دیا، تو کم بخت نے جاتے جاتے کہہ دیا کہ مجھے ساری عمر کی مہلت دے دیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو مہلت دے دی۔ اس نے کہا کہ اب میں تیرے بندوں کو گمراہ کروں گا۔ اور ان کو گمراہ کرنے کے لئے دائیں طرف سے آؤں گا، بائیں طرف سے آؤں گا، آگے سے آؤں گا، پیچھے سے آؤں گا۔ چاروں طرف سے ان پر حملے کروں گا، اور ان کو تیرے راستے سے بھٹکاؤں گا۔ اور آخر میں اس نے کہا:

﴿وَلَا تَجِدُ اَکْثَرَھُمْ شَاکِرِیْنَ﴾ (۱)

"میرے بہکانے کے نتیجے میں آپ اپنے بندوں میں سے اکثر کو ناشکرا پائیں گے"

شیطانی داؤ کا توڑ — اداءِ شکر

حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ شیطان کا جو بنیادی داؤ ہے، وہ ہے ناشکری پیدا کرنا۔ اگر ناشکری پیدا ہوگئی تو معلوم نہیں کتنے امراض میں مبتلا ہوگیا، اور اس داؤ کا توڑ شکر کرنا ہے۔ جتنا اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو گے اتنا ہی شیطان کے حملوں سے محفوظ رہو گے۔ اس لئے روحانی بیماریوں سے بچنے کا مؤثر ترین طریقہ یہ ہے کہ ہر وقت اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے، دن رات صبح شام رٹ لگاؤ "اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ" اس سے انشاء اللہ شیطان کے حملوں کا سدباب ہوجائے گا۔

پانی خوب ٹھنڈا پیا کرو

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ میاں اشرف علی!

(۱) الاعراف: ۱۷

جب پانی پیو تو خوب ٹھنڈا پیو۔ تاکہ روئیں روئیں سے اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر نکلے۔ نبی کریم ﷺ نے یہ جو فرمایا کہ مجھے دنیا کی تین چیزیں پسند ہیں۔ ان میں سے ایک ٹھنڈا پانی ہے۔ اور کسی کھانے پینے کی چیز کے بارے میں یہ ثابت نہیں کہ نبی کریم ﷺ کے لئے کوئی خاص چیز کہیں سے منگوائی جارہی ہے۔ لیکن صرف ٹھنڈا پانی تھا جو سرکارِ دو عالم ﷺ کے لئے تین میل کے فاصلے سے آیا کرتا تھا۔ بیئرِ غرس نامی کنواں جواب بھی مدینہ طیبہ میں موجود ہے، اس سے نبی کریم ﷺ کے لئے خاص طور پر ٹھنڈا پانی منگوایا جاتا تھا۔(۱) حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس میں حکمت یہ ہے کہ جب پیاس کی حالت میں ٹھنڈا پانی پیا جائے گا تو روئیں روئیں سے شکر نکلے گا۔

سونے سے پہلے نعمتوں کا استحضار اور ان پر شکر

اور رات کو سونے سے پہلے بیٹھ کر ساری نعمتوں کا استحضار کرلو۔ کہ گھر عافیت کا ہے۔ اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ۔ بستر آرام دہ ہے۔ اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ۔ میں عافیت سے ہوں۔ اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ۔ بچہ عافیت سے ہے۔ اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ۔ ایک ایک نعمت کا استحضار کر کے رٹ لگاؤ۔

حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے یہ چیز اپنے نانا سے سیکھی ہے۔ ایک مرتبہ میں ان کے گھر گیا تو رات کو میں نے دیکھا کہ وہ سونے سے پہلے بستر پر بیٹھے ہوئے ہیں، اور باربار، باربار اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ پڑھ رہے ہیں۔ اور عجیب کیفیت میں یہ عمل کر رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ حضرت! یہ کیا کر رہے ہیں؟ فرمانے لگے: بھائی! سارے دن تو معلوم نہیں کس حالت میں رہتا ہوں، اور یہ پتہ نہیں لگتا کہ شکر ادا ہو رہا ہے یا نہیں، اس وقت بیٹھ کر دن بھر کی ساری نعمتوں کا استحضار کرتا ہوں، اور پھر ہر نعمت پر "اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ" کہتا جاتا ہوں۔

حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب میں نے یہ دیکھا تو اس کے بعد الحمد للہ میں نے بھی اس کو اپنے معمول میں شامل کرلیا، کہ رات کو سوتے وقت سب نعمتوں کا استحضار کر کے شکر ادا کرتا ہوں۔

---

(۱) احیاء علوم الدین (۱/۲۱۲)، آپ ﷺ نے وفات کے بعد بئرِ غرس کے پانی سے غسل کی وصیت فرمائی تھی۔ سنن ابن ماجہ، کتاب ما جاء فی الجنائز، باب ما جاء فی غسل النبی، رقم: ۱۴۵۷

شکرادا کرنے کا آسان طریقہ

اور نبی کریم ﷺ پر قربان جائیں۔آپ نے ہر ہر چیز کے طریقے بتادیئے ہیں۔کہاں تک انسان شکرادا کرے گا۔ بقول شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے فرماتے ہیں کہ ایک سانس پر دو شکر واجب ہیں۔ سانس اندر جائے اور باہر نہ آئے تو موت، اور اگر سانس باہر آئے پھر اندر نہ جائے تو موت، تو ایک سانس پر دو نعمتیں، اور ہر نعمت پر ایک شکر واجب ہے۔اس طرح ہر سانس پر دو شکر واجب ہو گئے۔اس لئے اگر انسان سانس ہی کی نعمت کا شکرادا کرنا چاہے تو کہاں تک کرے گا۔

﴿وَإِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا﴾(۱)

''اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے''

اس لئے سرکارِ دو عالم ﷺ نے شکرادا کرنے کا ایک آسان طریقہ بتادیا اور چند کلمات تلقین فرمادیئے۔ ہر مسلمان کو یاد کر لینے چاہئیں۔فرمایا:

((اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا دَائِمًا مَعَ دَوَامِكَ، وَخَالِدًا مَعَ خُلُوْدِكَ، وَلَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا لَا مُنْتَهٰى لَهٗ دُوْنَ مَشِيَّتِكَ، وَلَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا لَا يُرِيْدُ قَائِلُهٗ اِلَّا رِضَاكَ))(۲)

''اے اللہ! آپ کا شکر ہے۔ایسا شکر کہ جب تک آپ ہیں، اس وقت تک وہ شکر جاری رہے، اور جس طرح آپ جاوداں ہیں، اسی طرح وہ شکر بھی جاوداں رہے۔اور آپ کی مشیت کے آگے جس کی کوئی انتہا نہ ہو۔اور آپ کی ایسی حمد کرتا ہوں، جس کے کہنے والے کو سوائے آپ کی رضا کے کچھ اور مطلوب نہیں''

اور دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا:

((اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ زِنَةَ عَرْشِكَ، وَمِدَادَ كَلِمَاتِكَ، وَعَدَدَ خَلْقِكَ، وَرِضَا نَفْسِكَ))(۳)

میں آپ کا شکر کرتا ہوں جتنا آپ کے عرش کا وزن ہے۔اور اتنا شکرادا کرتا ہوں جتنی آپ کے کلمات کی سیاہی ہے۔قرآن کریم میں ہے کہ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے تمام کلمات کو لکھنا چاہے، اور ساتوں کے ساتوں سمندر اس کے لئے سیاہی بن جائیں اور اس سے اللہ تعالیٰ کے کلمات لکھے جائیں تو

---

(۱) النحل:۱۸

(۲) کنزالعمال، (۲/۲۲۳)، رقم: ۳۸۵۷

(۳) سنن أبی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب التسبیح بالخفی، رقم الحدیث: ۱۲۸۵

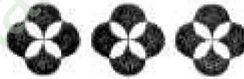
سارے سمندر خشک ہو جائیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے کلمات ختم نہ ہوں۔ تو آپ کے کلمات لکھنے کے لئے جتنی سیاہی درکار ہو سکتی ہے، اس کے بقدر شکر ادا کرتا ہوں۔ اور جتنی آپ کی مخلوقات ہیں، یعنی انسان، جانور، درخت، پتھر، جمادات، نباتات سب جتنی مقدار میں ہیں، اس کے برابر شکر ادا کرتا ہوں۔ اور آخر میں فرمایا کہ اتنا شکر ادا کرتا ہوں جس سے آپ راضی ہو جائیں۔ اب اس سے زیادہ انسان اور کیا کہہ سکتا ہے، لہٰذا رات کو سوتے وقت ہر شخص کو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ اور یہ کلمات کہہ لینے چاہئیں:

((اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ مَلِيًّا عِنْدَ طَرْفَةِ كُلِّ عَيْنٍ، وَتَنَفُّسِ نَفْسٍ))[1]

"اے اللہ! آپ کی تعریف اور آپ کا شکر ہے ہر آنکھ جھپکنے کے وقت اور ہر سانس لینے کے وقت"

بہر حال! یہ شکر کے کلمات جو نبی کریم ﷺ نے تلقین فرمائے ہیں، یاد کر لینے چاہئیں۔ اور رات کو سوتے وقت ان کلمات کو پڑھ لینا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.



(۱) کنز العمال، (۲/۲۲۳)، رقم: ۳۸۵۷

اللہ تعالیٰ کا حکم بے چون و چرا تسلیم کرلو ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
﴿وَاعْلَمُوْا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ط لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ط اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ o فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ط وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ﴾(۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! سورۃ الحجرات کی تفسیر کا بیان چل رہا ہے، گزشتہ دو تین جمعوں میں آیت نمبر چھ کی تفسیر آپ کے سامنے پیش کی تھی، جس میں باری تعالیٰ نے فرمایا کہ جب کوئی فاسق شخص کوئی خبر لے کر آئے تو تمہارا فرض ہے کہ پہلے اس کی تحقیق کرلو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اس غلط خبر کی بنیاد پر کسی شخص کو نقصان پہنچادو، اور بعد میں تمہیں پشیمانی اور ندامت ہو۔ اس کا بقدرِ ضرورت بیان الحمدللہ پچھلے دو تین جمعوں میں ہو چکا۔

تمہاری رائے کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے سے مختلف ہونا

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم بات کی طرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو متوجہ فرمایا ہے، اور صحابہ کرام کے واسطے سے پوری اُمتِ مسلمہ کو متوجہ فرمایا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے

☆ اصلاحی خطبات (۱۶/ ۲۹۷۔۳۰۶)، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) الحجرات: ۷۔۸، آیاتِ مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: اور یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ تمہارے درمیان اللہ کے رسول موجود ہیں، بہت سی باتیں ہیں جن میں وہ اگر تمہاری بات مان لیں تو خودتم مشکل میں پڑ جاؤ۔ لیکن اللہ نے تمہارے دل میں ایمان کی محبت ڈال دی ہے اور اسے تمہارے دلوں میں پُرکشش بنادیا ہے اور تمہارے اندر کفر کی اور گناہوں اور نافرمانی کی نفرت بٹھادی ہے۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو ٹھیک ٹھیک راستے پر آچکے ہیں، جو اللہ کی طرف سے فضل اور نعمت ہے، اور اللہ علم کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک۔"

خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ بات یاد رکھو کہ تمہارے درمیان اللہ کے رسول (ﷺ) موجود اور تشریف فرما ہیں، اگر ہمارے رسول (ﷺ) بہت سی باتوں میں تمہاری اطاعت کرنے لگیں، یعنی جیسا تم کہو، ویسا ہی وہ کر لیں تو تم سخت مصیبت میں مبتلا اور پریشان ہو جاؤ گے۔ اس کے ذریعہ یہ بتلانا مقصود ہے کہ بعض اوقات ایسے واقعات پیش آسکتے ہیں جن میں تمہاری ذاتی رائے رسول اللہ ﷺ کی رائے سے مختلف ہوگی، مثلاً آپ ﷺ کسی بات کا حکم دے رہے ہوں، اور تمہاری سمجھ میں وہ بات نہ آرہی ہو، یا ایسا ہو سکتا ہے کہ تمہارے دل میں ایک تقاضا پیدا ہوا کہ یہ معاملہ یوں ہونا چاہئے، اور تم نے اپنی وہ رائے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کر دی، اور حضور ﷺ نے تمہاری وہ رائے نہیں مانی، اور فرمایا کہ میں تمہاری رائے پر عمل نہیں کرتا، تو ایسی صورت میں یہ خیال دل میں پیدا ہو سکتا ہے کہ حضور اقدس ﷺ جو کچھ فرما رہے ہیں، یا آپ جس بات کا حکم دے رہے ہیں، وہ ہماری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔

خبر کی تحقیق کر لینی چاہئے

جیسا کہ وہ واقعہ جو میں نے گزشتہ آیت کی تفسیر میں عرض کیا تھا کہ جب حضور اقدس ﷺ نے حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے قبیلہ بنوالمصطلق کی طرف بھیجا، اور وہ صحابہ غلط فہمی میں یہ سمجھ کر واپس آگئے کہ جن لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرنے جا رہا ہوں، وہ میرے دشمن ہیں، اور وہ مجھے قتل کرنے کے لئے آبادی سے باہر نکلے ہیں۔ اور انہوں نے واپس آکر حضور ﷺ کو یہ بات بتادی تو اس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بہت جوش آیا کہ حضور ﷺ کا ایک نمائندہ جس کو زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے بھیجا گیا، اور ان لوگوں نے خود بلایا کہ ہمارے پاس زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے ایک آدمی بھیج دیں، پھر وہ لوگ ایسی غداری کریں کہ اس قاصد کو قتل کرنے کے لئے آبادی سے باہر آجائیں، اس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بہت غصہ آیا، اور بہت صدمہ پہنچا، اور جوش و خروش کے عالم میں انہوں نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ اب یہ لوگ اس لائق نہیں کہ ان کے ساتھ نرمی برتی جائے، آپ فوراً ان پر چڑھائی کا حکم دیں، اور ان پر حملہ کر کے ان سے جنگ کریں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ پہلے ہمیں اس خبر کی تحقیق کرنی چاہئے، اس کے بعد کوئی اقدام کرنا چاہئے، چنانچہ آپ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو معاملے کی تحقیق کے لئے بھیجا۔

تحقیق کے نتیجے میں بات واضح ہو گئی

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے بعض کے دل میں یہ خیال آرہا تھا کہ یہ تو بالکل واضح بات ہے کہ

انہوں نے غداری کی ہے، اور حضور ﷺ کے نمائندے کی توہین کی ہے، لہٰذا اس بارے میں زیادہ تحقیق اور غور وفکر کی ضرورت نہیں تھی، براہِ راست ان پر حملہ کر دینا چاہئے تھا۔ لیکن حضور ﷺ نے صحابہ کرام کی بات نہیں مانی، اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو پہلے تحقیق کے لئے بھیجا، جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر حضور ﷺ تمہاری بات مان لیتے، اور فوراً حملہ کر دیتے تو بے گناہ لوگ قتل ہو جاتے، کیونکہ حقیقت میں وہ لوگ حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کے ارادے سے شہر سے باہر نہیں نکلے تھے، بلکہ وہ تو ان کے استقبال کے لئے باہر نکلے تھے، وہ تو کسی نے آکر غلط خبر دیدی تھی کہ ان کے قتل کے ارادے سے نکلے ہیں۔ (۱)

رسول براہِ راست اللہ تعالیٰ کی ہدایت پر چلتے ہیں

اگر حضورِ اقدس ﷺ تمہاری ہر بات کو مانا کریں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہیں ہی نقصان پہنچے گا، اور تم خود ہی مشکل میں پڑ جاؤ گے، اور مصیبتوں میں گرفتار ہو جاؤ گے۔ اس کے ذریعے اس بات کی طرف اشارہ فرما دیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ایک رسول بھیجا ہے، وہ رسول ﷺ جن کا ہر وقت اللہ تعالیٰ سے رابطہ قائم ہے، جن پر صبح و شام وحی نازل ہو رہی ہے، جنہیں وہ باتیں بتائی جا رہی ہیں جو تمہارے علم میں نہیں ہیں، وہ احکام دیے جا رہے ہیں جو بسا اوقات تمہاری سمجھ میں نہیں آتے، اگر وہ تمہارے پیچھے چلنے لگیں، اور جیسا تم کہو، ویسا ہی وہ کرنے لگیں تو پھر رسول بھیجنے کا منشا ہی فوت ہو گیا، پھر رسول بھیجنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ رسول تو بھیجا ہی اس لئے جا رہا ہے تاکہ وہ ان باتوں کے بارے میں تمہیں بتائیں جو بسا اوقات تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ اس لئے یہ نہ سمجھنا کہ رسول اللہ ﷺ کا کوئی حکم یا آپ کا کوئی اقدام، یا آپ کا کوئی عمل تمہاری سمجھ میں نہیں آرہا ہے تو تم اس پر اعتراض کرنے بیٹھ جاؤ، یا تمہارے دل میں اس پر شبہات پیدا ہونے لگیں۔ ارے رسول تو اسی لئے بھیجا گیا ہے کہ وہ ان باتوں کو بتائے جو تم خود اپنی سمجھ سے اور اپنی عقل سے سمجھ نہیں سکتے۔

عقل ایک حد تک صحیح فیصلہ کرتی ہے

دیکھئے! اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل دی ہے، اور یہ عقل اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے، اگر انسان اس کو صحیح استعمال کرے تو اس سے دنیا و آخرت کے بہت سے فوائد انسان کو حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن یہ مت سمجھنا کہ یہ عقل جو تمہیں دی گئی ہے، یہ ساری کائنات کی تمام حکمتوں کا احاطہ کر سکتی ہے، یہ عقل بڑی کام کی چیز ہے، لیکن اس کی بھی کچھ حدود ہیں، یہ لامحدود نہیں، ایک حد تک یہ کام کرتی ہے، اس حد

(۱) تفسیر ابن کثیر (۲۶۵/۴)

سے آگے یہ کام کرنا بند کر دیتی ہے۔ جیسے آنکھ ہے، یہ بڑے اعلیٰ درجے کی نعمت ہے، لیکن ایک حد تک دیکھے گی، جہاں تک نظر آئے گا، اس سے آگے نہیں دیکھے گی۔ اسی طرح عقل کی بھی ایک حد ہے، اس حد تک وہ کام کرتی ہے، اس حد سے آگے وہ کام نہیں کرتی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور پیغمبر کو ان باتوں کی تعلیم کے لئے بھیجا ہے، جہاں انسان کی عقل کام نہیں کر سکتی، جہاں انسان کی عقل دھوکہ کھا سکتی ہے، ٹھوکر کھا سکتی ہے، اس موقع پر اللہ کا رسول ہی بتاتا ہے کہ وہ بات صحیح نہیں جو تم سمجھ رہے ہو، صحیح بات وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجھے وحی کے ذریعہ بتائی۔

رسول کا حکم مانو، چاہے عقل میں آئے یا نہ آئے

جب یہ بات ہے تو اللہ کا رسول جب کوئی بات بتائے، یا کسی بات کا حکم دے، اور تمہاری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ یہ حکم کیوں دیا؟ اس حکم کی حکمت اور مصلحت سمجھ میں نہیں آرہی ہے تو ایسی صورت میں اگر تم اپنی عقل کے پیچھے چلو گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے رسول کو رسول ماننے سے انکار کر دیا، رسول تو بھیجا ہی اس لئے گیا تھا کہ جہاں تمہاری عقل کام نہیں کر رہی تھی، وہاں پر رسول وحی کی رہنمائی سے تمہیں بہرہ ور کرے۔ اس سے ہمیں یہ ہدایت ملی کہ جب نبی کریم ﷺ ہمیں کسی بات کا حکم دیدیں، چاہے قرآن کریم کے ذریعہ حکم دیں، یا حدیث کے ذریعہ حکم دیں کہ فلاں کام کرو، یا فلاں کام نہ کرو، تو اب چاہے وہ حکم تمہاری سمجھ میں آرہا ہو، یا نہ آرہا ہو، اس حکم کی علت، اور اس کی حکمت، اور فائدہ تمہاری سمجھ میں نہ آرہا ہو، پھر بھی تمہارے ذمہ لازم ہے کہ اس پر عمل کرو۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ﴾ (۱)

یعنی اللہ اور اللہ کا رسول جب کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو پھر کسی مؤمن مرد یا عورت کو اس کے ماننے یا نہ ماننے کا اختیار نہیں رہتا۔ اگر مؤمن ہے تو پھر اس حکم کو ماننا ہی ہوگا، اور یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ میری عقل ناقص ہے، اور اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی حکمت کامل ہے، لہٰذا مجھے اس کے آگے سر جھکانا ہے۔

''حکمت'' اور ''فائدے'' کا سوال

آج ہمارے دور میں یہ ذہنیت بہت کثرت سے پھیلتی جارہی ہے کہ جب لوگوں کو شریعت کا کوئی حکم بتایا جائے کہ فلاں چیز حرام ہے، قرآن کریم نے اس کو منع کیا ہے، یا اللہ کے رسول ﷺ نے

(۱) الاحزاب: ۳۶

اس کو منع کیا ہے تو لوگ فوراً یہ سوال کرتے ہیں کہ کیوں منع کیا ہے؟ اس منع کرنے میں کیا حکمت اور کیا فائدہ ہے؟ گویا کہ وہ زبانِ حال سے یہ کہتے ہیں کہ جب تک ہماری سمجھ میں اس کا فلسفہ نہیں آئے گا، اور اس کی حکمت اور فائدہ ہماری عقل میں نہیں آئے گا، اس وقت تک ہم اس حکم پر عمل نہیں کریں گے۔ العیاذ باللہ العظیم۔ یہ ذہنیت عام ہو چکی ہے، خاص طور پر وہ لوگ جو ذرا پڑھ لکھ گئے، تھوڑی بہت تعلیم حاصل کر لی تو اب شریعت کے ہر حکم کے بارے میں یہ سوال کرتے ہیں یہ کیوں ہے؟ اس میں کیا حکمت ہے؟ اور جب تک حکمت معلوم نہیں ہوتی اس وقت تک ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

ایسا ''نوکر'' ملازمت سے نکال دینے کے قابل ہے

حالانکہ اگر دیکھا جائے تو اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے حکم کے آگے ''کیوں'' کا سوال کرنا انتہاء درجے کی بے عقلی کی بات ہے، اس لئے کہ ہم تو اللہ کے بندے ہیں، اور ''بندہ'' بہت ادنیٰ درجہ کی چیز ہوتا ہے۔ دیکھئے! ایک ہوتا ہے ''غلام'' اور ایک ہوتا ہے ''نوکر''۔ ان میں ترتیب اس طرح ہے کہ سب سے اعلیٰ ''نوکر'' دوسرے درجہ میں ''غلام'' اور تیسرے درجہ میں ''بندہ''۔ اگر کسی نے کسی کو نوکر رکھا ہے تو وہ خاص کاموں کے لئے اور خاص اوقات کے لئے ہوتا ہے، وہ نوکر چوبیس گھنٹے کا غلام نہیں ہوتا، بلکہ وہ صرف آٹھ گھنٹے کام کرے گا، اور متعین کام کرے گا، اب اگر آپ نے نوکر سے کہا کہ آج بازار سے دس کلو گوشت لے آؤ، اب وہ نوکر آپ سے یہ سوال کرے کہ دس کلو گوشت کیوں لاؤں؟ آپ کے گھر میں دو افراد ہیں، ایک کلو گوشت بھی بہت ہوتا ہے، پہلے یہ بتائیں کہ یہ دس کلو گوشت کیوں منگوا رہے ہیں؟ پھر میں لاؤں گا۔ بتایئے! کیا وہ نوکر اس لائق ہے کہ اس کو گھر میں رکھا جائے؟ یا اس لائق ہے کہ کان سے پکڑ کر اس کو باہر نکال دیا جائے؟ ارے بھائی تیرا یہ کام نہیں کہ تو ہم سے پوچھے کہ کیوں یہ چیز منگوا رہے ہو؟ تیرے کو اس لئے رکھا ہے کہ جب ضرورت ہوگی تو باہر سے سودا منگوایا کریں گے، تم اگر کیوں کا سوال کرتے ہو تم نوکر رہنے کے لائق نہیں۔ حالانکہ وہ تمہارا نوکر ہے، تمہارا غلام نہیں ہے، تمہارا بندہ نہیں ہے، آپ بھی مخلوق ہیں، وہ بھی مخلوق ہے، آپ بھی انسان ہیں، وہ بھی انسان ہے، آپ کے اندر بھی اتنی عقل ہے، جتنی عقل اس کے اندر ہے، اس کے باوجود آپ اس کے ''کیوں'' کا سوال گوارا نہیں کرتے۔

ہم اللہ کے ''بندے'' ہیں

جبکہ آپ تو اللہ کے ''بندے'' ہیں، نوکر نہیں ہیں، غلام نہیں ہیں، اللہ نے آپ کو پیدا کیا ہے، اللہ آپ کا خالق ہے، آپ اس کی مخلوق ہیں، اور آپ کی عقل اور اس کی حکمت میں کوئی مناسبت ہی

نہیں، آپ کی عقل محدود ہے، اس کی حکمت اور سمجھ لامحدود ہے، جب وہ خالق و مالک یہ کہتا ہے کہ فلاں کام کرو، آپ کہتے ہیں کہ میں یہ کام کیوں کروں؟ جب آپ اپنے نوکر سے یہ برداشت نہیں کرتے کہ وہ آپ سے ''کیوں'' کا سوال کرے تو اللہ تبارک وتعالیٰ سے ''کیوں'' کا سوال کرتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی؟ تم اپنے خالق سے، اپنے مالک سے، اپنے آقا سے، اپنے پیدا کرنے والے سے یہ پوچھ رہے ہو کہ وہ یہ حکم کیوں دے رہے ہیں؟ یہ انتہاء درجے کی بے غیرتی کی بات ہے، انتہاء درجے کی بے شرمی کی بات ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر ''کیوں'' کا سوال کیا جائے۔

''کیوں'' کا سوال بے عقلی کی دلیل ہے

یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم بھی حکمت سے خالی نہیں ہوتا، لیکن ضروری نہیں کہ وہ حکمت تمہاری سمجھ میں بھی آجائے۔ لہٰذا اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے آگے سر جھکائے بغیر انسان مؤمن نہیں ہوسکتا۔ اگر وہ ''کیوں'' کا سوال کرتا ہے تو وہ درحقیقت بے عقلی کا سوال ہے۔ اگر ہر بات تمہاری عقل میں آجایا کرتی، اور اپنے ہر اچھے برے کو تم پہچان سکتے تو اللہ تعالیٰ کو نہ پیغمبر بھیجنے کی ضرورت تھی، نہ آسمان سے کوئی کتاب نازل کرنے کی ضرورت تھی، اور نہ دنیا میں وحی کا سلسلہ قائم کرنے کی ضرورت تھی۔ یہ سب اس لئے کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ تمہاری عقل چھوٹی سی ہے، اور بہت محدود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک کی عقل کچھ کہہ رہی ہے، اور دوسرے کی عقل کچھ کہہ رہی ہے۔ ایک کی عقل میں ایک بات آرہی ہے، دوسرے کی عقل میں نہیں آرہی۔ یہ سب عقل کے محدود ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنا حکم اسی جگہ بھیجتا ہے جہاں عقل کی پرواز رُک جاتی ہے۔ اس لئے قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ نہ تو یہ ہونا چاہئے کہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے بارے میں یہ سوال کرو کہ یہ کیوں دیا جارہا ہے؟ اور یہ حکم ہماری سمجھ میں نہیں آرہا ہے، اور اس کے نتیجے میں اس حکم کو چھوڑ بیٹھو، اور نہ یہ ہونا چاہئے کہ جو کچھ تمہاری سمجھ میں آرہا ہے، اللہ کا رسول اس کو مانتا رہے کہ جو تم کہہ رہے ہو، وہ درست ہے۔

آج کل کے لیڈروں کا حال

آج کل کے لیڈروں کا معاملہ اُلٹا ہوگیا ہے۔ ''لیڈر'' اور ''قائد'' اس کو کہا جاتا ہے جو قوم کو لے کر چلیں، اور ان کی رہنمائی کریں۔ اگر ساری قوم ایک غلط راستے پر جارہی ہے، اور وہ لیڈر جانتا ہے کہ وہ غلط راستے پر جارہی ہے تو وہ ان کو بتائے گا کہ یہ راستہ صحیح نہیں ہے، صحیح راستہ یہ ہے۔ لیکن آج کا قائد اور رہنما عوام کے پیچھے چلتا ہے، جس سے عوام خوش ہوجائے، جس سے اس کو عوام کے ووٹ

مل جائیں، لہٰذا بعض اوقات وہ جانتا ہے کہ یہ بات صحیح نہیں ہے، مصلحت کے مطابق نہیں ہے، لیکن چونکہ اس کو عوام کی رضامندی مطلوب ہوتی ہے، اس لئے وہ ویسا ہی کرتا ہے جیسا عوام چاہتے ہیں۔

صلح حدیبیہ میں دب کر صلح کیوں کی گئی؟

صلح حدیبیہ کے واقعے کو دیکھئے! صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جوش و خروش کی حالت میں ہیں کہ ہم حق پر ہیں اور کفار سے مقابلہ کر کے ان کو شکست دے سکتے ہیں تو پھر دب کر صلح کیوں کی جا رہی ہے؟ لیکن اللہ کا رسول ڈٹا ہوا ہے کہ اس وقت اللہ کا حکم یہی ہے کہ صلح کرلو، چاہے بظاہر دب کر صلح ہوتی نظر آ رہی ہو، تب بھی یہی کرنا ہے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تو لوگوں کو خوش کرنے کی خاطر فرما دیتے کہ چلو، جنگ کرو۔ لیکن اس وقت اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ صلح ہو جائے۔ تمام صحابہ کی باتوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رد کر دیا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جیسے انسان تڑپتے پھر رہے ہیں کہ یا اللہ! یہ کیا ہو گیا؟ ہم اتنی دب کر دشمن سے صلح کر رہے ہیں۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاتے ہیں، اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس جاتے ہیں کہ یہ کیا معاملہ ہو رہا ہے؟ لیکن اللہ کا رسول اپنے موقف پر ڈٹا ہوا ہے، کیونکہ اللہ کی وحی کے ذریعہ اس کو یہی حکم ملا ہے۔

خلاصہ

بہر حال! یہ آیتِ کریمہ یہ سبق دے رہی ہے کہ جب اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی حکم آ جائے، یا آپ کا کوئی فیصلہ آ جائے تو محض سمجھ میں نہ آنے کی وجہ سے اس کے خلاف شکوک و شبہات کو دل میں جگہ نہ دو۔ صحیح راستہ وہی ہے جو انہوں نے بتایا۔ اگر وہ تمہاری ہر بات ماننے لگیں گے تو تم خود پریشانی میں مبتلا ہو جاؤ گے، تم خود دکھ اُٹھاؤ گے، انجام کار تمہارے لئے نقصان کا سبب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ یہ حقیقت ہمارے دلوں میں ذہن نشین فرما دے کہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم ہی درحقیقت بلند و بالا ہے، چاہے وہ ہماری سمجھ میں آ رہا ہو، یا نہ آ رہا ہو، اگر ہمیں یہ بات حاصل ہو جائے تو بے شمار اشکالات اور شبہات اور وسوسے جو دلوں میں پیدا ہوتے رہتے ہیں، وہ سب ختم ہو جائیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.



تقدیر پر راضی رہنا چاہئے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

عَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((اِحْرِصْ عَلٰى مَا يَنْفَعُكَ وَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ وَلَا تَعْجِزْ، وَإِنْ أَصَابَكَ شَيْءٌ فَلَا تَقُلْ لَوْ أَنِّیْ فَعَلْتُ لَكَانَ كَذَا وَكَذَا، وَلٰكِنْ قُلْ: قَدَّرَ اللّٰهُ وَمَا شَآءَ فَعَلَ، فَإِنَّ "لَوْ" تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّيْطَانِ))(۱)

دنیا کی حرص مت کرو

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ان کاموں کی حرص کرو جو تم کو نفع پہنچانے والے ہیں۔

مقصد یہ ہے کہ وہ اعمال اور وہ افعال جو آخرت میں نفع کا سبب بن سکتے ہیں ان کے اندر حرص کرو۔ دیکھئے! ویسے تو حرص بُری چیز ہے اور اس سے منع فرمایا گیا ہے کہ مال کی حرص، دنیا کی حرص، شہرت کی حرص، نام ونمود کی حرص، دولت کی حرص مت کرو اور انسان کے لئے یہ بہت بڑا عیب ہے کہ وہ ان چیزوں کی حرص کرے بلکہ ان تمام چیزوں میں قناعت اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اور فرمایا گیا ہے کہ ان میں سے جو کچھ تمہیں جائز طریقے سے کوشش کرنے کے نتیجے میں مل رہا ہے اس پر قناعت کرو اور یہ سمجھو کہ میرے لئے یہی بہتر تھا۔ مزید کی حرص کرنا کہ مجھے اور زیادہ مل جائے، یہ درست نہیں اور اس حرص سے بچو، کیونکہ دنیا میں کوئی بھی شخص اپنی ساری خواہشات کبھی پوری نہیں کرسکتا۔ "کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد" بڑے سے بڑا بادشاہ، بڑے سے بڑا سرمایہ دار ایسا نہیں ملے گا جو یہ

☆ اصلاحی خطبات (۷/۱۹۱۔۲۲۲)، یکم جولائی، ۱۹۹۵ء، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) صحيح مسلم، كتاب القدر، باب فى الامر بالقوة وترك العجز والاستعانة بالله، رقم: ٤٨١٦، سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، رقم: ٤١٥٨

کہہ دے کہ میری ساری خواہشات پوری ہوگئی ہیں۔ بلکہ حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ اگر ابنِ آدم کو ایک وادی سونے کی بھر کر مل جائے تو وہ یہ چاہے گا کہ دو مل جائیں۔ اور جب دو مل جائیں گی تو پھر خواہش کرے گا کہ تین ہو جائیں۔ اور ابنِ آدمی کا پیٹ سوائے مٹی کے اور کوئی چیز نہیں بھر سکتی۔ جب قبر میں جائے گا تو قبر کی مٹی اس کا پیٹ بھرے گی، دنیا کے اندر کوئی چیز اس کا پیٹ نہیں بھرے گی۔ (۱)

البتہ ایک چیز ہے جو اس کا پیٹ بھر سکتی ہے، وہ ہے ''قناعت'' یعنی جو کچھ اس کو اللہ تعالیٰ نے جائز اور حلال طریقے سے دے دیا ہے، اس پر قناعت کرلے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے، اس کے سوا پیٹ بھرنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔

دین کی حرص پسندیدہ ہے

لہٰذا دنیا کی چیزوں میں حرص کرنا بُرا ہے اور اس سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن دین کے کاموں میں، اچھے اعمال میں، عبادات میں حرص کرنا اچھی چیز ہے۔ مثلاً کوئی شخص نیک کام کر رہا ہے، اس کو دیکھ کر یہ حرص کرنا کہ میں بھی یہ نیک کام کروں۔ یا فلاں شخص کو دین کی نعمت حاصل ہے مجھے بھی یہ نعمت حاصل ہو جائے۔ ایسی حرص مطلوب ہے اور محبوب اور پسندیدہ ہے۔ اس لئے اس حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ ایسے کاموں کی حرص کرو جو آخرت میں نفع دینے والے ہیں۔ اور قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ﴾ (۲)

''نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو''

حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور نیک کاموں کی حرص

حضرت صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نیکیوں میں بڑے حریص تھے اور ہر وقت اس فکر میں رہتے تھے کہ کسی طرح ہمارے نامۂ اعمال میں نیکی کا اضافہ ہو جائے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے تو انہوں نے ان کو یہ حدیث سنائی کہ حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱) صحيح البخاری، كتاب الرقاق، باب ما يتقى من فتنة المال، رقم: ٥٩٥٦، صحيح مسلم، كتاب الزكاة، رقم: ١٧٣٩، سنن الترمذی، كتاب المناقب عن رسول الله، رقم: ٣٧٢٦

(۲) المائدة: ٤٨

''اگر کوئی شخص کسی مسلمان کی نمازِ جنازہ میں شریک ہو تو اس کو ایک قیراط اجر ملتا ہے۔اور اگر اس کے دفن میں بھی شریک رہے تو اس کو دو قیراط ملتے ہیں''

''قیراط'' اس زمانے میں سونے کا ایک مخصوص وزن ہوتا تھا۔آپ ﷺ نے سمجھانے کے لئے قیراط کا لفظ بیان فرمادیا، پھر خود ہی فرمایا کہ آخرت کا وہ قیراط اُحد پہاڑ سے بھی بڑا ہوگا۔ مطلب یہ تھا کہ قیراط سے دنیا والا قیراط مت سمجھ لینا بلکہ آخرت والا قیراط مراد ہے جو اپنی عظمتِ شان کے لحاظ سے اُحد پہاڑ سے بھی زیادہ بڑا ہے۔اور یہ بھی اس اجر کا پورا بیان نہیں ہے۔اس لئے کہ پورا بیان تو انسان کی قدرت میں بھی نہیں ہے کیونکہ انسان کی لغت اس کے بیان کے لئے ناکافی ہے۔اس واسطے یہ الفاظ استعمال فرمائے تاکہ ہماری سمجھ میں آجائے۔ بہر حال، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے جب یہ حدیث سنی تو حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ کیا واقعۃً آپ نے حضورِ اقدس ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے؟ حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے خود یہ حدیث سنی ہے۔اس وقت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: افسوس! ہم نے اب تک بہت سے قیراط ضائع کردیئے۔اگر پہلے سے یہ حدیث سنی ہوتی تو ایسے مواقع کبھی ضائع نہ کرتے۔(۱)

تو تمام صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا یہی حال تھا کہ وہ اس بات کے حریص تھے کہ کسی طرح کوئی نیکی ہمارے نامۂ اعمال میں بڑھ جائے۔

ہم اور آپ وعظوں میں سنتے رہتے ہیں کہ فلاں عمل کا یہ ثواب ہے، فلاں عمل کا یہ ثواب ہے۔ یہ درحقیقت اس لئے بیان کیے جاتے ہیں تاکہ ہمارے دلوں میں ان اعمال کو انجام دینے کی حرص پیدا ہو۔فضیلت والے اعمال، نوافل، مستحبات اگرچہ فرض و واجب نہیں، لیکن ایک مسلمان کے دل میں ان کی حرص ہونی چاہئے کہ وہ ہمیں حاصل ہو جائیں۔جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ دین کی حرص عطا فرماتے ہیں تو ان کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ وہ ہر وقت اس فکر میں رہتے ہیں کہ کسی طرح کوئی نیکی ہمارے نامۂ اعمال میں بڑھ جائے۔

حضور ﷺ کا دوڑ لگانا

حدیث شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ ایک دعوت میں تشریف لے جارہے تھے۔اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی ساتھ تھیں۔ پیدل سفر تھا۔راستے میں ایک جنگل اور میدان پڑتا تھا، اور بے پردگی کا احتمال نہیں تھا اس لئے کہ وہاں کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔حضورِ اقدس ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ اے عائشہ! کیا میرے ساتھ دوڑ لگاؤ گی؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض

(۱) صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب فضل اتباع الجنائز، رقم الحدیث: ۱۲۲۹۔

کیا کہ ہاں! دوڑ لگاؤں گی۔ اس دوڑ لگانے سے ایک طرف تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی دلجوئی مقصود تھی اور دوسری طرف اُمت کو یہ تعلیم دینی تھی کہ بہت زیادہ بزرگ اور نیک ہوکر ایک کونے میں بیٹھ جانا بھی اچھی بات نہیں۔ بلکہ دنیا میں آدمیوں کی طرح اور انسانوں کی طرح رہنا چاہئے۔ اور ایک حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے ساتھ دو مرتبہ دوڑ لگائی۔ ایک مرتبہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم آگے نکل گئے اور دوسری مرتبہ جب دوڑ لگائی تو چونکہ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم نسبۃً بھاری ہوگیا تھا اس لئے میں آگے نکل گئی اور آپ پیچھے رہ گئے۔ اس وقت آپ نے فرمایا: "تِلْكَ بِتِلْكَ" یعنی دونوں برابر ہوگئے۔ ایک مرتبہ تم جیت گئیں اور ایک مرتبہ میں جیت گیا۔ (۱)

اب دیکھئے کہ بزرگانِ دین اس سنت پر کس طرح عمل کرنے کے لئے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا اس سنت پر عمل

ایک مرتبہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ تھانہ بھون سے کچھ فاصلہ پر ایک گاؤں میں دعوت میں تشریف لے جارہے تھے اور اہلیہ محترمہ ساتھ تھیں۔ جنگل کا پیدل سفر تھا، کوئی اور شخص بھی ساتھ نہیں تھا۔ جب جنگل کے درمیان پہنچے تو خیال آیا کہ الحمد للہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی سنتوں پر عمل کرنے کی توفیق ہوگئی ہے لیکن اہلیہ کے ساتھ دوڑ لگانے کی سنت پر ابھی تک عمل کا موقع نہیں ملا۔ آج موقع ہے کہ اس سنت پر بھی عمل ہوجائے۔ چنانچہ اس وقت آپ نے دوڑ لگا کر اس سنت پر بھی عمل کرلیا۔ اب ظاہر ہے کہ دوڑ لگانے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کرنے کے لئے دوڑ لگائی۔ یہ ہے اتباعِ سنت کی حرص۔ نیک کاموں کی حرص۔ اجر و ثواب حاصل کرنے کی حرص۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کے اندر یہ حرص پیدا فرمادے۔ آمین

ہمت بھی اللہ سے مانگنی چاہئے

اب بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے دل میں ایک نیک کام کرنے کا شوق پیدا ہوا اور دل چاہا کہ فلاں شخص یہ عبادت کرتا ہے، میں بھی یہ عبادت انجام دوں۔ لیکن ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ یہ عبادت اور یہ نیک کام ہمارے بس میں نہیں ہے، ہم نہیں کر پائیں گے، یہ تو بڑے لوگوں کا کام ہے۔ تو جب اس قسم کا خیال دل میں پیدا ہو تو اس وقت کیا کریں؟ اس کے لئے حدیث کے اگلے جملے میں

(۱) سنن أبي داود، كتاب الجهاد، باب في السبق على الرجل، رقم: ٢٢١٤ ولفظة: قالت فسابقتهُ فسبقتهُ على رجليّ فلما حملت اللحم سابقته فسبقتني فقال هذه بتلك السبقة

ارشاد فرمایا:

((وَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ وَلَا تَعْجَزْ))

یعنی ایسے وقت میں مایوس اور عاجز ہو کر نہ بیٹھ جائے کہ مجھ سے یہ عبادت ہو ہی نہیں سکتی بلکہ اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرے۔ اور کہے کہ یا اللہ! یہ کام میرے بس میں تو نہیں ہے، لیکن آپ کی قدرت میں ہے۔ آپ ہی مجھے اس نیک کام کی توفیق عطا فرمادیں اور اس کے کرنے کی ہمت عطا فرمادیں۔

مثلاً نیک لوگوں کے بارے میں سنا کہ وہ رات کو اُٹھ کر تہجد پڑھا کرتے ہیں اور رات کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگتے ہیں۔ تو اب دل میں شوق پیدا ہوا کہ مجھے بھی رات کو اُٹھ کر تہجد کی نماز پڑھنی چاہئے۔ لیکن یہ خیال بھی آیا کہ رات کو اُٹھ کر تہجد پڑھنا میرے بس میں نہیں۔ چلو چھوڑو اور مایوس ہو کر بیٹھ گیا۔ ایسا نہیں کرنا چاہئے بلکہ اللہ تعالیٰ سے کہے کہ یا اللہ! میری آنکھ نہیں کھلتی، میری نیند پوری نہیں ہوتی۔ یا اللہ! تہجد پڑھنے کی توفیق عطا فرمادیجئے اور اس کی فضیلت عطا فرمادیجئے۔

کیونکہ جب اللہ تعالیٰ سے دعا کرے گا اور توفیق مانگے گا تو پھر دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو واقعۃً اللہ تعالیٰ اس عمل کی توفیق عطا فرمادیں گے۔ اور اگر اس عمل کی توفیق حاصل نہ ہوئی تو یقیناً اس نیک عمل کا ثواب انشاء اللہ ضرور حاصل ہو جائے گا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حدیث شریف میں ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص سچے دل سے اللہ تعالیٰ سے شہادت طلب کرے اور یہ کہے کہ یا اللہ! مجھے اپنے راستے میں شہادت نصیب فرما تو اللہ تعالیٰ اس کو شہادت کا مرتبہ عطا فرمادیتے ہیں، اگرچہ بستر پر ہی اس کا انتقال ہو جائے۔(۱)

ایک لوہار کا ایمان افروز واقعہ

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کا جب انتقال ہو گیا تو کسی نے خواب میں ان کو دیکھا تو پوچھا کہ حضرت! کیسی گزری؟ جواب میں انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بڑے کرم کا معاملہ فرمایا اور مغفرت فرمادی اور استحقاق کے بغیر بڑا درجہ عطا فرمایا۔ لیکن جو درجہ میرے سامنے والے مکان میں رہنے والے لوہار کو نصیب ہوا وہ مجھے نہیں مل سکا۔ جب خواب دیکھنے والا بیدار ہوا تو اس کو یہ جستجو ہوئی کہ یہ معلوم کروں کہ وہ کون لوہار تھا اور کیا عمل کرتا تھا، جس کی وجہ سے حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے بھی آگے بڑھ گیا۔ چنانچہ وہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے محلے میں گیا اور پوچھا کہ

(۱) صحیح مسلم، کتاب الإمارة، باب استحباب طلب الشهادة فی سبیل اللّٰه تعالیٰ، رقم: ۳۵۳۲

یہاں کوئی لوہار رہتا تھا جس کا انتقال ہو گیا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ ہاں، اس سامنے والے مکان میں ایک لوہار رہتا تھا۔ اور چند روز پہلے اس کا انتقال ہوا ہے۔ چنانچہ یہ لوہار کے گھر گیا اور اس کی بیوی سے اپنا خواب بیان کیا اور پوچھا کہ تمہارا شوہر ایسا کون سا عمل کرتا تھا جس کی وجہ سے وہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے آگے بڑھ گیا؟ لوہار کی بیوی نے بتایا کہ میرا شوہر ایسی کوئی خاص عبادت تو نہیں کرتا تھا۔ سارا دن لوہا کوٹتا رہتا تھا۔ البتہ میں نے اس کے اندر دو باتیں دیکھیں۔ ایک یہ کہ جب لوہا کوٹنے کے دوران اذان کی آواز "اللہ اکبر" کان میں پڑتی تو فوراً اپنا کام بند کر دیتا تھا۔ حتیٰ کہ اگر اس نے اپنا ہتھوڑا کوٹنے کے لئے اُوپر اُٹھالیا ہوتا اور اتنے میں اذان کی آواز آجاتی تو وہ یہ بھی گوارا نہیں کرتا تھا کہ اس ہتھوڑے سے چوٹ لگا دوں، بلکہ ہتھوڑے کو پیچھے کی طرف پھینک دیتا اور اُٹھ کر نماز کی تیاری میں لگ جاتا۔ دوسری بات میں نے یہ دیکھی کہ ہمارے سامنے والے مکان میں ایک بزرگ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ رہا کرتے تھے۔ وہ رات بھر اپنے مکان کی چھت پر کھڑے ہو کر نماز پڑھا کرتے تھے۔ ان کو دیکھ کر میرا شوہر یہ کہا کرتا تھا کہ یہ اللہ کے نیک بندے ساری رات عبادت کرتے ہیں۔ کاش اللہ تعالیٰ مجھے بھی فراغت عطا فرماتے تو میں بھی عبادت کرتا ــــــ یہ جواب سن کر اس شخص نے کہا کہ بس یہی حسرت ہے جس نے ان کو حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے آگے بڑھا دیا ــــــ

میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ قصہ سنا کر فرمایا کرتے تھے کہ یہ ہے "حسرتِ نایاب" جو بعض اوقات انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے ــــــ اس لئے جب کسی کے بارے میں سنو کہ فلاں شخص یہ نیک عمل کرتا ہے تو اس نیک عمل کے بارے میں دل میں حرص اور حسرت پیدا ہونی چاہئے کہ کاش ہمیں بھی اس نیک کام کے کرنے کی توفیق مل جائے۔

حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فکر اور سوچ کا انداز

حدیث شریف میں آتا ہے کہ بعض صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ، ہمیں یہ فکر ہے کہ ہمارے بہت سے ساتھی دولت مند اور مالدار ہیں۔ ان پر ہمیں رشک آتا ہے۔ اس لئے کہ جو جسمانی عبادت ہم کرتے ہیں، وہ بھی کرتے ہیں۔ لیکن جسمانی عبادت کے علاوہ وہ مالی عبادت بھی کرتے ہیں، مثلاً صدقہ و خیرات کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں ان کے گناہ بھی معاف ہوتے ہیں اور ان کے درجات بھی بلند ہوتے ہیں۔ لہٰذا آخرت کے درجات میں وہ ہم سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ اور ہم جتنی بھی کوشش کر لیں لیکن غریب ہونے کی وجہ سے ان سے آگے نہیں بڑھ سکتے، اس لئے کہ ہم صدقہ و خیرات نہیں کر سکتے ــــــ دیکھئے، ہماری اور ان کی سوچ میں کتنا فرق ہے، ہم جب اپنے سے بڑے مالدار کے بارے میں سوچتے ہیں تو

اس کے صدقہ وخیرات کرنے پر ہمیں رشک نہیں آتا، بلکہ اس بات پر رشک آتا ہے کہ اس کے پاس دولت زیادہ ہے۔ اس لئے یہ بہت مزے سے زندگی گزار رہا ہے، کاش کہ ہمیں بھی دولت مل جائے تو ہم بھی عیش وآرام سے زندگی گزاریں۔ یہ ہے سوچ کا فرق۔

بہرحال، ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سوال کے جواب میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں تمہیں ایک ایسا عمل بتاتا ہوں کہ اگر تم اس عمل کو پابندی سے کرلوگے تو صدقہ وخیرات کرنے والوں سے تمہارا ثواب بڑھ جائے گا، کوئی تم سے آگے نہیں بڑھ سکے گا۔ وہ عمل یہ ہے کہ ہر نماز کے بعد ۳۳ مرتبہ "سبحان اللہ"، ۳۳ مرتبہ "الحمد للہ"، ۳۴ مرتبہ "اللہ اکبر" پڑھ لیا کرو۔ (۱)

نیکی کی حرص عظیم نعمت ہے

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہی ذکر مالداروں نے بھی شروع کردیا تو پھر ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا سوال برقرار رہے گا۔ کیونکہ مالدار لوگ پھر ان سے آگے بڑھ جائیں گے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ بتلانا چاہتے تھے کہ جب تمہیں یہ حرص اور حسرت ہورہی ہے کہ ہم بھی مالدار ہوتے تو ہم بھی اسی طرح صدقہ خیرات کرتے جس طرح یہ مالدار لوگ کرتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ اس حرص کی برکت سے تم کو صدقہ خیرات کا اجروثواب بھی عطا فرمادیں گے ——
بہرحال، کسی نیک کام کے کرنے کی حرص اور ارادہ اور اس کے نہ کرسکنے کی حسرت بھی بڑی نعمت ہے۔ اس لئے جب کسی شخص کے بارے میں سنو کہ فلاں شخص یہ نیک عمل کرتا ہے تو تم یہ دعا کرلو کہ اے اللہ! یہ نیک کام میرے بس سے باہر ہے۔ آپ ہی اس کام کے کرنے میں میری مدد فرمایئے، اور مجھے اس کے کرنے کی توفیق عطا فرمایئے، تو پھر اللہ تعالیٰ یا تو اس نیک کام کے کرنے کی توفیق عطا فرمادیں گے، یا اس نیک کام کا اجروثواب عطا فرمادیں گے۔ یہ نسخہ کیمیا ہے۔

لفظ "اگر" شیطانی عمل کا دروازہ کھول دیتا ہے

آگے فرمایا:

((وَإِنْ أَصَابَكَ شَيْءٌ فَلَا تَقُلْ لَوْ أَنِّي فَعَلْتُ لَكَانَ كَذَا وَكَذَا، وَلٰكِنْ قُلْ: قَدَّرَ اللّٰهُ وَمَا شَاءَ فَعَلَ، فَإِنَّ "لَوْ" تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّيْطَانِ))

---

(۱) صحيح البخاری، كتاب الايمان، باب الذكر بعد الصلاة، رقم: ۷۹۸، صحيح مسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب استحباب الذكر بعد الصلاة وبيان صفته، رقم: ۹۳٦، مسند احمد، حديث ابی ذر الغفاری، رقم: ۲۰۵۰۰۔

یعنی اگر دنیاوی زندگی میں تمہیں کوئی مصیبت اور تکلیف پہنچے تو یہ مت کہو کہ اگر یوں کر لیتا تو ایسا نہ ہوتا۔ اور اگر یوں کر لیتا تو ایسا ہو جاتا۔ یہ اگر مگر مت کہو، بلکہ یہ کہو کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور مشیت یہی تھی۔ جو اللہ نے چاہا وہ ہو گیا، اس لئے کہ یہ لفظ "اگر" شیطان کے عمل کا دروازہ کھول دیتا ہے ۔۔۔ مثلاً کسی کے عزیز کا انتقال ہو جائے تو کہتا ہے کہ اگر فلاں ڈاکٹر سے علاج کرالیتا تو یہ بچ جاتا، یا مثلاً کسی کے ہاں چوری ہو گئی یا ڈاکہ پڑ گیا تو یہ کہتا ہے کہ اگر فلاں طریقے سے حفاظت کر لیتا تو چوری نہ ہوتی وغیرہ۔ ایسی باتیں مت کہو، بلکہ یوں کہو کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں ایسا ہی ہونا مقدر تھا، اس لئے ہو گیا، میں اگر ہزار تدبیر کر لیتا تب بھی ایسا ہی ہوتا۔

دنیا راحت اور تکلیف سے مرکب ہے

اس حدیث میں کیا عجیب و غریب تعلیم دی گئی ہے، اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں یہ بات اُتار دے۔ آمین۔ یقین رکھئے کہ اس دنیا میں سکون، عافیت، آرام اور اطمینان حاصل کرنے کے لئے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ انسان تقدیر پر یقین اور ایمان لے آئے۔ اس لئے کہ کوئی انسان ایسا نہیں ہے جس کو اس دنیا میں کبھی کوئی غم اور پریشانی نہ آئی ہو۔ یا کبھی کوئی مصیبت اس کے اُوپر نہ آئی ہو۔ یہ عالمِ دنیا دونوں چیزوں سے مرکب ہے، جس میں خوشی بھی ہے، غم بھی ہے، راحت بھی ہے اور تکلیف بھی ہے۔ یہاں کوئی خوشی بھی خالص نہیں، کوئی غم خالص نہیں۔ لہٰذا غم، تکلیف اور پریشانی تو اس دنیا میں ضرور آئے گی، اگر ساری دنیا کی دولت خرچ کر کے یہ چاہو کہ کوئی تکلیف نہ آئے تو یہ نہیں ہو سکتا۔

اللہ کے محبوب پر تکالیف زیادہ آتی ہیں

ہماری اور تمہاری کیا حقیقت ہے۔ انبیاء علیہم السلام جو اللہ تعالیٰ کی پیاری اور محبوب مخلوق ہے، ان کے اُوپر بھی تکالیف اور پریشانیاں آتی ہیں۔ اور عام لوگوں سے زیادہ آتی ہیں۔ چنانچہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((أَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً الْأَنْبِيَاءُ ثُمَّ الْأَمْثَلُ فَالْأَمْثَلُ)) (۱)

یعنی لوگوں میں سب سے زیادہ تکالیف انبیاء علیہم السلام پر آتی ہیں۔ اور پھر جو شخص انبیاء علیہم السلام سے جتنا قریب ہو گا اس کو اتنی ہی زیادہ تکالیف اور پریشانیاں آئیں گی۔ وہ عالم جہاں کوئی پریشانی اور تکلیف نہیں آئے گی، وہ عالم جنت ہے، لہٰذا اس دنیا میں پریشانیاں تو آئیں گی، لیکن اگر ان تکالیف پر یہ سوچنا شروع کر دیا کہ ہائے یہ کیوں ہوا؟ اگر ایسا کر لیتے تو یہ نہ ہوتا۔ فلاں وجہ اور سبب کے ایسا

(۱) کنز العمال، رقم: ۶۷۸۳

ہوگیا۔ ایسا سوچنے سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس سے حسرت بڑھتی ہے، تکلیف اور صدمہ بڑھتا ہے اور اللہ تعالیٰ پر شکوہ پیدا ہوتا ہے کہ معاذ اللہ' یہ ساری مصیبتیں میرے مقدر میں رہ گئی تھیں، وغیرہ۔ اور وہ مصیبت وبالِ جان بن جاتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں بھی تکلیف ہوئی اور اس شکوہ کی وجہ سے آخرت میں اس پر عذاب کا مستحق ہوجاتا ہے۔ اور بعض اوقات ایمان بھی خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔

حقیر کیڑا مصلحت کیا جانے!

اس لئے حضورِ اقدس ﷺ فرمارہے ہیں کہ جب تمہیں کوئی پریشانی یا تکلیف آئے تو یہ سمجھو کہ جو کچھ پیش آیا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادے سے پیش آیا ہے۔ میں اس کی حکمت کیا جانوں، اللہ تعالیٰ ہی اس کی حکمت اور مصلحت جانتے ہیں۔ ایک حقیر کیڑا اس کی حکمت اور مصلحت کو کیا جانے ــــ البتہ اس تکلیف پر رونا آئے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ بعض لوگوں میں یہ بات مشہور ہے کہ تکلیف پر رونا نہیں چاہئے۔ یہ بات غلط ہے، اس لئے کہ تکلیف پر رونا برا نہیں ہے، بشرطیکہ اللہ تعالیٰ سے اس مصیبت پر شکوہ نہ ہو۔

ایک بزرگ کا بھوک کی وجہ سے رونا

ایک بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک صاحب ان سے ملنے گئے، دیکھا کہ وہ بیٹھے رو رہے ہیں۔ ان صاحب نے پوچھا کہ حضرت کیا تکلیف ہے جس کی وجہ سے آپ رو رہے ہیں؟ ان بزرگ نے جواب دیا کہ بھوک لگ رہی ہے۔ اس شخص نے کہا کہ آپ کوئی بچے ہیں کہ بھوک کی وجہ سے رو رہے ہیں۔ بھوک کی وجہ سے تو بچے روتے ہیں۔ آپ تو بڑے ہیں، پھر بھی رو رہے ہیں؟ ان بزرگ نے فرمایا: تمہیں کیا معلوم، اللہ تعالیٰ کو میرا رونا دیکھنا ہی مقصود ہو۔ اس وجہ سے وہ مجھے بھوکا رکھ رہے ہیں تو بعض اوقات اللہ تعالیٰ کو رونا بھی پسند آتا ہے، بشرطیکہ اس کے ساتھ شکوہ شکایت نہ ہو' اسی کو صوفیاء کرام کی اصطلاح میں ''تفویض'' کہا جاتا ہے۔ یعنی معاملہ اللہ کے سپرد کردینا اور یہ کہنا کہ اے اللہ! مجھے ظاہری طور پر تکلیف ہورہی ہے۔ لیکن فیصلہ آپ کا برحق ہے' اگر انسان کو اس بات کا یقین حاصل ہوجائے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادے کے بغیر ایک پتہ بھی حرکت نہیں کرسکتا اور تمام فیصلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں تو اس یقین کے بعد اطمینان اور سکون حاصل ہوجائے گا اور بیماری اور پریشانی کے وقت جو ناقابلِ برداشت صدمہ اور تکلیف ہوتی ہے وہ نہیں ہوگی۔

مسلمان اور کافر کا امتیاز

ایک کافر کا عزیز بیمار ہوا۔ اس نے ڈاکٹر سے علاج کرایا، ڈاکٹر کے علاج کے دوران اس کا انتقال ہوگیا، تو اب اس کافر کے پاس اطمینان حاصل کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہے، کیونکہ وہ تو یہی سمجھے گا کہ ڈاکٹر نے دوا صحیح تجویز نہیں کی، صحیح دیکھ بھال نہیں کی، اس لئے یہ مرگیا۔ اگر علاج صحیح ہو جاتا تو یہ نہ مرتا ـــــ لیکن ایک مسلمان کا عزیز بیمار ہوگیا، ڈاکٹر نے علاج کیا، لیکن اس کا انتقال ہوگیا تو اب اس مسلمان کے پاس اطمینان اور سکون حاصل کرنے کا ذریعہ موجود ہے، وہ یہ کہ اگرچہ اس کی موت کا ظاہری سبب ڈاکٹر کی غفلت ہے، لیکن جو کچھ ہوا، یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہوا، ان کے ارادے سے موت واقع ہوئی، اگر ڈاکٹر صحیح دوا دیتا، تب بھی وہ دوا اُلٹی پڑ جاتی۔ اور اگر میں اس ڈاکٹر کے علاوہ دوسرے ڈاکٹر کے پاس جاتا، تب بھی موت آتی۔ اس لئے کہ ہونا وہی تھا جو تقدیر میں اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا تھا۔ اس کی موت کا وقت آچکا تھا، اس کے دن پورے ہوگئے تھے، اس کو تو جانا تھا، اس لئے چلا گیا، اللہ تعالیٰ کی تقدیر برحق ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جو جلیل القدر صحابہ میں سے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں آگ کا کوئی انگارہ اپنی زبان پر رکھ لوں اور اس کو چاٹوں، یہ عمل مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ میں کسی ایسے واقعہ کے بارے میں جو ہو چکا، یہ کہوں کہ کاش! یہ واقعہ نہ ہوتا، اور کسی ایسے واقعہ کے بارے میں جو نہیں ہوا، یہ کہوں کہ کاش! وہ واقعہ ہو جاتا۔ (۱)

اللہ کے فیصلے پر راضی رہو

مقصد یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بات کا فیصلہ فرمادیں، اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے مطابق کوئی واقعہ پیش آجائے تو اب اس کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ یا یہ کہنا کہ ایسا ہو جاتا، یہ کہنا اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر راضی ہونے کے خلاف ہے۔ ایک مؤمن سے مطالبہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر اور اس کے فیصلے پر راضی رہے، اور اس تقدیر کے فیصلے پر اس کے دل میں شکایت پیدا نہ ہو، اور نہ دل میں اس کی برائی ہو۔ بلکہ دل و جان سے اس پر راضی رہے' ایک اور حدیث میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

((اِذَا قَضَى اللّٰهُ قَضَاءً أَحَبَّ أَنْ يُرْضٰى بِقَضَائِهٖ)) (۲)

---

(۱) کتاب الزھد، ص: ۳۰، رقم: ۱۲۲

(۲) کتاب الزھد، ص: ۳۲، رقم: ۱۲۴

یعنی جب اللہ تعالیٰ کسی کام کے بارے میں فیصلہ فرما دیتے ہیں کہ یہ کام اس طرح انجام دیا جانا ہے تو اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند فرماتے ہیں کہ میرا بندہ اس فیصلے پر راضی ہو۔ اور اس فیصلے کو بے چوں چرا تسلیم کرے۔ یہ نہ کہے کہ یوں ہوتا تو اچھا تھا۔ فرض کریں کہ کوئی ایسا واقعہ پیش آیا جو طبیعت کو ناگوار ہے اور وہ غم اور تکلیف کا واقعہ ہے۔ اب پیش آچکنے کے بعد یہ کہنا کہ اگر یوں کر لیتے تو یہ واقعہ پیش نہ آتا، ایسا کہنے سے حضور اقدس ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ اس لئے کہ جو واقعہ پیش آیا، وہ تو پیش آنا ہی تھا، اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ اور اس کی تقدیر تھی۔ تم اگر ہزار تدبیر بھی کر لیتے، تب بھی وہ فیصلہ ٹلنے والا نہیں تھا۔ لہٰذا اب فضول یہ باتیں کرنا کہ ایسا کر لیتے تو ایسا ہو جاتا، یہ باتیں اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہونے کے منافی ہیں۔ ایسی باتیں کرنا مؤمن کا کام نہیں۔

رضاء بالقضاء میں تسلی کا سامان ہے

حقیقت میں اگر غور کر کے دیکھا جائے تو انسان کے پاس رضا بالقضاء یعنی تقدیر پر راضی ہونے کے علاوہ چارہ ہی کیا ہے؟ اس لئے کہ تمہارے ناراض ہونے سے وہ فیصلہ بدل نہیں سکتا، جو غم پیش آیا ہے، تمہاری ناراضگی سے وہ غم دور نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس ناراضگی سے غم کی شدت اور تکلیف میں مزید اضافہ ہو جائے گا اور یہ کہے گا کہ ہائے ہم نے یہ نہ کر لیا۔ فلاں تدبیر اختیار نہ کر لی، اگر غور کر کے دیکھا جائے تو یہ نظر آئے گا کہ رضا بالقضاء میں درحقیقت انسان کی تسلی کا سامان ہے۔ اور ایک مؤمن کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو تسلی کا ذریعہ بنا دیا ہے۔

تقدیر ''تدبیر'' سے نہیں روکتی

اور یہ ''تقدیر'' عجیب وغریب عقیدہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہر صاحبِ ایمان کو عطا فرمایا ہے۔ اس عقیدہ کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگ طرح طرح کی غلطیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں، پہلی بات یہ ہے کہ کسی واقعہ کے پیش آنے سے پہلے تقدیر کا عقیدہ کسی انسان کو بے عملی پر آمادہ نہ کرے۔ مثلاً ایک انسان تقدیر کا بہانہ کر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے اور یہ کہے کہ جو تقدیر میں لکھا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ میں کچھ نہیں کرتا۔ یہ عمل حضور اقدس ﷺ کی تعلیم کے خلاف ہے۔ بلکہ حکم یہ ہے کہ جس چیز کے حاصل کرنے کی جو تدبیر ہے، اس کو اختیار کرو۔ اس کے اختیار کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑو۔

تدبیر کے بعد فیصلہ اللہ پر چھوڑ دو

دوسری بات یہ ہے کہ تقدیر کے عقیدے پر عمل کسی واقعہ کے پیش آنے کے بعد شروع ہوتا

ہے۔ مثلاً کوئی واقعہ پیش آچکا تو ایک مؤمن کا کام یہ ہے کہ وہ یہ سوچے کہ میں نے جو تدبیریں اختیار کرنی تھیں وہ کرلیں اور اب جو واقعہ ہماری تدبیر کے خلاف پیش آیا، وہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے، ہم اس پر راضی ہیں "لہٰذا واقعہ پیش آچکنے کے بعد اس پر بہت زیادہ پریشانی، بہت زیادہ حسرت اور تکلیف کا اظہار کرنا اور یہ کہنا کہ فلاں تدبیر اختیار کرلیتا تو یوں ہو جاتا، یہ بات عقیدۂ تقدیر کے خلاف ہے" ان دو انتہاؤں کے درمیان اللہ تعالیٰ نے ہمیں راہِ اعتدال یہ بتادی کہ جب تک تقدیر پیش نہیں آئی، اس وقت تک تمہارا فرض ہے کہ اپنی سی پوری کوشش کرلو، اور احتیاطی تدابیر بھی اختیار کرلو، اس لئے کہ ہمیں یہ نہیں معلوم کہ تقدیر میں کیا لکھا ہے؟

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ شام کے دورے پر تشریف لے جارہے تھے۔ راستے میں آپ کو اطلاع ملی کہ شام کے علاقے میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی ہے" یہ اتنا سخت طاعون تھا کہ انسان بیٹھے بیٹھے چند گھنٹوں میں ختم ہو جاتا تھا۔ اس طاعون میں ہزار ہا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہوئے ہیں۔ آج بھی اُردن میں حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کے مزار کے پاس پورا قبرستان ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قبروں سے بھرا ہوا ہے جو اس طاعون میں شہید ہوئے۔ بہر حال، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا کہ وہاں جائیں یا نہ جائیں اور واپس چلے جائیں۔ اس وقت حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے ایک حدیث سنائی کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اگر کسی علاقے میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑے تو جو لوگ اس علاقے سے باہر ہیں وہ اس علاقے کے اندر داخل نہ ہوں، اور جو لوگ اس علاقے میں مقیم ہیں، وہ وہاں سے نہ بھاگیں" یہ حدیث سن کر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا صاف صاف ارشاد ہے کہ ایسے علاقے میں داخل نہیں ہونا چاہئے۔ لہٰذا آپ نے وہاں جانے کا ارادہ ملتوی کردیا" اس وقت ایک صحابی غالباً حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ تھے، انہوں نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

"أَتَفِرُّ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ؟"

کیا آپ اللہ کی تقدیر سے بھاگ رہے ہیں؟ یعنی اگر اللہ تعالیٰ نے اس طاعون کے ذریعہ موت کا آنا لکھ دیا ہے تو وہ موت آکر رہے گی۔ اور اگر تقدیر میں موت نہیں لکھی تو جانا اور نہ جانا برابر ہے۔ جواب میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"لَوْ غَيْرُكَ قَالَهَا يَا أَبَا عُبَيْدَةَ"

اے ابو عبیدہ! اگر آپ کے علاوہ کوئی شخص یہ بات کہتا تو میں اس کو معذور سمجھتا، لیکن آپ تو

پوری حقیقت سے آگاہ ہیں، آپ یہ کیسے کہہ رہے ہیں کہ تقدیر سے بھاگ رہا ہوں۔ پھر فرمایا:

"نَعَمْ نَفِرُّ مِنْ قَدَرِ اللّٰہِ اِلٰی قَدَرِ اللّٰہِ"

"ہاں! ہم اللہ کی تقدیر سے اللہ کی تقدیر کی طرف بھاگ رہے ہیں۔"(۱)

مطلب یہ تھا کہ جب تک واقعہ پیش نہیں آیا، اس وقت تک ہمیں احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کا حکم ہے۔ اوران احتیاطی تدابیر کو اختیار کرنا عقیدۂ تقدیر کے خلاف نہیں، بلکہ عقیدۂ تقدیر کے اندر داخل ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے حکم فرمایا ہے کہ احتیاطی تدابیر اختیار کرو، چنانچہ اس حکم پر عمل کرتے ہوئے واپس جارہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اگر تقدیر میں ہمارے لئے طاعون کی بیماری میں مبتلا ہونا لکھا ہے تو اس کو ہم ٹال نہیں سکتے۔ لیکن اپنی سی تدبیر ہمیں پوری کرنی ہے۔

"تقدیر" کا صحیح مفہوم

یہ ہے ایک مؤمن کا عقیدہ کہ اپنی طرف سے تدبیر پوری کی، لیکن تدبیر کرنے کے بعد معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کردیا اور یہ کہہ دیا کہ یا اللہ، ہمارے ہاتھ میں جو تدبیر تھی وہ تو ہم نے اختیار کرلی، اب معاملہ آپ کے اختیار میں ہے، آپ کا جو فیصلہ ہوگا، ہم اس پر راضی رہیں گے۔ ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا، لہٰذا واقعہ کے پیش آنے سے پہلے عقیدۂ تقدیر کسی کو بے عملی پر آمادہ نہ کرے۔ جیسے بعض لوگ عقیدۂ تقدیر کو بے عملی کا بہانہ بنالیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ جو تقدیر میں لکھا ہے وہ تو ہوکر رہے گا۔ لہٰذا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں۔ کام کیوں کریں؟ یہ درست نہیں، کیونکہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ اپنی تدبیر کرتے رہو۔ ہاتھ پاؤں ہلاتے رہو۔ لیکن ساری تدابیر اختیار کرنے کے بعد اگر واقعہ اپنی مرضی کے خلاف پیش آجائے تو اس پر راضی رہو لیکن اگر تم اپنی رضامندی کا اظہار نہ کرو، بلکہ یہ کہہ دو کہ یہ فیصلہ تو بہت غلط ہوا، بہت برا ہوا تو اس کا نتیجہ سوائے پریشانی میں اضافے کے کچھ نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ جو واقعہ پیش آچکا ہے، وہ بدل نہیں سکتا، اور آخرکار تمہیں سرِ تسلیم خم کرنا ہی پڑے گا۔ اس لئے پہلے دن ہی اس کو تسلیم کرلینا چاہئے کہ جو اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے ہم اس پر راضی ہیں۔

غم اور صدمہ "رضا بالقضاء" کے منافی نہیں

اب ایک بات اور سمجھ لینی چاہئے۔ وہ یہ کہ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ اگر کوئی تکلیف دہ واقعہ پیش آئے، یا کوئی غم یا صدمہ پیش آئے تو اس غم اور تکلیف پر رونا صبر کے منافی اور خلاف نہیں۔

(۱) صحیح البخاری، کتاب الطب، باب ما یذکر من الطاعون، رقم: ۵۲۸۸، صحیح مسلم، کتاب السلام، باب الطاعون والطیرۃ والکھانۃ ونحوھا، رقم: ۴۱۱۴

اور گناہ نہیں، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف تو آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ غم اور صدمہ کرنا اور اس کا اظہار کرنا جائز ہے۔ رونا بھی جائز ہے۔ اور دوسری طرف آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ اللہ کے فیصلے پر راضی رہنا چاہئے۔ یہ دونوں چیزیں کیسے جمع کریں کہ ایک طرف فیصلے پر راضی بھی ہوں اور دوسری طرف غم اور صدمہ کا اظہار بھی کرنا جائز ہو؟ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ غم اور صدمہ کا اظہار الگ چیز ہے۔ اور اللہ کے فیصلے پر راضی ہونا الگ چیز ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ عین حکمت پر مبنی ہے، اور ہمیں اس کی حکمت معلوم نہیں، اور حکمت معلوم نہ ہونے کی وجہ سے دل کو تکلیف پہنچ رہی ہے، اس لئے غم اور صدمہ بھی ہے اور اس غم اور صدمہ کی وجہ سے ہم رو بھی رہے ہیں، اور آنکھوں سے آنسو بھی جاری ہیں۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو فیصلہ کیا ہے، وہ برحق ہے، حکمت پر مبنی ہے۔ لہٰذا ''رضا'' سے مراد رضاء عقلی ہے، یعنی عقلی طور پر انسان یہ سمجھے کہ یہ فیصلہ صحیح ہے۔

ایک بہترین مثال

مثلاً ایک مریض ڈاکٹر سے آپریشن کرانے کے لئے ہسپتال جاتا ہے، اور ڈاکٹر سے درخواست کرتا ہے، اور اس کی خوشامد کرتا ہے کہ میرا آپریشن کردو۔ جب ڈاکٹر نے آپریشن شروع کیا تو اب یہ رو رہا ہے۔ چیخ رہا ہے۔ ہائے ہائے کررہا ہے۔ اور اس تکلیف کی وجہ سے اس کو رنج اور صدمہ بھی ہو رہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ڈاکٹر کو آپریشن کی فیس بھی دیتا ہے اور اس کا شکریہ بھی ادا کرتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ عقلی طور پر جانتا ہے کہ جو کچھ ڈاکٹر کر رہا ہے، وہ ٹھیک کر رہا ہے، اور میرے فائدے کے لئے کر رہا ہے۔ بالکل اسی طرح ایک مؤمن کو اس دنیا میں جتنی تکلیفیں اور جتنے صدمے پہنچتے ہیں، یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہنچتے ہیں۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ تمہارا آپریشن کر رہے ہیں۔ اب اگر ان تکالیف کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر رہے ہو تو اس کا انجام تمہارے حق میں بہتر ہونے والا ہے، لہٰذا عقلی طور پر اگر یہ بات دل میں بیٹھی ہوئی ہے، اور پھر انسان اس صدمے پر اور اس تکلیف پر اظہارِ غم کرے، روئے، چلائے تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں۔

کام کا بگڑنا بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ بعض اوقات ایک تاجر شخص اس بات کی کوشش میں لگا ہوتا ہے کہ میرا فلاں سودا ہو جائے تو اس کے ذریعہ میں بہت نفع کمالوں گا۔ یا ایک شخص کسی عہدے اور منصب کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ مجھے فلاں منصب مل جائے تو بڑا اچھا ہو، اب اس

سودے کے لئے یا اس منصب کے لئے بھاگ دوڑ اور کوشش کر رہا ہے، دعائیں کر رہا ہے، دوسروں سے بھی دعائیں کرا رہا ہے، لیکن جب سب کام مکمل ہو چکے، اور قریب تھا کہ وہ سودا ہو جائے، یا وہ عہدہ اور منصب اس کو مل جائے، عین اس وقت اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ میرا یہ نادان اور بیوقوف بندہ اس سودے کے یا منصب کے حاصل کرنے کے پیچھے پڑا ہوا ہے، اور اپنی پوری کوشش صرف کر رہا ہے، لیکن میں جانتا ہوں کہ اگر یہ سودا یا یہ منصب اس کو حاصل ہو گیا تو مجھے اس کو جہنم میں ڈالنا پڑے گا، اس لئے کہ اس سودے یا اس عہدے کے نتیجے میں یہ گناہ میں مبتلا ہو گا، اور اس کے نتیجے میں مجھے اس کو جہنم میں دھکیلنا پڑے گا۔ اس لئے یہ منصب یہ سودا اس سے دور کر دیا جائے۔ چنانچہ عین اس وقت جب کہ وہ سودا ہونے والا تھا، یا وہ عہدہ ملنے ہی والا تھا کہ اچانک کوئی رکاوٹ کھڑی ہو گئی۔ اور وہ سودا نہیں ہوا۔ یا وہ عہدہ نہیں ملا۔ اب یہ شخص رو رہا ہے اور یہ شکایت کر رہا ہے کہ فلاں شخص نے بیچ میں آکر میرا کام بگاڑ دیا۔ اور اب اس بگاڑ کو دوسروں کی طرف منسوب کر رہا ہے۔ حالانکہ اس کو یہ معلوم نہیں کہ جو کچھ کیا وہ اس کے خالق اور مالک نے کیا ہے۔ اور اس کے فائدے کے لئے کیا، کیونکہ اگر یہ عہدہ مل جاتا تو جہنم کے عذاب میں مبتلا ہوتا ـــــ یہ ہے تقدیر اور اللہ کا فیصلہ جس پر عقلی طور پر انسان کو راضی رہنا چاہئے۔

تقدیر کے عقیدے پر ایمان لا چکے ہو

عقیدہ کے اعتبار سے تو ہر مؤمن کا تقدیر پر ایمان ہوتا ہے۔ جب ایک بندہ ایمان لاتا ہے تو اللہ اور اللہ کے رسول پر ایمان لانے کے ساتھ وہ تقدیر پر بھی ایمان لاتا ہے:

"اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى"

لیکن اس ایمان کا اثر عموماً اس کی زندگی پر ظاہر نہیں ہوتا اور اس عقیدے کا استحضار نہیں رہتا۔ اور اس کی طرف دھیان نہیں رہتا۔ جس کی وجہ سے وہ دنیا میں پریشان ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ جب تم اس عقیدے پر ایمان لے آئے تو اس عقیدے کو اپنی زندگی کا جزو بناؤ، اور اس عقیدے کا دھیان پیدا کرو، اور اس کو یاد رکھو، اور جو بھی واقعہ پیش آئے اس وقت اس کو تازہ کرو کہ میں اللہ کی تقدیر پر ایمان لایا تھا، اس لئے مجھے اس پر راضی رہنا چاہئے۔ یہی فرق ہے ایک عام آدمی میں اور اس شخص میں جس نے صوفیاء کرام کی زیر تربیت اس عقیدے کو اپنی زندگی میں اپنانے کی کوشش کی ہو، لہٰذا اس عقیدے کو اس طرح حال بنالیں کہ جب کبھی کوئی ناگوار واقعہ پیش آئے تو اس وقت "اناللہ وانا الیہ راجعون" پڑھے۔ اور ساتھ میں اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ

ہے، آگے ہمیں اس کے اندر چون وچرا کرنے کی گنجائش نہیں، اس کی مشق کرنی پڑتی ہے۔ تب جاکر یہ عقیدہ حال بن جاتا ہے۔ اور جب یہ حال بن جاتا ہے تو پھر ایسے شخص کو دنیا میں کبھی پریشانی نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ اس عقیدے کو ہم سب کا حال بنادے۔ آمین

یہ پریشانی کیوں ہے؟

دیکھئے، صدمہ اور غم اور چیز ہے، یہ تو ہر شخص کو پیش آتے ہیں۔ لیکن ایک ہے پریشانی، وہ یہ کہ آدمی اس غم اور صدمہ کی وجہ سے بے تاب اور بے چین ہے۔ کسی کروٹ چین نہیں آرہا ہے۔ یہ پریشانی کیوں ہے؟ اس لئے کہ وہ شخص اس فیصلے پر عقلی طور پر راضی نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے آدمی کو چین اور سکون کیسے میسر آئے؟ اور جس شخص کا اس بات پر ایمان ہے کہ میرے اختیار میں جو کچھ تھا وہ میں نے کرلیا۔ اب آگے میرے اختیار سے باہر تھا۔ اس لئے میں کچھ نہیں کرسکتا تھا اور اللہ تعالیٰ نے جو فیصلہ کیا ہے وہ برحق ہے، ایسے شخص کو کبھی پریشانی لاحق نہیں ہوگی۔ غم اور صدمہ ضرور ہوگا، لیکن پریشانی نہیں ہوگی۔

آبِ زر سے لکھنے کے قابل جملہ

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا تو مجھے اس پر بہت شدید صدمہ ہوا، زندگی میں اتنا بڑا صدمہ کبھی پیش نہیں آیا تھا، اور یہ صدمہ بے چینی کی حد تک پہنچا ہوا تھا، کسی کروٹ کسی حال قرار نہیں آرہا تھا اور اس صدمہ پر رونا بھی نہیں آرہا تھا۔ اس لئے کہ بعض اوقات رونے سے دل کی بھڑاس نکل جاتی ہے، اس وقت میں نے اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ کو اپنی یہ کیفیت لکھی تو انہوں نے جواب میں صرف ایک جملہ لکھ دیا اور الحمدللہ آج تک وہ جملہ دل پر نقش ہے اور اس ایک جملے نے اتنا فائدہ پہنچایا کہ میں بیان نہیں کرسکتا، وہ جملہ یہ تھا:

"صدمہ تو اپنی جگہ پر ہے۔ لیکن غیر اختیاری امور پر اتنی زیادہ پریشانی قابلِ اصلاح ہے"

یعنی صدمہ تو اپنی جگہ ہے، وہ ہونا چاہئے، اس لئے کہ عظیم باپ سے جدائی ہوگئی، لیکن یہ ایک غیر اختیاری واقعہ پیش آیا، اس لئے تم یہ نہیں کرسکتے تھے کہ موت کے وقت کو ٹلا دیتے۔ اب اس غیر اختیاری واقعے پر اتنی پریشانی قابلِ اصلاح ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رضا بالقضاء کا جو حکم ہے، اس پر عمل نہیں ہورہا ہے اور اس پر عمل نہ ہونے کی وجہ سے پریشانی ہورہی ہے، یقین جانئے اس ایک جملے کو پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے سینے پر برف رکھ دی۔ اور میری آنکھیں کھول دیں۔

لوحِ دل پر یہ "جملہ" نقش کرلیں

ایک اور موقع پر اپنے دوسرے شیخ حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو میں نے خط میں لکھا کہ حضرت! فلاں بات کی وجہ سے سخت پریشانی ہے۔ جواب میں حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے یہ جملہ لکھا کہ:

"جس شخص کا اللہ جل جلالہ سے تعلق ہو، اس کا پریشانی سے کیا تعلق؟"

یعنی پریشانی اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق مضبوط نہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق مضبوط ہو تو پھر پریشانی آنے کی مجال نہیں، اس لئے کہ جو صدمہ اور غم ہو رہا ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے کہو، یا اللہ! اس کو دور فرما دیں، اور پھر اللہ تعالیٰ جو فیصلہ فرمائیں اس پر راضی رہو۔ لیکن پریشانی کس بات کی؟ لہٰذا اگر رضا بالقضاء حال بن جائے اور جسم و جان کے اندر داخل ہو جائے تو پھر پریشانی کا گزر نہیں ہو سکتا۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کے راحت و سکون کا راز

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے جا کر پوچھا کہ حضرت کیا حال ہے؟ فرمایا: بڑے مزے میں ہوں۔ اور اس شخص کے مزے کا کیا پوچھتے ہو کہ اس کائنات میں کوئی واقعہ اس کی مرضی کے خلاف نہیں ہوتا۔ بلکہ جو واقعہ بھی پیش آتا ہے وہ اس کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔ لہٰذا دنیا کے سارے کام میری مرضی کے مطابق ہو رہے ہیں، سوال کرنے والے نے کہا کہ حضرت! یہ بات تو انبیاء علیہم السلام کو بھی حاصل نہیں ہوئی کہ دنیا کے تمام کام ان کی مرضی کے مطابق ہو جائیں۔ آپ کو یہ کیسے حاصل ہوئی؟ جواب میں فرمایا کہ میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں فنا کر دیا ہے۔ جو اللہ کی مرضی، وہ میری مرضی، اور دنیا کے سارے کام اللہ تعالیٰ کی مرضی سے ہوتے ہیں۔ اور میری بھی وہی مرضی ہے۔ اور جب سارے کام میری مرضی سے ہو رہے ہیں تو میرے مزے کا کیا پوچھنا۔ پریشانی تو میرے پاس پھٹکتی بھی نہیں، پریشانی تو اس شخص کو ہو جس کی مرضی کے خلاف کام ہوتے ہوں۔

تکالیف بھی حقیقت میں رحمت ہیں

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جن کو رضا بالقضاء کی دولت عطا فرما دیتے ہیں، ان کے پاس پریشانی کا گزر نہیں ہوتا، ان کو صدمہ ضرور ہوتا ہے۔ غم اور تکلیف ان کے پاس ضرور آتی ہے۔ لیکن پریشانی نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ جو کچھ غم یا صدمہ آ رہا ہے، وہ میرے مالک کی طرف

سے آ رہا ہے۔ اور میرے مالک کی حکمت کے مطابق آ رہا ہے، اور میرے مالک کی تقدیر کے مطابق میرا فائدہ بھی اسی میں ہے۔ حتیٰ کہ بعض بزرگوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ ؎

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

یعنی یہ بات تمہارے دشمن کو نصیب نہ ہو کہ وہ تیری تلوار سے ہلاک ہو، دوستوں کا سر سلامت رہے کہ تو اس پر اپنا خنجر آزمائے، یعنی یہ جو تکلیفیں پہنچ رہی ہیں، یہ بھی ان کی رحمت کا عنوان ہے۔ اور جب ان کی رحمت کا عنوان ہے تو دوسروں کو کیوں پہنچیں، یہ بھی ہمیں پہنچیں۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی بیان فرمودہ مثال

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ اس کی ایک مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایک شخص آپ کا محبوب ہے۔ اس سے آپ کو انتہاء درجہ کی محبت ہے اور اس محبوب کے دور ہونے کی وجہ سے بہت عرصہ سے اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اچانک وہ محبوب آپ کے پاس آتا ہے، اور چپکے سے آ کر آپ کو پیچھے سے پکڑ کر زور سے دبالیتا ہے۔ اور اتنی زور سے دباتا ہے کہ پسلیاں ٹوٹنے کے قریب ہونے لگتی ہیں، اور آپ کو تکلیف ہوتی ہے، جس کے نتیجے میں آپ چیختے اور چلاتے ہیں اور اپنے کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ تم کون ہو؟ وہ جواب میں کہتا ہے کہ میں تمہارا فلاں محبوب ہوں۔ اگر تمہیں میرا یہ دبانا پسند نہیں ہے تو میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں اور تمہارے رقیب کو دبالیتا ہوں۔ اگر تم عاشقِ صادق ہو تو یہی جواب دو گے کہ میرے رقیب کو مت دبانا، بلکہ مجھے ہی دباؤ اور زور سے دباؤ۔ اور یہ شعر پڑھو گے کہ ؎

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہمیں یہ ادراک عطا فرمادے کہ یہ تکلیفیں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کا عنوان ہیں۔ لیکن ہم چونکہ کمزور ہیں، اس لئے ہم ان تکالیف کو مانگتے نہیں، لیکن جب وہ تکلیف آ گئی تو ان کی حکمت اور فیصلے سے آئی ہے، اس لئے وہ ہمارے حق میں بہتر ہے۔

تکلیف مت مانگو، لیکن آئے تو صبر کرو

ہمارے بس کا یہ کام نہیں ہے کہ ہم ان تکالیف کو مانگیں، لیکن جن کو ان تکالیف کی حقیقت کا ادراک ہوتا ہے، وہ بعض اوقات مانگ بھی لیتے ہیں، چنانچہ بعض صوفیاء کرام سے مانگنا منقول ہے،

خاص کردہ تکلیف جو دین کے راستے میں پہنچے اس کو تو عاشقانِ صادق نے ہزار ہا تکالیف پر مقدم اور افضل قرار دیا۔ اس کے بارے میں یہ شعر کہا کہ ؎

بجرم عشق تو کشد عجب غوغا نیسیت
تو نیز برسر بام آ کہ خوش تماشا ایست

یعنی تیرے عشق کے جرم میں لوگ مجھے مار رہے ہیں، اور گھسیٹ رہے ہیں، اور ایک شور برپا ہے، آ کر دیکھ کہ تماشے کا کیسا شاندار منظر ہے' یہ تو بڑے لوگوں کی بات ہے لیکن ہم لوگ چونکہ کمزور ہیں، طاقت اور قوت اور صلاحیت نہیں ہے، اس لئے ان تکالیف کو اللہ تعالیٰ سے مانگتے نہیں ہیں، بلکہ عافیت مانگتے ہیں کہ یا اللہ عافیت عطا فرمایئے، اور جب تکلیف آ جاتی ہے تو اس کے ازالے کی بھی دعا کرتے ہیں کہ یا اللہ! یہ تکلیف اگرچہ آپ کی نعمت ہے، لیکن ہماری کمزوری پر نظر کرتے ہوئے اس نعمت کو عافیت کی نعمت سے بدل دیجئے، لیکن پریشانی نہیں ہونی چاہئے۔ اس کا نام "رضا بالقضاء" ہے۔ تقدیر پر ایمان تو سب کا ہوتا ہے کہ جو کچھ تقدیر میں لکھا تھا وہ ہو گیا۔ لیکن اس عقیدے کو اپنی زندگی کا حال بنانا چاہئے۔ "حال" بنانے کے بعد انشاء اللہ پریشانی پاس نہیں پھٹکے گی۔

اللہ والوں کا حال

چنانچہ آپ نے اللہ والوں کو دیکھا ہوگا کہ ان کو آپ کبھی بے تاب اور بے چین اور پریشان نہیں پائیں گے۔ ان کے ساتھ کیسا ہی بڑے سے بڑا ناگوار واقعہ پیش آ جائے، اس پر ان کو غم تو ہوگا، لیکن بے تابی اور بے چینی اور پریشانی ان کے پاس پھٹکتی بھی نہیں۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے۔ اس پر راضی رہنا ضروری ہے۔ لہٰذا انسان کی زندگی میں جب بھی کوئی ناگوار واقعہ پیش آ جائے تو اس کو اللہ تعالیٰ کا فیصلہ خیال کرتے ہوئے اس پر راضی رہنے کی فکر کرے۔ غم، صدمہ اور پریشانی کا یہی علاج ہے۔ اور ایسا کرنے سے اس کو اعلیٰ درجہ کا صبر حاصل ہو جائے گا اور صبر وہ اعلیٰ عبادت ہے جو ساری عبادتوں سے بڑھ کر ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا:

﴿إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ (۱)

"یعنی اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر عطا فرمائیں گے"

کوئی شخص تکلیف سے خالی نہیں

ہر تکلیف کے موقع پر یہ سوچنا چاہئے کہ اس کائنات میں کوئی ایسا شخص ہو نہیں سکتا جس کو اپنی

(۱) الزمر: ۱۰

زندگی میں کبھی کوئی تکلیف نہ پہنچی ہو۔ چاہے وہ بڑے سے بڑا بادشاہ ہو، بڑے سے بڑا سرمایہ دار اور دولت مند ہو، بڑے سے بڑا صاحبِ منصب ہو، بڑے سے بڑا نیک، ولی اللہ ہو، بڑے سے بڑا نبی ہو۔ لہٰذا تکلیف تو تمہیں ضرور پہنچے گی۔ تم چاہو تو بھی پہنچے گی اور نہ چاہو تو بھی پہنچے گی۔ اس لئے کہ یہ دنیا ایسی جگہ ہے جہاں راحت بھی ہے، غم بھی ہے، خوشی ہے، پریشانی بھی ہے۔ خالص راحت بھی کسی کو حاصل نہیں۔ خالص غم بھی کسی کو میسر نہیں۔ یہ طے شدہ بات ہے۔ حتیٰ کہ خدا کا انکار کرنے والوں نے خدا کے وجود کا انکار کر دیا۔ (العیاذ باللہ) لیکن اس بات سے انکار نہیں کر سکے کہ اس دنیا میں کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ جب یہ بات طے شدہ ہے کہ تکلیف پہنچنی ہے تو اب سوال یہ ہے کہ کون سی تکلیف پہنچے اور کون سی تکلیف نہ پہنچے۔ اس کا ایک راستہ تو یہ ہے کہ تم خود فیصلہ کر لو کہ مجھے فلاں تکلیف پہنچے اور فلاں تکلیف نہ پہنچے۔ کیا تمہارے اندر اس بات کی طاقت ہے کہ تم یہ فیصلہ کرو کہ فلاں تکلیف میرے حق میں بہتر ہے اور فلاں تکلیف بہتر نہیں ہے؟ ظاہر ہے کہ تم نہیں جانتے کہ کون سی تکلیف کا انجام میرے حق میں بہتر ہوگا اور کون سی تکلیف کا انجام بہتر نہیں ہوگا۔ لہٰذا اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دو، اور یہ کہہ دو کہ یا اللہ! آپ اپنے فیصلے کے مطابق جو تکلیف دینا چاہیں وہ دے دیجئے اور پھر اس کو برداشت کرنے کی طاقت بھی دے دیجئے اور اس پر صبر بھی عطا فرمائیے۔

چھوٹی تکلیف بڑی تکلیف کو ٹال دیتی ہے

انسان بے چارہ اپنی عقل کے دائرے میں محدود ہے، اس کو یہ پتہ نہیں کہ جو تکلیف مجھے پہنچی ہے اس نے مجھے کسی بڑی تکلیف سے بچالیا ہے۔ مثلاً کسی شخص کو بخار آ گیا، تو اب اس کو بخار کی تکلیف نظر آ رہی ہے، یا کوئی شخص کسی ملازمت کے لئے کوشش کر رہا تھا، لیکن وہ ملازمت اس کو نہیں ملی۔ اس کو یہ تکلیف نظر آ رہی ہے۔ یا گھر میں سامان کی چوری ہوگئی۔ اس کو یہ تکلیف نظر آ رہی ہے۔ لیکن اس کو یہ معلوم نہیں کہ اگر یہ تکلیف نہ پہنچتی تو دوسری کون سی تکلیف پہنچتی؟ اور وہ تکلیف بڑی تھی یا یہ تکلیف بڑی ہے؟ چونکہ اس کو اس کا علم نہیں ہے، اس لئے جو تکلیف اس کو پہنچی ہے تو اس کو لے کر بیٹھ جاتا ہے۔ اور اس کا ذکر اور چرچا کرتا رہتا ہے کہ ہائے مجھے یہ تکلیف پہنچ گئی، بلکہ اس موقع پر انسان یہ سوچے کہ اچھا ہوا کہ اس چھوٹی سی تکلیف پر بات ٹل گئی۔ ورنہ خدا جانے کتنی بڑی مصیبت آتی۔ کیا بلا نازل ہوتی۔ یہ سوچنے سے انسان کو تسلی ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی اللہ تعالیٰ انسان کو دکھا بھی دیتے ہیں کہ جس مصیبت کو تم بڑی تکلیف سمجھ رہے تھے، دیکھو وہ کیسی رحمت ثابت ہوئی۔

اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو

حضورِ اقدس ﷺ نے ہماری تسلی کے لئے یہ دعا بھی تلقین فرمادی:

((لَا مَلْجَأَ وَلَا مَنْجَا مِنَ اللّٰهِ اِلَّا اِلَيْهِ)) (۱)

اللہ تعالیٰ سے بچاؤ کا سوائے اس کے کوئی راستہ نہیں کہ اسی کی آغوشِ رحمت میں پناہ لو، یعنی اس کے فیصلے پر راضی رہو، اور پھر اسی سے مدد مانگو، یا اللہ! اس کو دور فرما دیجئے، اسی بات کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ ایک مثال کے ذریعہ سمجھاتے ہیں کہ ایک تیر انداز تصور کرو، جس کے پاس اتنی بڑی تیر کمان ہے جس نے ساری کائنات کو گھیرے میں لیا ہوا ہے، اور اس کمان کے ہر ہر حصے میں تیر لگے ہوئے ہیں، اور دنیا میں کوئی جگہ ایسی محفوظ نہیں ہے، جس جگہ پر وہ تیر نہ پہنچ سکتے ہوں۔ پوری دنیا کا چپہ چپہ اس کی زد میں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ایسے تیر انداز کے تیروں سے بچنے کی کیا صورت ہے؟ کون سی جگہ ایسی ہے جہاں پر جا کر ان تیروں سے بچا جا سکے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر تم تیروں سے بچنا چاہتے ہو تو اس تیر انداز کے پہلو میں جا کر کھڑے ہو جاؤ، اس کے علاوہ کوئی اور جگہ بچاؤ کی نہیں ہے' اسی طرح یہ مصائب، یہ حوادثات، یہ پریشانیاں اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے فیصلوں کے تیر ہیں۔ ان تیروں سے اگر بچاؤ کی کوئی جگہ ہے تو وہ اللہ تعالیٰ ہی کے دامنِ رحمت میں ہے۔ اس کے علاوہ کوئی جگہ نہیں ہے' اس لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہئے کہ یا اللہ! ناقابلِ برداشت تکلیف مت دیجئے اور جب تکلیف دیں تو اس پر صبر بھی عطا فرمادیں اور اس کو میری مغفرت اور ترقی درجات کا ذریعہ بنائیے۔ آمین۔

ایک نادان بچے سے سبق لیں

آپ نے چھوٹے بچے کو دیکھا ہوگا کہ جب ماں اس کو مارتی ہے، اس وقت بھی وہ ماں ہی کی گود میں اور زیادہ گھستا ہے، حالانکہ جانتا ہے کہ میری ماں مجھے مار رہی ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ بچہ یہ بھی جانتا ہے کہ ماں پٹائی تو کر رہی ہے لیکن اس پٹائی کا علاج بھی اسی کے پاس ہے اور مجھے شفقت اور محبت بھی اسی کی آغوش میں مل سکتی ہے' لہٰذا جب بھی کوئی ناگوار بات یا واقعہ پیش آجائے تو یہ سوچو کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اور اسی کی آغوشِ رحمت میں مجھے پناہ مل سکتی ہے، یہ سوچ کر پھر اسی سے اس کے ازالے کی اور اس پر صبر کی دعا کریں یہ ہے ''رضا بالقضاء''

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو عطا فرمادیں۔ آمین

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الدعوات، باب اذا بات طاهرا وفضله، رقم: ٥٨٣٦

اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر رضامندی خیر کی دلیل ہے

ایک اور حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِذَا اَرَادَ اللّٰہُ بِعَبْدٍ خَیْرًا اَرْضَاہُ بِمَا قَسَّمَ لَہٗ وَبَارَکَ لَہٗ فِیْہِ، وَاِذَا لَمْ یُرِدْ بِہٖ خَیْرًا، لَمْ یُرْضِہٖ بِمَا قَسَّمَ لَہٗ وَلَمْ یُبَارِکْ لَہٗ فِیْہِ)) (۱)

جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے ساتھ بھلائی اور خیر کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کو اپنی قسمت پر راضی کر دیتے ہیں، اور اس قسمت میں اس کے لئے برکت بھی عطا فرماتے ہیں، اور جب کسی سے بھلائی کا ارادہ نہ فرمائیں (العیاذ باللہ) تو اس کو اس کی قسمت پر راضی نہیں کرتے۔ یعنی اس کے دل میں قسمت پر اطمینان اور رضا پیدا نہیں ہوتی۔ اور اس کے نتیجے میں یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ حاصل ہے، اس میں بھی برکت نہیں ہوتی' اس حدیث کے ذریعہ یہ بتا دیا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے خیر کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کو قسمت پر راضی کر دیتے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ پھر یہ ہوتا ہے کہ اگر چہ اس کو تھوڑا ملا ہو، لیکن اس تھوڑے میں ہی اللہ تعالیٰ برکت عطا فرما دیتے ہیں۔

برکت کا مطلب اور مفہوم

آج کی دنیا گنتی کی دنیا ہے اور ہر چیز کی گنتی گنی جاتی ہے۔ مثلاً ایک شخص کہتا ہے کہ مجھے ایک ہزار روپے ملتے ہیں۔ دوسرا کہتا ہے کہ مجھے دو ہزار روپے ملتے ہیں۔ تیسرا کہتا ہے کہ مجھے دس ہزار روپے ملتے ہیں، لیکن کوئی شخص یہ نہیں دیکھتا کہ اس گنتی کے نتیجے میں مجھے کتنی راحت ملی؟ کتنا آرام ملا؟ کتنی عافیت حاصل ہوئی؟ اب مثلاً ایک شخص کو پچاس ہزار روپے مل گئے۔ لیکن گھر کے اندر پریشانیاں، بیماریاں ہیں اور سکون حاصل نہیں ہے اور ہر وقت پریشانی کے اندر مبتلا ہے۔ اب بتایئے وہ پچاس ہزار کس کام کے؟ اس سے پتہ چلا کہ وہ پچاس ہزار روپے برکت والے نہیں تھے۔ بے برکتی والے ہیں' ایک دوسرا شخص ہے جس کو ایک ہزار روپے ملے۔ لیکن اس کو راحت اور آرام اور عافیت میسر ہے۔ تو اگر چہ وہ گنتی میں ایک ہزار ہیں، لیکن اپنے حاصل اور نتائج کے اعتبار سے یہ ایک ہزار والا پچاس ہزار والے سے آگے بڑھ گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ہزار برکت والے تھے اور اس ایک ہزار سے بے شمار کام اور فائدے حاصل ہو گئے۔

(۱) کنز العمال، رقم: ۷۱۱۷، جامع الأحادیث، رقم: ۱۲۴۸

ایک نواب کا واقعہ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ نے مواعظ میں لکھا ہے کہ لکھنؤ میں ایک نواب تھے۔ ان کی بڑی زمینیں، جائیدادیں، نوکر چاکر وغیرہ سب کچھ تھا۔ ایک مرتبہ میری ان سے ملاقات ہوئی تو ان نواب صاحب نے خود مجھے بتایا کہ "میں اپنے بارے میں آپ کو کیا بتاؤں کہ میرے پاس یہ ساری دولتیں ہیں، جو آپ دیکھ رہے ہیں، لیکن مجھے ایک ایسی بیماری لاحق ہوگئی ہے کہ اس کی وجہ سے کوئی چیز نہیں کھا سکتا۔ اور میرے معالج نے میرے لئے صرف ایک غذا تجویز کی ہے۔ وہ یہ کہ گوشت کا قیمہ بناؤ، اور اس قیمہ کو ایک کپڑے میں باندھ کر اس کا رس نکالو اور اس کو چمچے کے ذریعہ پیو" اب دیکھئے، دستر خوان پر دنیا بھر کے انواع و اقسام کے کھانے چنے ہوئے ہیں، ہزار قسم کی نعمتیں حاصل ہیں لیکن صاحب بہادر نہیں کھا سکتے۔ اس لئے کہ بیمار ہیں۔ ڈاکٹر نے منع کر دیا ہے۔ بتاؤ، وہ دولت کس کام کی جس کو انسان اپنی مرضی سے استعمال نہ کر سکے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس نعمت میں برکت نہیں ڈالی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ نعمت بیکار ہوگئی —— ایک دوسرا آدمی ہے جو محنت مزدوری کرتا ہے، ساگ روٹی کھاتا ہے، لیکن بھرپور بھوک کے ساتھ اور پوری لذت کے ساتھ کھاتا ہے، اور وہ کھانا اس کے جسم کو جا کر لگتا ہے۔ اب بتائیے یہ مزدور بہتر ہے یا وہ نواب بہتر ہے؟ حالانکہ گنتی اس کی زیادہ ہے، اور اس مزدور کی گنتی کم ہے۔ لیکن راحت اس مزدور کو نصیب ہے۔ اس نواب کو میسر نہیں، اس کا نام ہے برکت۔

قسمت پر راضی رہو

بہرحال، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرا جو بندہ قسمت پر راضی ہو جائے اور قسمت پر راضی ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تدبیر چھوڑ دے، اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے، بلکہ کام کرتا رہے، لیکن ساتھ میں اس پر راضی ہو کہ اس کام کرنے کے نتیجے میں جو کچھ مجھے مل رہا ہے، وہ میرے لئے بہتر ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کے لئے اسی میں برکت عطا فرما دیتے ہیں۔ اسی کو راحت کا سبب بنا دیتے ہیں' اور اگر کوئی شخص قسمت پر راضی نہ ہو، بلکہ ہر وقت ناشکری کرتا رہے اور یہ کہتا رہے کہ مجھے تو ملا ہی کیا ہے۔ میں تو محروم رہ گیا۔ میں تو پیچھے رہ گیا۔ تو اس کا نتیجہ پھر یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ تھوڑا بہت ملا ہوا ہے، اس کی لذت سے بھی محروم ہو جاتا ہے اور اس میں برکت نہیں ہوتی' انجام تو وہی ہوگا جو اللہ تعالیٰ چاہیں گے، اور اتنا ہی ملے گا جتنا اللہ تعالیٰ چاہیں گے، تمہارے رونے سے، ناشکری کرنے سے تمہاری حالت نہیں بدل جائے گی، لیکن اس ناشکری سے نقصان یہ ہوگا کہ موجودہ نعمت سے جو نفع حاصل ہو سکتا

تھا وہ بھی حاصل نہ ہوا۔

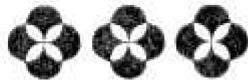
میرے پیمانے میں لیکن حاصلِ میخانہ ہے

اس لئے اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی نعمتوں پر راضی رہو، چاہے وہ مال و دولت کی نعمت ہو، پیشے کی نعمت ہو، صحت کی نعمت ہو، حسن و جمال کی نعمت ہو، دنیا کی ہر دولت اور نعمت پر راضی رہو، اور یہ سوچو کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمت جس مقدار میں مجھے عطا فرمائی ہے وہ میرے حق میں بہتر ہے۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک شعر ہے جو یاد رکھنے کے قابل ہے۔ فرمایا۔

مجھ کو اس سے کیا غرض کس جام میں ہے کتنی مے
میرے پیمانے میں لیکن حاصلِ میخانہ ہے

یعنی دوسروں کے پیالوں میں کتنی مے بھری ہے، مجھے اس سے کیا تعلق، لیکن میرے پیمانے میں جو مے ہے، وہ میرے لئے کافی ہے۔ لہٰذا مجھے اس سے کیا غرض کہ کسی کو ہزار مل گئے، کسی کو لاکھ ملے، کوئی کروڑ پتی بن گیا، لیکن جو کچھ مجھے ملا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔ میں اسی میں مگن ہوں، اور اس پر خوش ہوں، بس یہ فکر حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی فکر سے قناعت حاصل ہوتی ہے۔ اسی سے رضا بالقضاء حاصل ہوتی ہے۔ اسی سے تکلیفیں اور صدمے دور ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے یہ فکر عطا فرمادے اور اس کو ہمارا حال بنادے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔



فتنہ کے دور کی نشانیاں ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ إِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ (۱)

وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((اِذَا رَأَيْتَ شُحًّا مُطَاعًا وَهَوًى مُتَّبَعًا وَدُنْيَا مُؤْثَرَةً وَاِعْجَابَ كُلِّ ذِىْ رَأْيٍ بِرَأْيِهٖ فَعَلَيْكَ يَعْنِىْ بِنَفْسِكَ وَدَعْ عَنْكَ الْعَوَامَّ)) (۲)

حضور ﷺ تمام قوموں کے لئے قیامت تک کے لئے نبی ہیں

حضور اقدس ﷺ کی تعلیمات کے سلسلہ میں آج ایک ایسے موضوع پر مختصراً عرض کرنا چاہتا ہوں جس کی آج ضرورت بھی ہے، اور آپ ﷺ کے ارشادات اور تعلیمات کا یہ پہلو بہت کم بیان کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور اقدس ﷺ کو اس دنیا میں خاتم النبیین بنا کر مبعوث فرمایا۔ آپ پر نبوت کے سلسلے کی تکمیل ہوگئی۔ اور آپ کو دوسرے انبیاء پر یہ امتیاز عطا فرمایا کہ پہلے جو انبیاء تشریف لاتے تھے، وہ عموماً کسی خاص قوم کے لئے اور خاص جگہ کے لئے اور خاص زمانے کے لئے ہوتے تھے۔ ان

☆ اصلاحی خطبات (۷/۲۲۵-۲۶۵)، ۱۴ جولائی، بیت المکرم، کراچی

(۱) المائدہ: ۱۰۵

(۲) سنن أبی داؤد، کتاب لملاحم، باب الأمر والنهی، رقم: ۳۷۷۸، سنن الترمذی، کتاب التفسیر القرآن عن رسول الله، باب من سورة المائدة، رقم: ۲۹۸۴، سنن ابن ماجه، کتاب الفتن، رقم: ۴۰۰۴

کی تعلیمات اور دعوت ایک خاص علاقے تک محدود ہوتی تھی۔ اور ایک خاص زمانے تک محدود ہوتی تھی۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر کے علاقے میں بنی اسرائیل کی طرف مبعوث فرمائے گئے۔ اسی قوم اور اسی علاقے تک آپ کی نبوت اور رسالت محدود تھی۔ لیکن حضور نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے کسی خاص قوم، کسی خاص قبیلے اور کسی خاص جگہ کے لئے نبی نہیں بنایا تھا، بلکہ پوری دنیا، پوری انسانیت اور قیامِ قیامت تک تمام زمانوں کے لئے نبی بنایا تھا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَمَآ أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا﴾ (۱)

''اے نبی (ﷺ) ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لئے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے''

تمام انسانوں سے مراد یہ ہے کہ وہ جہاں بھی بسنے والے ہوں اور جس زمانے میں بھی آنے والے ہوں، ان سب کی طرف آپ کو بھیجا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی رسالت صرف عرب تک مخصوص نہیں۔ اور صرف کسی ایک زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں۔ بلکہ قیامِ قیامت تک جتنے آنے والے زمانے ہیں، ان سب کے لئے آپ کو رسول بنایا۔

آئندہ پیش آنے والے حالات کی اطلاع

اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ آپ کی تعلیمات اور آپ کے بتائے ہوئے احکام قیامت تک نافذ العمل ہیں۔ کسی زمانے کے ساتھ آپ کی تعلیمات مخصوص نہیں۔ اسی لئے حضورِ اقدس ﷺ نے ہمیں جو تعلیمات عطا فرمائیں وہ زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہیں۔ اور پھر ان تعلیمات کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو میں تو شریعت کا بیان ہے کہ فلاں چیز حلال ہے اور فلاں حرام ہے، یہ کام جائز ہے، اور یہ کام ناجائز ہے۔ فلاں عمل واجب ہے۔ فلاں عمل مسنون ہے۔ فلاں عمل مستحب ہے۔ وغیرہ۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اُمت کو آئندہ آنے والے زمانوں میں کیا کیا حالات آنے والے ہیں، اور اُمت کو کن کن مسائل سے دوچار ہونا ہے اور اِن حالات میں اُمت کو کیا کرنا چاہئے؟

یہ دوسرا پہلو بھی حضورِ اقدس ﷺ کی تعلیمات کا بہت اہم حصہ ہے۔ چنانچہ آپ نے نگاہِ نبوت سے آئندہ پیش آنے والے اہم واقعات کو دیکھنے کے بعد اُمت کو خبر دی کہ آئندہ زمانے میں یہ واقعہ پیش آنے والا ہے اور یہ حالات پیش آنے والے ہیں۔ اور ساتھ میں آپ ﷺ نے اُمت کو یہ بھی بتایا کہ جب ایسے حالات پیش آئیں تو ایک مؤمن کو اور سیدھے راستے پر چلنے والے کو کیا طریقہ اختیار کرنا چاہئے؟ اور کیا طرز اختیار کرنا چاہئے؟ آج اس دوسرے پہلو پر تھوڑی سی گزارشات عرض

(۱) سبا: ۲۸

کرنا چاہتا ہوں۔

اُمت کی نجات کی فکر

حضور اقدس ﷺ کو اپنی اُمت کی ایسی فکر تھی کہ اس فکر کے اندر آپ ہر وقت پریشان رہتے تھے، چنانچہ ایک حدیث میں ہے:

"كَانَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَائِمُ الْفِكْرَةِ مُتَوَاصِلُ الْأَحْزَانِ"(۱)

یعنی حضور اقدس ﷺ ہمیشہ فکرمند، سوچ میں ڈوبے ہوئے ہوتے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر وقت آپ پر کوئی غم چھایا ہوا ہے۔ کیا وہ غم پیسے جمع کرنے کا تھا؟ یا وہ غم اپنی شان و شوکت بڑھانے کا تھا؟ بلکہ وہ غم اس بات کا تھا کہ جس قوم کی طرف مجھے بھیجا گیا ہے، میں اس کو کس طرح جہنم کی آگ سے بچاؤں۔ اور کس طرح ان کو گمراہی سے نکال کر سیدھے راستے پر لے آؤں۔ اور اس شدید غم میں مبتلا ہونے کی وجہ سے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے بار بار آیات نازل فرمائیں۔ جن میں آپ کو اس غم کرنے سے روکا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ﴾ (۲)

"آپ اپنی جان کو کیوں ہلاک کر رہے ہیں، اس وجہ سے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لا رہے ہیں"

ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ میری مثال اس شخص جیسی ہے جس نے ایک آگ سلگائی اور آگ کو دیکھ کر پروانے آگ پر گرنے لگے۔ وہ شخص ان پروانوں کو آگ سے دور رکھنے کی کوشش کر رہا ہے تاکہ وہ آگ میں گر کر جل نہ جائیں۔ اسی طرح میں بھی تمہیں جہنم کی آگ سے بچانے کی کوشش کر رہا ہوں، تمہاری کمریں پکڑ پکڑ کر تمہیں روک رہا ہوں۔ مگر تم جہنم کی آگ کے اندر گرے جا رہے ہو۔ (۳)

آپ کو اپنی اُمت کی اتنی فکر تھی، اور صرف اس اُمت کی فکر نہیں تھی جو آپ کے زمانے میں موجود تھی، بلکہ آئندہ آنے والے زمانے کے لوگوں کی بھی آپ کو فکر تھی۔

---

(۱) الشمائل المحمدية والخصائل المصطفوية، رقم: ۲۲٦

(۲) الشعراء: ۳

(۳) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب الانتهاء عن المعاصی، رقم: ٦۰۰۲، صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب شفقته علی أمته ومبالغته فی تحذیرهم مما یضرهم، رقم: ٤۲۳٤، سنن الترمذی، کتاب الأمثال عن رسول الله صلی الله علیه وسلم، رقم: ۲۷۹۹، مسند أحمد، رقم: ۷۰۱۹

آئندہ کیا کیا فتنے آنے والے ہیں؟

چنانچہ آپ ﷺ نے آئندہ آنے والے لوگوں کو بتایا کہ تمہارے زمانے میں کیا کیا حالات پیش آنے والے ہیں؟ چنانچہ تقریباً تمام احادیث کی کتابوں میں ایک مستقل باب "ابواب الفتن" کے نام سے موجود ہے، جس میں ان احادیث کو جمع کیا گیا ہے جن میں حضورِ اقدس ﷺ نے آنے والے فتنوں کے بارے میں لوگوں کو بتایا اور ان کو خبردار کیا کہ دیکھو! آئندہ زمانے میں یہ یہ فتنے آنے والے ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((تَقَعُ الْفِتَنُ فِیْ بُیُوْتِکُمْ کَوَقْعِ الْمَطَرِ))[1]

یعنی آئندہ زمانے میں فتنے تمہارے گھروں میں اس طرح گریں گے جیسے بارش کے قطرے گرتے ہیں۔ بارش کے قطروں سے اس لئے تشبیہ دی کہ جس طرح بارش کا پانی کثرت سے گرتا ہے، اسی طرح وہ فتنے بھی کثرت سے آئیں گے۔ اور دوسرے یہ کہ بارش کا پانی جس طرح مسلسل گرتا ہے کہ ایک قطرے کے بعد دوسرا قطرہ، دوسرے کے بعد فوراً تیسرا قطرہ، اسی طرح وہ فتنے بھی مسلسل اور لگاتار آئیں گے کہ ابھی ایک فتنہ آکر ختم نہیں ہوگا کہ دوسرا فتنہ کھڑا ہو جائے گا۔ دوسرے کے بعد تیسرا آئے گا۔ اور یہ فتنے تمہارے گھروں میں آکر گریں گے۔

ایک دوسری حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((سَتَکُوْنُ فِتَنٌ کَقِطَعِ اللَّیْلِ الْمُظْلِمِ))[2]

عنقریب اندھیری رات کی تاریکیوں کی طرح تاریک فتنے ہوں گے۔ یعنی جس طرح تاریک رات میں انسان کو کچھ نظر نہیں آتا کہ کہاں جائے، راستہ کہاں ہے؟ اسی طرح ان فتنوں کے زمانے میں بھی یہ سمجھ میں نہیں آئے گا کہ انسان کیا کرے اور کیا نہ کرے؟ اور وہ فتنے تمہارے پورے معاشرے اور ماحول کو گھیر لیں گے، اور بظاہر تمہیں ان سے کوئی جائے پناہ نظر نہیں آئے گی۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان فتنوں سے پناہ کی دعا بھی مانگا کرو اور یہ دعا کیا کرو:

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْفِتَنِ مَا ظَھَرَ مِنْھَا وَمَا بَطَنَ))[3]

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الحج، باب آطام المدینة،رقم:۱۷۲۲، صحیح مسلم، کتاب الفتن وأشراط الساعة، باب نزول الفتن کمواقع المطر،رقم:۵۱۳۵، مسند أحمد بن حنبل، رقم:۲۰۸۰۹

(۲) کنز العمال، رقم:۲۱۹۹

(۳) مسند أحمد، باب بداية مسند عبدالله بن العباس، رقم: ٢٦٤٢

اے اللہ! ہم آنے والے فتنوں سے آپ کی پناہ چاہتے ہیں۔ ظاہری فتنوں سے بھی اور باطنی فتنوں سے بھی پناہ چاہتے ہیں۔ دونوں قسم کے فتنوں سے پناہ مانگا کرو۔ اور یہ دعا حضورِ اقدس ﷺ کے معمولات کی دعاؤں میں شامل تھی۔

فتنہ کیا ہے؟

اب اس کو سمجھنا چاہئے کہ ''فتنہ'' کیا چیز ہے؟ کس کو ''فتنہ'' کہتے ہیں؟ اور اس ''فتنہ'' کے دور میں ہمارے اور آپ کے لئے حضورِ اقدس ﷺ کی تعلیم کیا ہے؟ اور اس میں ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ اب یہ لفظ تو ہم صبح و شام استعمال کرتے ہیں کہ یہ بڑے فتنے کا دور ہے۔ قرآن کریم میں بھی ''فتنہ'' کا لفظ کئی بار آیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا:

﴿ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ﴾ (۱)

''اللہ کے نزدیک فتنہ قتل سے بھی زیادہ شدید چیز ہے''

''فتنہ'' کے معنی اور مفہوم

''فتنہ'' عربی زبان کا لفظ ہے، لغت میں اس کے معنی ہیں ''سونے یا چاندی وغیرہ کو آگ پر پگھلا کر اس کا کھرا کھوٹا معلوم کرنا'' آگ میں تپا کر اس کی حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ یہ خالص ہے یا نہیں؟ اسی وجہ سے اس لفظ کو آزمائش اور امتحان کے معنی میں بھی استعمال کیا جانے لگا، چنانچہ ''فتنہ'' کے دوسرے معنی ہوئے آزمائش، لہٰذا جب انسان پر کوئی تکلیف یا مصیبت یا پریشانی آئے اور اس کے نتیجے میں انسان کی اندرونی کیفیت کی آزمائش ہو جائے کہ وہ انسان ایسی حالت میں کیا طرزِ عمل اختیار کرتا ہے؟ آیا اس وقت صبر کرتا ہے یا واویلا کرتا ہے، فرمانبردار رہتا ہے یا نافرمان ہو جاتا ہے، اِس آزمائش کو بھی ''فتنہ'' کہا جاتا ہے۔

حدیث شریف میں ''فتنہ'' کا لفظ

حدیث شریف میں ''فتنہ'' کا لفظ جس چیز کے لئے استعمال ہوا ہے وہ یہ ہے کہ کسی بھی وقت کوئی ایسی صورتِ حال پیدا ہو جائے جس میں حق مشتبہ ہو جائے اور حق و باطل میں امتیاز کرنا مشکل ہو جائے، صحیح اور غلط میں امتیاز باقی نہ رہے۔ یہ پتہ نہ چلے کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے؟ جب یہ صورتِ حال پیدا ہو جائے تو یہ کہا جائے گا کہ یہ فتنے کا دور ہے۔ اسی طرح معاشرے کے اندر گناہ،

(۱) البقرۃ:۱۹۱

فسق و فجور، نافرمانیاں عام ہو جائیں تو اس کو بھی ''فتنہ'' کہا جاتا ہے۔ اسی طرح جو چیز حق نہ ہو اس کو حق سمجھنا، اور جو چیز دلیلِ ثبوت نہ ہو اس کو دلیلِ ثبوت سمجھ لینا بھی ایک ''فتنہ'' ہے۔ جیسے آج کل صورتِ حال ہے کہ اگر کسی سے دین کی بات کہو کہ فلاں کام گناہ ہے، ناجائز ہے، بدعت ہے۔ جواب میں وہ شخص کہتا ہے کہ ارے! یہ کام تو سب کر رہے ہیں، اگر یہ کام گناہ اور ناجائز ہے تو پھر ساری دنیا یہ کام کیوں کر رہی ہے۔ یہ کام تو سعودی عرب میں بھی ہو رہا ہے۔ آج کے دور میں یہ ایک نئی مستقل دلیل ایجاد ہو چکی ہے کہ ہم نے یہ کام سعودی عرب میں ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کام سعودی عرب میں ہوتا ہو وہ یقینی طور پر حق اور درست ہے۔ یہ بھی ایک ''فتنہ'' ہے کہ جو چیز حق کی دلیل نہیں تھی اس کو دلیل سمجھ لیا گیا ہے۔ اسی طرح شہر کے اندر بہت ساری جماعتیں کھڑی ہو گئیں۔ اور یہ پتہ نہیں چل رہا ہے کہ کون حق پر ہے اور کون باطل پر ہے۔ کون صحیح کہہ رہا ہے اور کون غلط کہہ رہا ہے۔ اور حق و باطل کے درمیان امتیاز کرنا مشکل ہو گیا، یہ بھی ''فتنہ'' ہے۔

دو جماعتوں کی لڑائی ''فتنہ'' ہے

اسی طرح جب دو مسلمان یا مسلمانوں کی دو جماعتیں آپس میں لڑ پڑیں، اور ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار آ جائیں، اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جائیں، اور یہ پتہ چلانا مشکل ہو جائے کہ حق پر کون ہے اور باطل پر کون ہے، تو یہ بھی ایک ''فتنہ'' ہے۔ ایک حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِذَا الْتَقَا الْمُسْلِمَانِ بِسَیْفَیْهِمَا فَالْقَاتِلُ وَالْمَقْتُوْلُ كِلَاهُمَا فِی النَّارِ))(۱)

جب دو مسلمان تلواریں لے کر آپس میں لڑنے لگیں تو قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں جائیں گے۔ ایک صحابی نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! قاتل کا جہنم میں جانا تو ٹھیک ہے، اس لئے کہ اس نے ایک مسلمان کو قتل کر دیا، لیکن مقتول جہنم میں کیوں جائے گا؟ حضور اکرم ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ مقتول اس لئے جہنم میں جائے گا کہ وہ بھی اسی ارادے سے ہتھیار لے کر نکلا تھا کہ میں دوسرے کو قتل کر دوں۔ اس کا داؤ چل جاتا تو یہ قتل کر دیتا۔ لیکن اُس کا داؤ چل گیا اس لئے اُس نے قتل کر دیا۔ ان میں سے کوئی بھی اللہ کے لئے نہیں لڑ رہا تھا، بلکہ دنیا کے لئے، دولت کے لئے، اور سیاسی مقاصد کیلئے لڑ رہے تھے، اور دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، لہٰذا دونوں جہنم میں جائیں گے۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب وان طائفتان من المؤمنین...... الخ، رقم: ۳۰، صحیح مسلم، کتاب الفتن وأشراط الساعة، رقم: ۵۱۳۹، سنن النسائی، کتاب تحریم الدم، رقم: ۴۰۴۸، سنن أبی داؤد، کتاب الفتن والملاحم، رقم: ۳۷۲۳

قتل و غارت گری ''فتنہ'' ہے

ایک اور حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّ مِنْ وَّرَائِکُمْ اَیَّامًا یُرْفَعُ فِیْهَا الْعِلْمُ وَیَکْثُرُ فِیْهَا الْهَرَجُ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! مَا الْهَرَجُ؟ قَالَ: اَلْقَتْلُ))(۱)

یعنی لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا جس میں ''ہرج'' بہت زیادہ ہو جائے گا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ یہ ہرج کیا چیز ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ قتل و غارت گری، یعنی اس زمانے میں قتل و غارت گری بے حد ہو جائے گی اور انسان کی جان مچھر مکھی سے زیادہ بے حقیقت ہو جائے گی۔ ایک اور حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((یَاْتِیْ عَلَی النَّاسِ یَوْمٌ لَا یَدْرِی الْقَاتِلُ فِیْمَ قَتَلَ، وَلَا الْمَقْتُوْلُ فِیْمَ قُتِلَ، فَقِیْلَ: کَیْفَ یَکُوْنُ ذٰلِكَ؟ قَالَ: اَلْهَرَجُ، اَلْقَاتِلُ وَالْمَقْتُوْلُ فِی النَّارِ))(۲)

یعنی لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ جس میں قاتل کو یہ معلوم نہیں ہوگا کہ میں نے کیوں قتل کیا۔ اور مقتول کو یہ پتہ نہیں ہوگا کہ میں کیوں قتل کیا گیا؟ آج کے زمانے کے موجودہ حالات پر نظر ڈال لو، اور حضور اقدس ﷺ کے ان الفاظ کو پڑھ لو۔ ایسا لگتا ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے اس زمانے کو دیکھ کر یہ الفاظ ارشاد فرمائے تھے۔ پہلے زمانے میں تو یہ ہوتا تھا کہ یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ کس نے مارا، لیکن یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ شخص کیوں مارا گیا۔ مثلاً مال چھیننے کی وجہ سے مارا گیا، ڈاکوؤں نے مار دیا، دشمنی کی وجہ سے مار دیا گیا، مارے جانے کے اسباب سامنے آجاتے تھے۔ لیکن آج یہ حال ہے کہ ایک شخص ہے، کسی سے نہ کچھ لینا نہ دینا، نہ کسی سیاسی جماعت سے تعلق، نہ کسی سے کوئی جھگڑا، بس بیٹھے بٹھائے مارا گیا۔ یہ ساری باتیں حضور اقدس ﷺ صاف صاف بتا گئے۔

مکہ مکرمہ کے بارے میں ایک حدیث

ایک حدیث جو حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے مکہ مکرمہ

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الفتن، باب ظهور الفتن، رقم: ٦٥٣٨، صحیح مسلم، کتاب العلم، رقم: ٤٨٢٦۔ سنن الترمذی، کتاب الفتن عن رسول اللّٰه، ٢١٢٦، واضح رہے کہ اصلاحی خطبات میں اس حدیث میں لفظ ''الحرج'' پرنٹ ہوا ہے، جبکہ درست لفظ ''الهرج'' ہے۔

(۲) صحیح مسلم، کتاب الفتن وأشراط الساعة، باب لا تقوم الساعة حتّٰی یمر الرجل بقبر الرجل...... الخ، رقم: ٥١٧٨

کے بارے میں فرمایا:

((اِذَا رَأَیْتَ مَکَّۃَ قَدْ بُعِجَتْ کَظَائِمَ وَسَاوٰی بِنَاؤُھَا رُؤُوْسَ الْجِبَالِ فَاعْلَمْ أَنَّ الْأَمْرَ قَدْ أَظَلَّکَ))(۱)

''جب مکہ مکرمہ کا پیٹ چاک کر دیا جائے گا، اور اس میں نہروں جیسے راستے نکال دیئے جائیں گے، اور مکہ مکرمہ کی عمارتیں اس کے پہاڑوں سے زیادہ بلند ہو جائیں گی، جب یہ چیزیں نظر آئیں گی تو سمجھ لو کہ فتنے کا وقت قریب آ گیا''

آج سے چند سال پہلے تک اس حدیث کا صحیح مطلب لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ لیکن اب سمجھ میں آ گیا۔

مکہ مکرمہ کا پیٹ چاک ہونا

یہ حدیث چودہ سو سال سے حدیث کی کتابوں میں لکھی چلی آ رہی ہے، اور اس حدیث کی تشریح کرتے وقت شرّاحِ حدیث حیران تھے کہ مکہ مکرمہ کا پیٹ کس طرح چاک ہوگا؟ اور نہروں جیسے راستے بننے کا کیا مطلب ہے؟ کیونکہ اس کا کرنا مشکل تھا۔ لیکن آج کے مکہ مکرمہ کو دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے آج کے مکہ مکرمہ کو دیکھ کر یہ باتیں ارشاد فرمائی تھیں۔ آج مکہ مکرمہ کو چاک کر کے اس میں بے شمار سرنگیں نکال دی گئی ہیں۔ آج سے پہلے شرّاحِ حدیث فرماتے تھے کہ اس وقت تو یہ مکہ مکرمہ کا علاقہ خشک اور سنگلاخ پہاڑی علاقہ ہے، لیکن آئندہ کسی زمانے میں اللہ تعالیٰ اس میں نہریں اور ندیاں جاری کر دیں گے۔ لیکن آج ان سرنگوں کو دیکھ کر یہ نظر آ رہا ہے کہ کس طرح مکہ مکرمہ کا پیٹ چاک کر دیا گیا۔

عمارتوں کا پہاڑوں سے بلند ہونا

دوسرا جملہ آپ ﷺ نے یہ فرمایا تھا کہ جب اس کی عمارتیں پہاڑوں سے بھی بلند ہو جائیں گی۔ آج سے چند سال پہلے تک کسی کے تصور میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ مکہ مکرمہ میں پہاڑوں سے بھی زیادہ بلند عمارتیں بن جائیں گی۔ کیونکہ سارا مکہ پہاڑوں کے درمیان گھرا ہوا ہے۔ لیکن آج مکہ مکرمہ میں جا کر دیکھ لیں کہ کس طرح پہاڑوں سے بلند عمارتیں بنی ہوئی ہیں۔

اس حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے چودہ سو سال پہلے آج کے حالات گویا اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بیان فرما دیئے تھے، اللہ تعالیٰ کے عطا فرمودہ وحی اور علم کے ذریعہ یہ ساری

(۱) تاج العروس، مادۃ بعج، لسان العرب، مادۃ بعج

باتیں روزِ روشن کی طرح آشکار کردی گئی تھیں، آپ نے ایک ایک چیز کھول کھول کر بیان فرمادی کہ آئندہ زمانے میں کیا ہونے والا ہے۔ اور آپ نے یہ بتایا کہ اس زمانے میں مسلمانوں کو کیا کیا مشکلات اور فتنے پیش آنے والے ہیں۔ اور ساتھ میں یہ بھی بتادیا کہ اس وقت میں ایک مسلمان کو کیا راہِ عمل اختیار کرنا چاہئے؟

موجودہ دور احادیث کی روشنی میں

جن احادیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے آئندہ آنے والے فتنوں کی نشان دہی فرمائی ہے، ہر مسلمان کو وہ احادیث یاد رکھنی چاہئیں۔ حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی صاحب مدظلہم نے ایک کتاب ''عصر حاضر حدیث کے آئینے میں'' کے نام سے تحریر فرمائی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے فتنوں سے متعلق تمام احادیث کو جمع کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ اس میں ایک حدیث ایسی لائے ہیں جس میں حضورِ اقدس ﷺ نے فتنہ کے دور کی ۷۲ باتیں بیان فرمائی ہیں۔ ان کو آپ سنتے جائیں اور اپنے گردوپیش کا جائزہ لیتے جائیں کہ یہ سب باتیں ہمارے موجودہ ماحول پر کس طرح صادق آرہی ہیں۔

فتنہ کی ۷۲ نشانیاں

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے قریب ۷۲ باتیں پیش آئیں گی۔

(۱) لوگ نمازیں غارت کرنے لگیں گے۔ یعنی نمازوں کا اہتمام رخصت ہوجائے گا۔ یہ بات اگر اس زمانے میں کہی جائے تو کوئی زیادہ تعجب کی بات نہیں سمجھی جائے گی۔ اس لئے کہ آج مسلمانوں کی اکثریت ایسی ہے جو نماز کی پابند نہیں ہے۔ العیاذ باللہ۔ لیکن حضورِ اقدس ﷺ نے یہ بات اس وقت ارشاد فرمائی تھی جب نماز کو کفر اور ایمان کے درمیان حدِ فاصل قرار دیا گیا تھا۔ اس زمانے میں مؤمن کتنا ہی بُرے سے بُرا ہو، فاسق و فاجر ہو، بدکار ہو، لیکن نماز نہیں چھوڑتا تھا۔ اس زمانے میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ لوگ نمازیں غارت کرنے لگیں گے۔

(۲) امانت ضائع کرنے لگیں گے۔ یعنی جو امانتیں ان کے پاس رکھی جائیں گی، اس میں خیانت کرنے لگیں گے۔

(۳) سود کھانے لگیں گے۔

(۴) جھوٹ کو حلال سمجھنے لگیں گے۔ یعنی جھوٹ ایک فن اور ہنر بن جائے گا۔

(۵) معمولی معمولی باتوں پر خونریزی کرنے لگیں گے۔ ذرا سی بات پر دوسرے کی جان لے لیں گے۔

(۶) اُونچی اُونچی بلڈنگیں بنائیں گے۔

(۷) دین بیچ کر دنیا جمع کریں گے۔

(۸) قطع رحمی، یعنی رشتہ داروں سے بدسلوکی ہوگی۔

(۹) انصاف نایاب ہوجائے گا۔

(۱۰) جھوٹ سچ بن جائے گا۔

(۱۱) لباس ریشم کا پہنا جائے گا۔

(۱۲) ظلم عام ہوجائے گا۔

(۱۳) طلاقوں کی کثرت ہوگی۔

(۱۴) ناگہانی موت عام ہوجائے گی۔ یعنی ایسی موت عام ہوجائے گی جس کا پہلے سے پتہ نہیں ہوگا۔ بلکہ اچانک پتہ چلے گا کہ فلاں شخص ابھی زندہ اور ٹھیک ٹھاک تھا اور اب مر گیا۔

(۱۵) خیانت کرنے والے کو امین سمجھا جائے گا۔

(۱۶) امانت دار کو خائن سمجھا جائے گا۔ یعنی امانت دار پر تہمت لگائی جائے گی کہ یہ خائن ہے۔

(۱۷) جھوٹے کو سچا سمجھا جائے گا۔

(۱۸) سچے کو جھوٹا کہا جائے گا۔

(۱۹) تہمت درازی عام ہوجائے گی۔ یعنی لوگ ایک دوسرے پر جھوٹی تہمتیں لگائیں گے۔

(۲۰) بارش کے باوجود گرمی ہوگی۔

(۲۱) لوگ اولاد کی خواہش کرنے کے بجائے اولاد سے کراہیت کریں گے۔ یعنی جس طرح لوگ اولاد ہونے کی دعائیں کرتے ہیں، اس کے بجائے لوگ یہ دعائیں کریں گے کہ اولاد نہ ہو۔ چنانچہ آج دیکھ لیں کہ خاندانی منصوبہ بندی ہو رہی ہے۔ اور یہ نعرہ لگا رہے ہیں کہ بچے دو ہی اچھے۔

(۲۲) کمینوں کے ٹھاٹھ ہوں گے۔ یعنی کمینے لوگ بڑے ٹھاٹھ سے عیش و عشرت کے ساتھ زندگی گزاریں گے۔

(۲۳) شریفوں کے ناک میں دم آجائے گا۔ یعنی شریف لوگ شرافت کو لے کر بیٹھیں گے تو دنیا سے کٹ جائیں گے۔

(۲۴) امیر اور وزیر جھوٹ کے عادی بن جائیں گے۔ یعنی سربراہِ حکومت اور اس کے اعوان و انصار اور وزراء جھوٹ کے عادی بن جائیں گے، اور صبح شام جھوٹ بولیں گے۔

(۲۵) امین خیانت کرنے لگیں گے۔
(۲۶) سردار ظلم پیشہ ہوں گے۔
(۲۷) عالم اور قاری بدکار ہوں گے۔ یعنی عالم بھی ہیں اور قرآن کریم کی تلاوت بھی کررہے ہیں، مگر بدکار ہیں۔ العیاذ باللہ
(۲۸) لوگ جانوروں کی کھالوں کا لباس پہنیں گے۔
(۲۹) مگر ان کے دل مردار سے زیادہ بدبودار ہوں گے۔ یعنی لوگ جانوروں کی کھالوں سے بنے ہوئے اعلیٰ درجے کے لباس پہنیں گے۔ لیکن ان کے دل مردار سے زیادہ بدبودار ہوں گے۔
(۳۰) اور ایلوے سے زیادہ کڑوے ہوں گے۔
(۳۱) سونا عام ہوجائے گا۔
(۳۲) چاندی کی مانگ ہوگی۔
(۳۳) گناہ زیادہ ہوجائیں گے۔
(۳۴) امن کم ہوجائے گا۔
(۳۵) قرآن کریم کے نسخوں کو آراستہ کیا جائے گا اور اس پر نقش و نگار بنایا جائے گا۔
(۳۶) مسجدوں میں نقش و نگار کیے جائیں گے۔
(۳۷) اُونچے اُونچے مینار بنیں گے۔
(۳۸) لیکن دل ویران ہوں گے۔
(۳۹) شرابیں پی جائیں گی۔
(۴۰) شرعی سزاؤں کو معطل کردیا جائے گا۔
(۴۱) لونڈی اپنے آقا کو جنے گی۔ یعنی بیٹی ماں پر حکمرانی کرے گی۔ اور اس کے ساتھ ایسا سلوک کرے گی جیسے آقا اپنی کنیز کے ساتھ سلوک کرتا ہے۔
(۴۲) جو لوگ ننگے پاؤں، ننگے بدن، غیر مہذب ہوں گے وہ بادشاہ بن جائیں گے۔ کمینے اور نیچ ذات کے لوگ جو نسبی اور اخلاق کے اعتبار سے کمینے اور نیچے درجے کے سمجھے جاتے ہیں، وہ سربراہ بن کر حکومت کریں گے۔
(۴۳) تجارت میں عورت مرد کے ساتھ شرکت کرے گی۔ جیسے آج کل ہورہا ہے کہ عورتیں زندگی کے ہر کام میں مردوں کے شانہ بشانہ چلنے کی کوشش کررہی ہیں۔
(۴۴) مرد عورتوں کی نقالی کریں گے۔
(۴۵) عورتیں مردوں کی نقالی کریں گی۔

یعنی مرد عورتوں جیسا حلیہ بنائیں گے اور عورتیں مردوں جیسا حلیہ بنائیں گی۔ آج دیکھ لیں کہ نئے فیشن نے یہ حالت کر دی ہے کہ دور سے دیکھو تو پتہ لگانا مشکل ہوتا ہے کہ یہ مرد ہے یا عورت ہے۔

(۴۶) غیر اللہ کی قسمیں کھائی جائیں گی۔ یعنی قسم تو صرف اللہ کی یا اللہ کی صفت کی اور قرآن کی کھانا جائز ہے، دوسری چیزوں کی قسم کھانا حرام ہے، لیکن اس وقت لوگ اور چیزوں کی قسم کھائیں گے۔ مثلاً تیرے سر کی قسم وغیرہ۔

(۴۷) مسلمان بھی بغیر کہے جھوٹی گواہی دینے کو تیار ہوگا۔ لفظ ''بھی'' کے ذریعہ یہ بتادیا کہ اور لوگ تو یہ کام کرتے ہی ہیں، لیکن اس وقت مسلمان بھی جھوٹی گواہی دینے کو تیار ہو جائیں گے۔

(۴۸) صرف جان پہچان کے لوگوں کو سلام کیا جائے گا۔

مطلب یہ ہے کہ اگر راستے میں کہیں سے گزر رہے ہیں تو ان لوگوں کو سلام نہیں کیا جائے گا جن سے جان پہچان نہیں ہے، اگر جان پہچان ہے تو سلام کرلیں گے۔ حالانکہ حضورِ اقدس ﷺ کا فرمان یہ ہے:

((اَلسَّلَامُ عَلٰی مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَّمْ تَعْرِفْ)) (۱)

''جس کو تم جانتے ہو، اس کو بھی سلام کرو، اور جس کو تم نہیں جانتے، اس کو بھی سلام کرو''

خاص طور پر اس وقت جب کہ راستے میں اِکادُکا آدمی گزر رہے ہوں تو اس وقت سب آنے جانے والوں کو سلام کرنا چاہئے۔ لیکن اگر آنے جانے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہو، اور سلام کی وجہ سے اپنے کام میں خلل آنے کا اندیشہ ہو تو پھر سلام نہ کرنے کی بھی گنجائش ہے۔ لیکن ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اِکادُکا آدمی گزر رہے ہوں گے تب بھی سلام نہیں کریں گے اور سلام کا رواج ختم ہو جائے گا۔

(۴۹) غیر دین کے لئے شرعی علم پڑھا جائے گا۔ یعنی شرعی علم دین کے لئے نہیں، بلکہ دنیا کے لئے پڑھا جائے گا۔ العیاذ باللہ۔ اور مقصد یہ ہوگا کہ اس کے ذریعہ ہمیں ڈگری مل جائے گی، ملازمت مل جائے گی، پیسے مل جائیں گے، عزت اور شہرت حاصل ہو جائے گی۔ ان مقاصد کے لئے دین کا علم پڑھا جائے گا۔

(۵۰) آخرت کے کام سے دنیا کمائی جائے گی۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب اطعام الطعام من الاسلام، رقم: ۱۱، صحیح مسلم، کتاب الایمان، بیان تفاضل الاسلام وأی أموره أفضل، رقم: ۵۶، سنن النسائی، کتاب الایمان وشرائعه، باب أی الاسلام خیر، ۴۹۱۴، سنن ابن ماجه، کتاب الأطعمة، باب اطعام الطعام، رقم: ۳۲۴۴

(۵۱) مالِ غنیمت کو ذاتی جاگیر سمجھ لیا جائے گا۔ مالِ غنیمت سے مراد قومی خزانہ ہے۔ یعنی قومی خزانہ کو ذاتی جاگیر اور ذاتی دولت سمجھ کر معاملہ کریں گے۔

(۵۲) امانت کو لوٹ کا مال سمجھا جائے گا۔ یعنی اگر کسی نے امانت رکھوادی تو سمجھیں گے کہ یہ لوٹ کا مال حاصل ہوگیا۔

(۵۳) زکوٰۃ کو جرمانہ سمجھا جائے گا۔

(۵۴) سب سے رذیل آدمی قوم کا لیڈر اور قائد بن جائے گا۔ یعنی قوم میں جو شخص سب سے زیادہ رذیل اور بدخصلت انسان ہوگا، اس کو قوم کے لوگ اپنا قائد، اپنا ہیرو اور اپنا سربراہ بنالیں گے۔

(۵۵) آدمی اپنے باپ کی نافرمانی کرے گا۔

(۵۶) آدمی اپنی ماں سے بدسلوکی کرے گا۔

(۵۷) دوست کو نقصان پہنچانے سے گریز نہیں کرے گا۔

(۵۸) بیوی کی اطاعت کرے گا۔

(۵۹) بدکاروں کی آوازیں مسجدوں میں بلند ہوں گی۔

(۶۰) گانے والی عورتوں کی تعظیم و تکریم کی جائے گی۔ یعنی جو عورتیں گانے بجانے کا پیشہ کرنے والی ہیں، ان کی تعظیم اور تکریم کی جائے گی اور ان کو بلند مرتبہ دیا جائے گا۔

(۶۱) گانے بجانے کے اور موسیقی کے آلات کو سنبھال کر رکھا جائے گا۔

(۶۲) سرِ راہ شرابیں پی جائیں گی۔

(۶۳) ظلم کو فخر سمجھا جائے گا۔

(۶۴) انصاف بکنے لگے گا۔ یعنی عدالتوں میں انصاف فروخت ہوگا۔ لوگ پیسے دے کر اس کو خریدیں گے۔

(۶۵) پولیس والوں کی کثرت ہوجائے گی۔

(۶۶) قرآنِ کریم کو نغمہ سرائی کا ذریعہ بنالیا جائے گا۔ یعنی موسیقی کے بدلے میں قرآن کی تلاوت کی جائے گی، تاکہ اس کے ذریعہ ترنم کا حظ اور مزہ حاصل ہو۔ اور قرآن کی دعوت اور اس کو سمجھنے یا اس کے ذریعہ اجر و ثواب حاصل کرنے کے لئے تلاوت نہیں کی جائے گی۔

(۶۷) درندوں کی کھال استعمال کی جائے گی۔

(۶۸) اُمت کے آخری لوگ اپنے سے پہلے لوگوں پر لعن طعن کریں گے۔ یعنی ان پر تنقید کریں گے اور ان پر اعتماد نہیں کریں گے، اور تنقید کرتے ہوئے یہ کہیں گے کہ انہوں نے یہ بات غلط کہی۔ اور یہ غلط طریقہ اختیار کیا۔ چنانچہ آج بہت بڑی مخلوق صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی شان میں

گستاخیاں کر رہی ہے، بہت سے لوگ ان ائمۂ دین کی شان میں گستاخیاں کر رہے ہیں جن کے ذریعہ یہ دین ہم تک پہنچا، اور ان کو بیوقوف بتا رہے ہیں کہ وہ لوگ قرآن و حدیث کو نہیں سمجھے، دین کو نہیں سمجھے۔ آج ہم نے دین کو صحیح سمجھا ہے۔

پھر فرمایا کہ جب یہ علامات ظاہر ہوں تو اس وقت اس کا انتظار کرو کہ

(۶۹) یا تو تم پر سرخ آندھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آجائے۔

(۷۰) یا زلزلے آجائیں۔

(۷۱) یا لوگوں کی صورتیں بدل جائیں۔

(۷۲) یا آسمان سے پتھر برسیں۔ یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی اور عذاب آجائے۔ العیاذ باللہ۔ اب آپ ان علامات میں ذرا غور کر کے دیکھیں کہ یہ سب علامات ایک ایک کر کے کس طرح ہمارے معاشرے پر صادق آرہی ہیں۔ اور اِس وقت جو عذاب ہم پر مسلط ہے وہ درحقیقت انہی بداعمالیوں کا نتیجہ ہے۔(۱)

مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا

ایک اور حدیث میں حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب میری اُمت میں پندرہ کام عام ہو جائیں گے تو ان پر مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! وہ پندرہ کام کون سے ہیں؟ جواب میں آپ نے فرمایا:

(۱) جب سرکاری خزانے کو لوٹ کا مال سمجھا جانے لگے۔ دیکھ لیجئے کہ آج کس طرح قومی خزانے کو لوٹا جا رہا ہے، اور پھر یہ صرف حکمرانوں کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ جب حکمران لوٹتے ہیں تو عوام میں سے جس کا بھی داؤ چل جائے وہ بھی لوٹتا ہے۔ چنانچہ بہت سے کام ایسے ہیں جس میں ہم اور آپ اس بات کی پرواہ نہیں کرتے کہ اس کام کی وجہ سے ہماری طرف سے قومی خزانے پر لوٹ ہو رہی ہے۔ مثلاً بجلی کی چوری ہے کہ کہیں سے خلافِ قانون کنکشن لے لیا اور اس کو استعمال کرنا شروع کر دیا، یہ قومی خزانے کی چوری ہے۔ یا مثلاً ٹیلیفون ایکسچینج والے سے دوستی کر لی، اور اب اس کے ذریعہ لمبی لمبی کالیں مفت کی جا رہی ہیں۔ یہ بھی قومی خزانے کی چوری ہے۔ یا مثلاً ریل کے ذریعہ بلاٹکٹ سفر کیا۔ یہ بھی قومی خزانے کی چوری ہے۔ یا مثلاً ریل میں اُونچے درجے میں سفر کر لیا، جبکہ ٹکٹ نیچے درجہ کا خریدا ہے۔ یہ بھی قومی خزانے کی چوری ہے۔

اور یہ قومی خزانے کی چوری عام چوری سے بہت زیادہ خطرناک ہے۔ اس لئے کہ اگر انسان

(۱) الدر المنثور (۶/۵۲)

کسی کے گھر پر چوری کرلے اور بعد میں اس کی تلافی کرنا چاہے تو اس کی تلافی کرنا آسان ہے کہ جتنی رقم چوری کی ہے اتنی رقم اس کو لے جاکر واپس کردے، یا اس سے جاکر معاف کرالے کہ مجھ سے غلطی ہوگئی تھی، مجھے معاف کردینا، اور اس نے معاف کردیا تو انشاء اللہ معاف ہو جائے گا۔ لیکن قومی خزانے کے اندر لاکھوں انسانوں کا حصہ ہے۔ اور ہر انسان کی اس میں ملکیت ہے۔ اگر اس مال کو چوری کرلیا یا زیادتی کرلی تو اب کس کس انسان سے معاف کراؤ گے؟ اور جب تک ان لاکھوں حقداروں سے معاف نہیں کراؤ گے اس وقت تک معافی نہیں ہوگی۔ اس لئے عام مال کی چوری کی معافی آسان ہے، لیکن قومی خزانے کی چوری کے بعد اس کی معافی بہت مشکل ہے۔ العیاذ باللہ۔

(۲) جب امانت کو لوگ لوٹ کا مال سمجھنے لگیں، اور اس میں خیانت کرنے لگیں۔

(۳) اور جب لوگ زکوٰۃ کو تاوان اور جرمانہ سمجھنے لگیں۔

(۴) آدمی بیوی کی اطاعت کرے، اور ماں کی نافرمانی کرنے لگے۔ یعنی آدمی بیوی کی خوشنودی کی خاطر ماں کی نافرمانی کرے۔ مثلاً بیوی ایک ایسے غلط کام کو کرنے کے لئے کہہ رہی ہے جس میں ماں کی نافرمانی ہو رہی ہے تو وہ شخص ماں کی حرمت کو نظر انداز کردیتا ہے اور بیوی کو راضی کرنے کے لئے وہ کام کرلیتا ہے۔

(۵) اور آدمی دوست کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا اور باپ کے ساتھ برا سلوک کرے گا، یعنی دوست کے ساتھ دوستی کا لحاظ کرے گا، لیکن باپ کے ساتھ سختی اور بدسلوکی کا معاملہ کرے گا۔

(۶) مسجدوں میں آوازیں بلند ہوں گی۔ مسجدیں تو اس لئے وضع کی گئی ہیں کہ ان میں اللہ کا ذکر کیا جائے، اور اللہ کی عبادت اور ذکر کرنے والوں کے ذکر اور عبادت میں کوئی خلل نہ ڈالا جائے۔ لیکن لوگ مسجدوں میں آوازیں بلند کرکے خلل ڈالیں گے، چنانچہ آج کل الحمدللہ مسجدوں میں نکاح کرنے کا رواج تو ہوگیا ہے، جو اچھا رواج ہے، لیکن نکاح کے موقع پر مسجد کی حرمت کا لحاظ نہیں کیا جاتا، اور اس وقت شور کیا جاتا ہے، آوازیں بلند کی جاتی ہیں، جو ایک گناہِ بےلذت ہے۔ اس لئے کہ بعض گناہ وہ ہوتے ہیں جس کے کرنے میں کچھ لذت اور مزہ بھی آتا ہے لیکن یہ گناہ ایسا ہے کہ جس کے کرنے میں کوئی لذت اور مزہ نہیں ہے بلکہ مسجد میں آواز بلند کرکے بلاوجہ اپنے سر گناہ لے لیا۔

(۷) قوم کا لیڈر ان کا ذلیل ترین آدمی ہوگا۔

(۸) آدمی کی عزت اس کے شر کے خوف سے کی جانے لگے کہ اگر اس کی عزت نہیں کروں گا تو یہ مجھے کسی نہ کسی مصیبت میں پھنسا دے گا۔

(۱۰) اور شرابیں پی جانے لگیں گی۔

(۱۱) ریشم پہنا جائے گا۔

(۱۲) گانے بجانے والی عورتیں رکھی جائیں گی۔ اور موسیقی کے آلات سنبھال سنبھال کے رکھے جائیں گے۔ یہ اس وقت حضورِ اقدس ﷺ فرمارہے ہیں جب اِن باتوں کا تصور بھی نہیں تھا۔ اور حضورِ اقدس ﷺ نے جو لفظ استعمال فرمایا وہ یہ کہ گانے بجانے والی عورتیں رکھنے لگیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ہر شخص گانے بجانے والی عورتیں تو اپنے پاس کیسے رکھ سکتا ہے اس لئے کہ ہر شخص کے اندر اتنی استطاعت کہاں کہ وہ گانے بجانے والی عورت کو اپنے پاس رکھے۔ اور جب چاہے اس سے گانے سنے۔ لیکن ریڈیو، ٹیپ ریکارڈر، ٹی وی اور وی سی آر نے اس مسئلہ کو آسان کردیا۔ اب ہر شخص کے گھر میں ریڈیو اور ٹی وی موجود ہے۔ ویڈیو کیسٹ موجود ہے۔ جب چاہے گانا سنے اور گانے والی عورت کو دیکھ لے۔

اسی طرح گانے بجانے کے آلات ہر شخص اپنے پاس نہیں رکھتا، لیکن آج کے ریڈیو، ٹی وی اور وی سی آر نے یہ باجے گھر گھر پہنچادیئے، اور اب آلاتِ موسیقی خرید کر لانے کی ضرورت نہیں۔ بس ٹی وی آن کردو تو آلاتِ موسیقی کے تمام مقاصد اس کے ذریعہ تمہیں حاصل ہوجائیں گے۔

(۱۳) اور اس اُمت کے آخری لوگ پہلے لوگوں پر لعنت کرنے لگیں۔ بہر حال، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب یہ باتیں میری اُمت میں پیدا ہوجائیں گی تو ان پر مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا۔

العیاذ باللہ۔ اس حدیث میں بھی جتنی باتیں حضورِ اقدس ﷺ نے بیان فرمائی ہیں وہ سب باتیں آج ہمارے معاشرے میں موجود ہیں۔

شراب کو شربت کے نام سے پیا جائے گا

ایک اور حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب میری اُمت کے لوگ شراب کو شربت کہہ کر حلال کرنے لگیں۔ مثلاً شراب کو کہیں کہ یہ تو ایک شربت ہے، اس کے حرام ہونے کا کیا مطلب؟ چنانچہ آج لوگوں نے اس موضوع پر کتابیں اور مقالے لکھ دیئے کہ موجودہ شراب حرام نہیں ہے، اور قرآن کریم میں شراب کے لئے کہیں حرام کا لفظ نہیں آیا ہے، اس لئے شراب حرام نہیں۔ اور یہ جو بیئر ہے یہ جَو کا پانی ہے، اور جس طرح دوسرے شربت ہوتے ہیں یہ بھی ایک شربت ہے۔ اس طرح آج شراب کو حلال کرنے پر دلائل پیش کیے جارہے ہیں۔ یہ وہی بات ہے جس کی خبر حضورِ اقدس ﷺ نے آج سے چودہ سو سال پہلے دیدی تھی۔

سود کو تجارت کا نام دیا جائے گا

اور جب میری اُمت کے لوگ سود کو تجارت کہہ کر حلال کرنے لگیں کہ یہ سود بھی ایک تجارت

ہے۔ جیسے آج کل کہا جا رہا ہے کہ یہ بینکوں میں جو سود کا لین دین ہو رہا ہے، یہ تجارت کی ہی ایک شکل ہے، اگر اس کو بند کر دیا تو ہماری تجارت ختم ہو جائے گی۔

رشوت کو ہدیہ کا نام دیا جائے گا

اور جب میری اُمت کے لوگ رشوت کو ہدیہ کہہ کر حلال کرنے لگیں۔ مثلاً رشوت دینے والا یہ کہے کہ یہ ہم نے آپ کو ہدیہ دیا ہے، اور رشوت لینے والا رشوت کو ہدیہ کہہ کر اپنے پاس رکھ لے۔ حالانکہ حقیقت میں وہ رشوت ہے۔ چنانچہ آج کل یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ اور زکوٰۃ کے مال کو مالِ تجارت بنالیں تو اس وقت اس اُمت کی ہلاکت کا وقت آجائے گا۔ العیاذ باللہ۔ یہ چاروں باتیں جو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائیں، وہ ہمارے موجودہ دور پر پوری طرح صادق آرہی ہیں۔ (۱)

کشنوں پر سوار ہو کر مسجد میں آنا

ایک حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آخری دور میں (فتنے کے زمانے میں) لوگ میاسر پر سوار ہو کر آئیں گے اور مسجد کے دروازوں پر اُتریں گے۔ "میاسر" عربی زبان میں بڑے عالیشان ریشمی کپڑے کو کہتے ہیں جو اس زمانے میں بہت شان وشوکت اور دبدبے والے لوگ اپنے گھوڑے کی زین پر ڈالا کرتے تھے اور بطور "کشن" کے استعمال کرتے تھے۔ گویا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کشنوں پر سواری کر کے مسجد کے دروازوں پر اُتریں گے۔ پہلے زمانے میں اس کا تصور مشکل تھا کہ لوگ کشنوں پر سواری کر کے کس طرح آکر مسجد کے دروازوں پر اُتریں گے۔ لیکن اب کاریں ایجاد ہو گئیں تو دیکھیں کہ کس طرح لوگ کاروں میں سوار ہو کر آرہے ہیں اور مسجد کے دروازوں پر اُتر رہے ہیں۔

عورتیں لباس پہننے کے باوجود ننگی

آگے فرمایا کہ "ان کی عورتیں لباس پہننے کے باوجود ننگی ہوں گی"۔ پہلے زمانے میں اس کا تصور بھی مشکل تھا کہ لباس پہننے کے باوجود کس طرح ننگی ہوں گی، لیکن آج آنکھوں سے نظر آرہا ہے کہ لباس پہننے کے باوجود عورتیں کس طرح ننگی ہیں۔ اس لئے کہ یا تو وہ لباس اتنا باریک ہے کہ جسم اس سے نظر آرہا ہے، یا وہ لباس اتنا مختصر اور چھوٹا ہے کہ لباس پہننے کے باوجود اعضاء پورے نہیں چھپے، یا وہ لباس اتنا چست ہے کہ اس کی وجہ سے سارے اعضاء نمایاں ہو رہے ہیں۔

(۱) کنز العمال، رقم: ۳۸۴۹۷

عورتوں کے بال اُونٹ کے کوہان کی طرح

آگے فرمایا کہ "ان عورتوں کے سروں پر اُونٹوں کے کوہان جیسے بال ہوں گے" یہ حدیث بھی ان احادیث میں سے ہے کہ پچھلے علماء اس کی شرح کے وقت حیران ہوتے تھے کہ اُونٹوں کے کوہان جیسے بال کیسے ہوں گے۔ اس لئے کہ اُونٹوں کا کوہان تو اُٹھا ہوا اُونچا ہوتا ہے، بال کس طرح اُونچے ہو جائیں گے۔ لیکن آج اس دور نے ناقابلِ تصور چیز کو حقیقت بنا کر آنکھوں کے سامنے دکھا دیا۔ اور موجودہ دور کی عورتوں کی جو تشبیہ آپ ﷺ نے بیان فرمائی، اس سے بہتر تشبیہ کوئی اور نہیں ہوسکتی تھی۔

یہ عورتیں ملعون ہیں

آگے فرمایا کہ "ایسی عورتوں پر لعنت بھیجو، اس لئے کہ ایسی عورتیں ملعون ہیں۔" اللہ تعالیٰ نے عورت کو ایک ایسی چیز بنایا ہے جو اپنے دائرے کے اندر محدود رہے۔ اور جب یہ عورت بے پردہ باہر نکلتی ہے تو حدیث شریف میں ہے کہ شیطان اس کی تانک جھانک میں لگ جاتا ہے[1] اور فرمایا کہ جب عورت خوشبو لگا کر بازاروں کے اندر جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر لعنت ہوتی ہے۔ اور فرشتے ایسی عورت پر لعنت بھیجتے ہیں۔

لباس کا مقصدِ اصلی

لباس کا اصل مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سترِ عورت حاصل ہوجائے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿یَا بَنِیۡۤ آدَمَ قَدۡ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکُمۡ لِبَاسًا یُّوَارِیۡ سَوۡءٰتِکُمۡ وَرِیۡشًا﴾ (۲)

"یعنی ہم نے لباس اس لئے اُتارا تاکہ وہ تمہارے ستر کو چھپائے اور زینت کا سامان ہو"

لہٰذا جو لباس ستر کو نہ چھپائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ لباس کا جو اصل مقصد تھا وہ فوت کر دیا گیا۔ اور جب اصل مقصد فوت ہوگیا تو لباس پہننے کے باوجود وہ لباس پہننے والا برہنہ ہے۔ خدا کے لئے اس کا اہتمام کریں کہ ہمارا لباس درست ہو۔ آج کل اچھے خاصے دیندار، نمازی، پرہیزگار لوگوں کے اندر بھی اس کا اہتمام ختم ہوگیا ہے۔ لباس میں اس کی پرواہ نہیں کہ اس میں پردہ پورا ہو رہا ہے یا نہیں؟ انہی چیزوں کا وبال آج ہم لوگ بھگت رہے ہیں۔ لہٰذا کم از کم اپنے گھرانوں میں اور اپنے

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الرضاع، باب ما جاء فی کراهية الدخول علی المغیبات، رقم: ۱۰۹۳

(۲) الأعراف: ۲٦

خاندانوں میں اس کا اہتمام کرلیں کہ لباس شریعت کے مطابق ہو، اور اس میں پردہ کا لحاظ ہو، اور حضورِ اقدس ﷺ کی لعنت کی وعید سے محفوظ ہو۔

دوسری قومیں مسلمانوں کو کھائیں گی

ایک حدیث میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم پر ایک ایسا وقت آنے والا ہے کہ دنیا کی دوسری قومیں تمہیں کھانے کے لئے ایک دوسرے کو دعوت دیں گی۔ جیسے لوگ دسترخوان پر بیٹھ کر دوسروں کو کھانے کی دعوت دیتے ہیں۔ مثلاً دسترخوان بچھا ہوا ہے، اس پر کھانے چنے ہوئے ہیں۔ اس پر ایک آدمی بیٹھا ہے۔ اتنے میں دوسرا شخص آگیا تو پہلا اس سے کہتا ہے کہ آؤ کھانا تناول کرو اور کھانے میں شریک ہو جاؤ۔ اسی طرح ایک وقت ایسا آئے گا کہ اس وقت مسلمانوں کا دسترخوان بچھا ہوگا، اور مسلمانوں کی حیثیت ایسی ہوگی جیسے دسترخوان پر کھانا ہوتا ہے۔ اور بڑی بڑی قومیں اور طاقتیں مسلمانوں کو کھا رہی ہوں گی۔ اور دوسری قوموں کو دعوت دے رہی ہوں گی کہ آؤ اور مسلمانوں کو کھاؤ۔ (1)

جن حضرات کو پچھلے سو سال کی تاریخ کا علم ہے یعنی پہلی جنگِ عظیم سے لے کر آج تک غیر مسلم قوموں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے، اور وہ کس طرح مسلمان ملکوں کو آپس میں تقسیم کرتی رہی ہیں کہ اچھا مصر تمہارا اور شام ہمارا، الجزائر تمہارا اور مراکش ہمارا، ہندوستان تمہارا اور برما ہمارا وغیرہ۔ گویا کہ آپس میں ایک دوسرے کی دعوت ہو رہی ہے کہ آؤ ان کو لے جا کر کھا لو۔

مسلمان تنکوں کی طرح ہوں گے

جب حضورِ اقدس ﷺ نے مسلمانوں کی حالت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے بیان فرمائی تو کسی صحابی نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! کیا اس وقت ہماری تعداد بہت کم رہ جائے گی جس کی وجہ سے دوسرے لوگ مسلمانوں کو کھانے لگیں گے اور دوسروں کو بھی کھانے کی دعوت دینے لگیں گے؟ جواب میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: نہیں، اس وقت تمہاری تعداد بہت زیادہ ہوگی۔ چنانچہ آج مسلمانوں کی تعداد ایک ارب سے زیادہ ہے۔ گویا کہ دنیا کی ایک تہائی آبادی مسلمانوں کی ہے۔ لیکن تمہاری مثال ایسی ہوگی جیسے سیلاب میں بہتے ہوئے بے شمار تنکے ہوتے ہیں۔ یعنی جیسے ایک پانی کا سیلاب جا رہا ہے اور اس میں بے شمار تنکے گرے ہوئے ہیں جن کی کوئی گنتی نہیں ہو سکتی، لیکن وہ تنکے

---

(1) سنن أبي داؤد، كتاب الملاحم، باب في تداعي الامم على الاسلام، رقم: ٣٧٤٥، مسند أحمد، رقم: ٢١٣٦٣

سیلاب میں بہے چلے جارہے ہیں، ان تنکوں کی اپنی کوئی طاقت نہیں، اپنا کوئی فیصلہ نہیں، اپنا کوئی اختیار نہیں، پانی جہاں بہا کر لے جارہا ہے وہاں جارہے ہیں۔

مسلمان بزدل ہو جائیں گے

آگے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہارا رعب نکال لیں گے اور تمہارے دلوں میں کمزوری اور بزدلی آجائے گی'' ایک صحابی نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! یہ کمزوری اور بزدلی کیا چیز ہے؟ گویا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی ہے کہ مسلمان اور بزدل؟ مسلمان اور کمزور؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ جواب میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ کمزوری یہ ہے کہ دنیا کی محبت دل میں آجائے گی اور موت سے نفرت ہو جائے گی۔ اور موت کا مطلب ہے ''اللہ تعالیٰ سے ملاقات'' گویا کہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات سے نفرت ہوجائے گی۔ اور اس وقت یہ فکر ہوگی کہ دنیا حاصل ہو، پیسہ حاصل ہو، شہرت اور عزت حاصل ہو، چاہے حلال طریقے سے ہو یا حرام طریقے سے ہو۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بہادری

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا حال یہ تھا کہ ایک غزوہ میں ایک صحابی اکیلے رہ گئے۔ سامنے سے تین چار کافر مسلح جنگجو پہلوان قسم کے آگئے۔ یہ صحابی تنہا تھے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر ان سے مقابلہ کرنا چاہا تو اتنے میں دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وہاں پہنچ گئے۔ اور انہوں نے کہا کہ تم اکیلے ہو اور یہ زیادہ ہیں اور بڑے جنگجو اور پہلوان قسم کے لوگ بھی ہیں۔ اس لئے اس وقت بہتر یہ ہے کہ طرح دے جاؤ اور مقابلہ نہ کرو، اور ہمارے لشکر کے آنے کا انتظار کرلو۔ ان صحابی نے بے ساختہ جواب دیا کہ میں تمہیں قسم دیتا ہوں کہ تم میرے اور جنت کے درمیان حائل ہونے کی کوشش مت کرنا۔ یہ بڑے بڑے پہلوان تو میرے جنت میں پہنچنے کا راستہ ہیں۔ اور تم مجھے لڑنے سے روک رہے ہو اور میرے اور جنت کے درمیان حائل ہورہے ہو۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ حال تھا جس کی وجہ سے ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بزدلی کیا چیز ہے؟ اور کمزوری کیا چیز ہے؟ حضورِ اقدس ﷺ کی صحبت کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں سے دنیا کی محبت ختم فرمادی تھی۔ اور ہر وقت آنکھوں سے آخرت کو دیکھ رہے تھے۔ جنت اور دوزخ کا مشاہدہ کررہے تھے۔ اس وجہ سے مرنے سے نہیں ڈرتے تھے، بلکہ اس بات کی خواہش کرتے تھے کہ کسی طرح اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچ جائیں۔

ایک صحابی کا شوقِ شہادت

ایک صحابی ایک میدانِ جنگ میں پہنچے، دیکھا کہ سامنے کفار کا لشکر ہے، جو پورے اسلحے اور طاقت کے ساتھ حملہ آور ہوگا، اس لشکر کو دیکھ کر بے ساختہ زبان سے یہ شعر پڑھا:

غَدًا نَلْقَی الْأَحِبَّہ مُحَمَّدًا وَصَحْبَہ

''واہ واہ کیا بہترین نظارہ ہے۔ کل کو ہم اپنے دوستوں سے یعنی محمد ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ملاقات کریں گے'' (۱)

ایک صحابی کے تیر آ کر لگا۔ سینے سے خون کا فوارہ اُبل پڑا، اس وقت بے ساختہ زبان سے یہ کلمہ نکلا:

((فُزْتُ وَرَبِّ الْکَعْبَۃِ))

''ربِ کعبہ کی قسم، آج میں کامیاب ہوگیا'' (۲)

یہ حضرات ایمان اور یقین والے اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ رکھنے والے تھے، دنیا کی محبت جن کو چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔

''فتنہ'' کے دور کے لئے پہلا حکم

ایسی صورت میں ایک مسلمان کو کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہئے؟ اس کے بارے میں حضورِ اقدس ﷺ نے پہلا حکم یہ دیا:

((تَلْزَمُ جَمَاعَۃَ الْمُسْلِمِیْنَ وَاِمَامَھُمْ))

''پہلا کام یہ کرو کہ جمہور مسلمان اور ان کے امام کے ساتھ ہو جاؤ۔ اور جو لوگ بغاوت کر رہے ہیں ان سے کنارہ کشی اختیار کرلو اور ان کو چھوڑ دو''

ایک صحابی نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! اگر مسلمانوں کی اکثریت والی جماعت اور امام نہ ہو تو پھر آدمی کیا کرے؟ یعنی آپ نے جو حکم دیا وہ تو اس وقت ہے جب مسلمانوں کی متفقہ جماعت موجود ہو، ان کا ایک سربراہ ہو جس پر سب متفق ہوں، اور اس امام کی دیانت اور تقویٰ پر اعتماد ہو، تب تو

(۱) کتبِ تاریخ میں ان اشعار کے دو حوالے ملتے ہیں، پہلی مرتبہ یہ اشعار اشعریین اور اہل یمن کے وفود نے حضور ﷺ کی ملاقات سے پہلے کہے تھے، زاد المعاد (۳۲/۲)، اسی طرح حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ نے بھی اپنی وفات سے ایک دن پہلے یہ اشعار کہے تھے۔ سیر أعلام النبلاء (۳۵۹/۱)، اسد الغابۃ (۲۰۹/۱)

(۲) اس جملہ کے قائل حضرت عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ ہیں جنہوں نے غزوۂ بئر معونہ میں شہید ہونے سے قبل یہ جملہ کہا تھا۔ حیاۃ الصحابۃ (۶۵۰/۳)

اس کے ساتھ چلیں گے، لیکن اگر نہ جماعت ہو اور نہ متفقہ امام ہو تو اس صورت میں ہم کیا کریں؟

جواب میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا: ایسی صورت میں ہر جماعت اور ہر پارٹی سے الگ ہو کر زندگی گزارو اور اپنے گھروں کی ٹاٹ بن جاؤ۔ ٹاٹ جس سے بوریاں بنتی ہیں، پہلے زمانے میں اس کو بطور فرش کے بچھایا جاتا تھا۔ آج کل اس کی جگہ قالین بچھائے جاتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ جس طرح گھر کا قالین اور فرش ہوتا ہے، جب ایک مرتبہ اس کو بچھا دیا تو اب بار بار اس کو اس کی جگہ سے نہیں اُٹھاتے، اسی طرح تم بھی اپنے گھروں کے ٹاٹ اور فرش بن جاؤ، اور بلا ضرورت گھر سے باہر نہ نکلو، اور ان جماعتوں کے ساتھ شمولیت اختیار مت کرو۔ بلکہ ان سے کنارہ کش ہو جاؤ۔ الگ ہو جاؤ۔ کسی کا ساتھ مت دو۔ (۱)

اس سے زیادہ واضح بات اور کیا ہو سکتی ہے۔

''فتنہ'' کے دور کے لئے دوسرا حکم

ایک حدیث میں فرمایا کہ جس وقت تم لوگوں سے کنارہ کش ہو کر زندگی گزار رہے ہو، اس وقت اگر مسلمان آپس میں لڑ رہے ہوں، اور ان کے درمیان قتل و غارت گری ہو رہی ہو تو ان کو تماشہ کے طور پر بھی مت دیکھو۔ اِس لئے کہ جو شخص تماشہ کے طور پر ان فتنوں کی طرف جھانک کر دیکھے گا وہ فتنہ اس کو بھی اپنی طرف کھینچ لے گا اور اُچک لے گا، اس لئے ایسے وقت میں تماشہ دیکھنے کے لئے بھی گھر سے باہر نہ نکلو اور اپنے گھر میں بیٹھے رہو۔

''فتنہ'' کے دور کے لئے تیسرا حکم

ایک اور حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ وہ فتنے ایسے ہوں گے کہ اس میں یہ صورت ہوگی:

((اَلْقَائِمُ فِيْهَا خَيْرٌ مِنَ الْمَاشِيْ، وَالْقَاعِدُ فِيْهَا خَيْرٌ مِنَ الْقَائِمِ))

''کھڑا ہونے والا چلنے والے سے بہتر ہوگا، اور بیٹھنے والا کھڑے ہونے والے سے بہتر ہوگا'' (۲)

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوة فی الاسلام، رقم: ۳۳۳۸، صحیح مسلم، کتاب الأمارة، باب وجوب ملازمة جماعة المسلمين عند ظهور الفتن......الخ، رقم: ۳۴۳۴

(۲) صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوة فی الاسلام، رقم: ۳۳۳۴، صحیح مسلم، کتاب الفتن واشراط الساعة، باب نزول الفتن كمواقع القطر، رقم: ۵۱۳۶، سنن الترمذی، کتاب الفتن عن رسول الله، رقم: ۲۱۲۰

مطلب یہ ہے کہ اس فتنے کے اندر کسی قسم کا حصہ مت لو۔ اس فتنے کی طرف چلنا بھی خطرناک ہے۔ چلنے سے بہتر یہ ہے کہ کھڑے ہو جاؤ۔ اور کھڑا ہونا بھی خطرناک ہے، اس سے بہتر یہ ہے کہ بیٹھ جاؤ۔ اور بیٹھنا بھی خطرناک ہے، اس سے بہتر یہ ہے کہ لیٹ جاؤ۔ گویا کہ اپنے گھر میں بیٹھ کر اپنی ذاتی زندگی کو درست کرنے کی فکر کرو۔ اور گھر سے باہر نکل کر اجتماعی مصیبت اور اجتماعی فتنے کو دعوت مت دو۔

فتنہ کے دور کا بہترین مال

ایک اور حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اس میں آدمی کا سب سے بہتر مال اس کی بکریاں ہوں گی۔ جن کو وہ لے کر پہاڑ کی چوٹی پر چلا جائے اور شہروں کی زندگی چھوڑ دے۔(1)

اور ان بکریوں پر اکتفا کر کے اپنی زندگی بسر کرے۔ ایسا شخص سب سے زیادہ محفوظ ہوگا، کیونکہ شہروں میں اس کو ظاہری اور باطنی فتنے اُچکنے کے لئے تیار ہوں گے۔

فتنہ کے دور کے لئے ایک اہم حکم

ان تمام احادیث کے ذریعہ حضورِ اقدس ﷺ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ وہ وقت اجتماعی اور جماعتی کام کا نہیں ہوگا، کیونکہ جماعتیں سب کی سب غیر معتبر ہوں گی، کسی بھی جماعت پر بھروسہ کرنا مشکل ہوگا۔ حق اور باطل کا پتہ نہیں چلے گا۔ اس لئے ایسے وقت میں اپنی ذات کو ان فتنوں سے بچا کر اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں لگا کر کسی طرح اپنے ایمان کو قبر تک لے جاؤ۔ ان فتنوں سے بچاؤ کا صرف یہی ایک راستہ ہے۔ جو آیت میں نے شروع میں تلاوت کی ہے، وہ بھی اسی سیاق میں آئی ہے۔ فرمایا کہ اے ایمان والو! اپنی ذات کی خبر لو۔ اپنے آپ کو درست کرنے کی فکر کرو۔ اگر تم ہدایت پر آگئے تو پھر جو لوگ گمراہی کی طرف جا رہے ہیں ان کی گمراہی تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی اگر تم نے اپنی اصلاح کی فکر کر لی۔ روایت میں آتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! یہ آیت تو بتا رہی ہے کہ بس انسان صرف اپنی فکر کرے اور دوسرے کی فکر نہ کرے۔ اور اگر کوئی دوسرا شخص غلط راستے پر جا رہا ہے تو اس کو جانے دے اور اس کو امر بالمعروف

---

(1) صحیح البخاری، کتاب الفتن، باب اذا بقی فی حثالة من الناس، رقم: ٦٥٥٩، سنن النسائی، کتاب الایمان وشرائعه، رقم: ٤٩٥٠، سنن أبی داؤد، کتاب الفتن والملاحم، رقم: ٣٧٢٢، سنن ابن ماجه، کتاب الفتن، رقم: ٣٩٧٠

اور نہی عن المنکر نہ کرے، اس کو تبلیغ نہ کرے۔ جبکہ دوسری طرف یہ حکم آیا ہے کہ امر بالمعروف بھی کرنا چاہئے، اور نہی عن المنکر بھی کرنا چاہئے، اور دوسروں کو نیکی کی دعوت اور تبلیغ بھی کرنی چاہئے تو ان دونوں میں کس طرح تطبیق دی جائے؟

فتنہ کے دور کی چار علامتیں

جواب میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ وہ آیتیں بھی اپنی جگہ درست ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا چاہئے اور دعوت و تبلیغ کرنی چاہئے لیکن ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اس وقت انسان کے ذمّے صرف اپنی اصلاح کی فکر باقی رہے گی۔ اور یہ وہ زمانہ ہوگا جس میں چار علامتیں ظاہر ہو جائیں۔

(۱) پہلی علامت یہ ہے کہ اس زمانے میں انسان اپنے مال کی محبت کے جذبے کے پیچھے لگا ہوا ہو۔ اور اپنے جذبۂ بخل کی اطاعت کر رہا ہو۔ مال طلبی میں لگا ہوا ہو۔ صبح سے لے کر شام تک بس ذہن پر ایک ہی دُھن سوار ہو کہ جس طرح بھی ہو پیسے زیادہ آجائیں۔ دولت زیادہ ہو جائے۔ اور میری دنیا درست ہو جائے۔ اور ہر کام مال و دولت کی محبت میں کر رہا ہو۔

(۲) دوسری علامت یہ ہے کہ لوگ ہر وقت خواہشاتِ نفس کی پیروی میں لگے ہوئے ہوں۔ جس طرف انسان کی خواہش اس کو لے جا رہی ہو، وہ جا رہا ہو۔ یہ نہ دیکھ رہا ہو کہ یہ کام حلال ہے یا حرام ہے۔ اور نہ یہ دیکھ رہا ہو کہ یہ جنت کا راستہ ہے یا جہنم کا راستہ ہے۔ یہ اللہ کی رضامندی کا راستہ ہے یا ناراضگی کا راستہ ہے، ان سب چیزوں کو بھول کر اپنی خواہشاتِ نفس کے پیچھے دوڑا جا رہا ہو۔ یہ دوسری علامت ہے۔

(۳) تیسری علامت یہ ہے کہ جب دنیا کو آخرت پر ترجیح دی جانی لگے۔ یعنی آخرت کی تو بالکل فکر نہ ہو، لیکن دنیا کی اتنی زیادہ فکر ہو کہ لاکھ سمجھایا جائے اور بتایا جائے کہ آخرت آنے والی ہے، ایک دن مرنا ہے، اور قبر میں جانا ہے، اللہ کے سامنے پیشی ہوگی، ساری باتیں سمجھانے کے جواب میں وہ کہے کہ کیا کریں زمانہ ہی ایسا ہے، ہمیں آخر اسی دنیا میں سب کے ساتھ رہنا ہے، اس لئے اس دنیا کی بھی فکر کرنی چاہئے۔ گویا کہ ساری نصیحتوں اور وعظوں کو ہوا ہی میں اُڑا دے اور ان کی طرف کان نہ دھرے اور دنیا کمانے میں لگ جائے۔

(۴) چوتھی علامت یہ ہے کہ ہر انسان اپنی رائے پر گھمنڈ میں مبتلا ہو۔ دوسرے کی سننے کو تیار ہی نہ ہو۔ اور ہر انسان نے اپنا ایک موقف اختیار کر رکھا ہو۔ اور اسی میں اس طرح وہ مگن ہو کہ جو میں کہہ رہا ہوں وہ درست ہے، اور جو بات دوسرا کہہ رہا ہے وہ غلط ہے۔ جیسے آج کل یہی منظر نظر آتا ہے کہ ہر

انسان نے دین کے معاملے میں بھی اپنی ایک رائے متعین کرلی ہے کہ اس کے نزدیک کیا حلال ہے اور کیا حرام ہے۔ کیا جائز ہے اور کیا ناجائز ہے۔ حالانکہ ساری عمر میں کبھی ایک دن بھی قرآن و حدیث سمجھنے کے لئے خرچ نہیں کیا۔ لیکن جب اس کے سامنے شریعت کا کوئی حکم بیان کیا جائے تو فوراً یہ جواب دیتا ہے کہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ فوراً اپنی رائے پیش کرنی شروع کر دیتا ہے۔ اسی کے بارے میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ ہر شخص اپنی رائے پر گھمنڈ میں مبتلا ہوگا۔

بہرحال، جس زمانے میں یہ چار علامتیں ظاہر ہو جائیں یعنی جب مال کی محبت کی اطاعت ہونے لگے۔ لوگ خواہشاتِ نفس کے پیچھے پڑ جائیں۔ دنیا کو آخرت پر ترجیح دی جا رہی ہو۔ اور ہر شخص اپنی رائے پر گھمنڈ میں مبتلا ہو۔ اس وقت اپنی ذات کو بچانے کی فکر کرو۔ اور عام لوگوں کی فکر چھوڑ دو کہ عام لوگ کہاں جا رہے ہیں۔ اس لئے کہ وہ ایک فتنہ ہے۔ اگر عام لوگوں کی فکر کے لئے باہر نکلو گے تو وہ عام لوگ تمہیں پکڑ لیں گے۔ اور تمہیں بھی فتنے میں مبتلا کر دیں گے۔ اس لئے اپنی ذات کی فکر کرو اور اپنے آپ کو اصلاح کے راستے پر لانے کی کوشش کرو۔ گھر سے باہر نہ نکلو۔ گھر کے دروازے بند کرلو۔ گھر کی ٹاٹ بن جاؤ، اور تماشہ دیکھنے کے لئے بھی گھر سے باہر مت جھانکو۔ فتنے کے زمانے میں حضورِ اقدس ﷺ کی یہی تعلیم ہے۔

اختلافات میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طرزِ عمل

حضورِ اقدس ﷺ کے بعد جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا زمانہ آیا۔ اور خلافتِ راشدہ کے آخری دور میں بڑے زبردست اختلافات حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان پیش آئے۔ اور جنگ تک نوبت پہنچ گئی۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے درمیان اختلاف ہوا اور اس میں بھی جنگ کی نوبت پہنچی۔ ان اختلاف کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے میں ہی یہ سب کچھ دکھا دیا تاکہ آنے والی اُمت کے لئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی کی زندگی سے رہنمائی کا ایک راستہ مل جائے کہ جب کبھی آئندہ اس قسم کے واقعات پیش آئیں تو کیا کرنا چاہئے۔ چنانچہ اس زمانے میں وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ جو یہ سمجھتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حق پر ہیں، انہوں نے اس حدیث پر عمل کیا جس میں حضورِ اقدس ﷺ نے یہ فرمایا تھا:

((تَلْزَمُ جَمَاعَةَ الْمُسْلِمِيْنَ وَاِمَامَهُمْ))[1]

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوة فی الاسلام، رقم:۳۳۳۸، صحیح مسلم، کتاب الأمارة، باب وجوب ملازمة جماعة المسلمین عند ظهور الفتن......الخ، رقم:۳۴۳۴

''یعنی ایسے وقت میں جو مسلمانوں کی بڑی جماعت ہو اور اس کا امام بھی ہو، اس کو لازم پکڑلو''

اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا اور یہ کہا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس وقت امام ہیں، ہم ان کا ساتھ دیں گے، اور وہ جیسا کہیں گے ہم ویسا ہی کریں گے۔ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو برحق سمجھا کہ یہ امام ہیں اور ان کا ساتھ دینا شروع کردیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تیسرا فریق وہ تھا جنہوں نے یہ کہا کہ اس وقت ہماری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ حق کیا ہے؟ اور باطل کیا ہے؟ اور ایسے موقع کے لئے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم یہ ہے کہ تمام جماعتوں سے الگ ہوجائیں۔ چنانچہ انہوں نے نہ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا اور نہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا، بلکہ الگ ہوکر اپنے گھروں میں بیٹھ گئے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا طرزِ عمل

چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں۔ بڑے اُونچے درجے کے صحابی اور فقیہ تھے۔ اس زمانے میں یہ اپنے گھر میں بیٹھے تھے۔ ایک شخص ان کے پاس آیا اور کہا کہ آپ یہ کیا کررہے ہیں کہ گھر میں بیٹھ گئے، باہر حق و باطل کا معرکہ ہورہا ہے، حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان لڑائی ہورہی ہے، اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دینا چاہئے، اس لئے کہ وہ برحق ہیں، تو آپ باہر کیوں نہیں نکلتے؟ جواب میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ میں نے تو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی ہے کہ جب کبھی ایسا موقع آئے کہ مسلمان آپس میں ٹکراجائیں اور حق و باطل کا پتہ نہ چلے تو اس وقت اپنے گھر کا دروازہ بند کرکے بیٹھ جاؤ، اور اپنے گھر کا ٹاٹ بن جاؤ۔ اور اپنے کمان کی تانتیں توڑ ڈالو، یعنی ہتھیار توڑ ڈالو۔ چونکہ مجھے حق و باطل کا پتہ نہیں چل رہا ہے، اس لئے میں اپنے ہتھیار توڑ کر گھر کے اندر بیٹھ گیا ہوں اور اللہ اللہ کررہا ہوں۔

اس شخص نے کہا کہ یہ آپ غلط کررہے ہیں، اس لئے کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿قٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ﴾(۱)

''یعنی اس وقت تک جہاد کرو جب تک فتنہ باقی ہے، اور جب فتنہ ختم ہوجائے، اس وقت جہاد چھوڑ دینا''

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اس کا کیا عجیب جواب ارشاد فرمایا:

''قَاتَلْنَا حَتّٰى لَمْ تَكُنْ فِتْنَةٌ، وَقَاتَلْتُمْ حَتّٰى كَانَتِ الْفِتْنَةُ''(۲)

(۱) البقرة: ۹۳ (۲) صحیح البخاری، کتاب التفسیر، سورة البقرة، رقم: ۴۵۱۳

ہم نے جب حضورِ اقدس ﷺ کے ساتھ مل کر قتال کیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے فتنہ ختم فرما دیا تھا، اور اب تم نے قتال کیا تو فتنہ ختم نہیں کیا، بلکہ فتنہ کو اور بڑھا دیا اور اسے جگا دیا۔ اس لئے میں تو حضورِ اقدس ﷺ کے ارشاد پر عمل کرتے ہوئے گھر میں بیٹھا ہوں۔

حالتِ امن اور حالتِ فتنہ میں ہمارے لئے طرزِ عمل

اسی بارے میں ایک محدث کا ایک قول میری نظر سے گزرا، جب میں نے اس کو پڑھا تو مجھے وجد آ گیا۔ وہ قول یہ ہے:

"اِقْتَدُوْا بِعُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ فِي الْاَمْنِ وَبِابْنِهٖ فِي الْفِتْنَةِ"

"جب امن کی حالت ہو تو اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اقتدا کرو، اور جب فتنہ کی حالت ہو تو ان کے بیٹے یعنی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی اقتدا کرو"

یعنی امن کی حالت میں یہ دیکھو کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کیا طرزِ عمل تھا۔ ان کی اقتدا کرتے ہوئے وہ طرزِ عمل تم بھی اختیار کرو۔ اور فتنہ کی حالت میں یہ دیکھو کہ ان کے بیٹے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا تھا۔ وہ یہ کہ تلوار توڑ کر گھر کے اندر الگ ہو کر بیٹھ گئے، اور کسی کا ساتھ نہیں دیا۔ تم بھی فتنہ کی حالت میں ان کی اتباع کرو۔

اختلافات کے باوجود آپس کے تعلقات

اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی کے دور میں یہ سارے منظر دکھا دیئے، چنانچہ جن صحابہ کرام نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حق پر سمجھا، انہوں نے ان کا ساتھ دیا۔ اور جنہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو حق پر سمجھا، انہوں نے ان کا ساتھ دیا۔ لیکن ساتھ دینے کے باوجود یہ عجیب منظر دنیا کی آنکھوں نے دیکھا کہ ایسا منظر دنیا نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ یہ کہ حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما دونوں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار بھی ہیں، لیکن جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں سے کسی کا انتقال ہو جاتا تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کے لوگ اس کے جنازے میں آ کر شریک ہوتے، اور جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں کسی کا انتقال ہو جاتا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر کے لوگ اس کے جنازے میں شریک ہوتے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ یہ لڑائی درحقیقت نفسانیت کی بنیاد پر نہیں تھی، یہ لڑائی جاہ اور مال کے حصول کے لئے نہیں تھی۔ بلکہ لڑائی کی وجہ یہ تھی کہ اللہ کے حکم کا ایک مطلب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سمجھا تھا، یہ اس پر عمل کر رہے تھے۔ اور حکم کا ایک مطلب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے سمجھا تھا، وہ اس پر عمل کر رہے تھے۔ اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر اللہ کے حکم کی تعمیل میں مشغول تھے۔

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کا طرزِ عمل

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ جو پڑھنے پڑھانے والے صحابی تھے۔ میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ مولوی قسم کے صحابی تھے۔ اور ہر وقت پڑھنے پڑھانے کے مشغلے میں رہتے تھے، ان کا طرزِ عمل یہ تھا کہ یہ دونوں لشکروں میں دونوں کے پاس جایا کرتے تھے، کسی ایک کا ساتھ نہیں دیتے تھے، جب نماز کا وقت آتا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں جا کر ان کے پیچھے نماز پڑھتے، اور جب کھانے کا وقت آتا تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں جا کر ان کے ساتھ کھانا کھاتے۔ کسی نے ان سے سوال کیا کہ حضرت! آپ نماز تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پیچھے پڑھتے ہیں، اور کھانا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ کھاتے ہیں۔ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ جواب میں فرمایا کہ نماز وہاں اچھی ہوتی ہے اور کھانا وہاں اچھا ہوتا ہے۔ اس لئے نماز کے وقت وہاں اور کھانے کے وقت وہاں چلا جاتا ہوں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے ہمیں آپس کے اختلافات کرنے کا سلیقہ بھی سکھادیا۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا قیصرِ روم کو جواب

اس لڑائی کے عین دوران جب ایک دوسرے کی فوجیں آمنے سامنے ایک دوسرے کے خلاف کھڑی ہیں، اس وقت قیصرِ روم کا یہ پیغام حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس آتا ہے کہ میں نے سنا ہے کہ تمہارے بھائی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تمہارے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے، اور وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے قصاص نہیں لے رہے ہیں۔ اگر تم چاہو تو میں تمہاری مدد کے لئے بہت بڑا لشکر بھیج دوں تاکہ تم ان سے مقابلہ کرو۔ اس پیغام کا جو فوری جواب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے لکھ کر بھیجا، وہ یہ تھا کہ:

> ''اے نصرانی بادشاہ! تو یہ سمجھتا ہے کہ ہمارے آپس کے اختلاف کے نتیجے میں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر حملہ آور ہوگا؟ یاد رکھ! اگر تو نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر بُری نگاہ ڈالنے کی جرأت کی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر سے نمودار ہونے والا پہلا شخص جو تیری گردن اُتارے گا وہ معاویہ (رضی اللہ عنہ) ہوگا''(۱)

تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہمارے لئے معزز اور مکرم ہیں

آج کل لوگ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں کیسی کیسی زبان درازیاں کرتے ہیں۔ حالانکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان اور مرتبے کو سمجھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ان کے مدارک اور جذبے

---

(۱) تاج العروس (۷/۲۰۸) مادہ اصطفلین مطبوعہ دار لیبیا بحوالہ حضرت معاویہ اور تاریخی حقائق، ص:۲۴۳

کو ہم نہیں پہنچ سکتے۔ آج ہم ان کی لڑائیوں کو اپنی لڑائیوں پر قیاس کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ جس طرح ہمارے درمیان لڑائی ہوتی ہے، اسی طرح ان کے درمیان بھی لڑائی ہوئی۔ حالانکہ ان کی ساری لڑائیاں اور سارے اختلافات کے ذریعہ درحقیقت اللہ تعالیٰ آئندہ اُمت کے لئے رہنمائی کا راستہ پیدا کر رہے تھے کہ آئندہ زمانے میں جب کبھی ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو اُمت کے لئے راستہ کیا ہے؟ چاہے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہوں، یا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ہوں، یا الگ بیٹھنے والے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہوں، ان میں سے ہر ایک نے ہمارے لئے ایک اُسوۂ حسنہ چھوڑا ہے۔ اس لئے ان لوگوں کے دھوکے میں کبھی مت آنا جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ان باہمی اختلافات کی بنیاد پر کسی ایک صحابی کی شان میں گستاخی یا زبان درازی کرتے ہیں۔ ارے ان کے مقام تک آج کوئی نہیں پہنچ سکتا۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی لِلّٰہیت اور خلوص

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے چونکہ اپنے بیٹے یزید کو اپنا ولی عہد بنا دیا تھا، جس کی وجہ سے ان کے بارے میں لوگ بہت سی باتیں کرتے ہیں۔ حالانکہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ جمعہ کے خطبے میں عین جمعہ کے وقت منبر پر کھڑے ہو کر یہ دعا کی کہ یا اللہ! میں نے اپنے بیٹے یزید کو جو اپنا ولی عہد بنایا ہے، میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس کو ولی عہد بناتے وقت میرے ذہن میں سوائے اُمتِ محمدیہ کی فلاح کے کوئی اور بات نہیں تھی۔ اور اگر میرے ذہن میں کوئی بات ہو تو میں یہ دعا کرتا ہوں کہ یا اللہ! قبل اِس کے کہ میرا یہ حکم نافذ ہو، آپ اس کی روح قبض کر لیں۔ (۱)

دیکھئے! کوئی باپ اپنے بیٹے کے لئے ایسی دعا نہیں کیا کرتا، لیکن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ دعا فرمائی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے جو کچھ کیا وہ خلوص کے ساتھ کیا۔ انسان سے غلطی ہوسکتی ہے۔ پیغمبروں کے علاوہ ہر ایک سے غلطی ہوسکتی ہے۔ غلط فیصلہ ہوسکتا ہے۔ لیکن آپ نے جو کچھ فیصلہ کیا وہ اخلاص کے ساتھ اللہ کے لئے کیا۔

کنارہ کش ہو جاؤ

بہر حال، حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فتنوں کی تمام احادیث پر عمل کر کے ہمارے لئے نمونہ پیش کر دیا کہ فتنے میں یہ کیا جاتا ہے۔ لہٰذا جب اس دور میں جہاں مقابلہ حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کا تھا، اس دور میں بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی جماعت الگ ہو کر بیٹھ گئی تھی، جس میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جیسے صحابہ کرام شامل تھے، تو اس دور میں بھی جب حق و باطل کا یقینی طور پر

(۱) تاریخ الخلفاء للسیوطی، ص: ۱۵۷ ـ ۱۵۸

پتہ نہیں ہے، بلکہ حق و باطل مشتبہ ہے، اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ آدمی کنارہ کشی اختیار کر لے۔

حقیقت یہ ہے کہ تکوینی طور پر اللہ تعالیٰ کو عجیب بات منظور تھی کہ جو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس زمانے میں کنارہ کش ہو کر بیٹھ گئے تھے، ان سے اللہ تعالیٰ نے دین کی بہت بڑی خدمت لے لی۔ ورنہ اگر سب کے سب صحابہ جنگ میں شامل ہو جاتے تو بہت سے صحابہ ان میں سے شہید ہو جاتے، اور دین کی وہ خدمت نہ کر پاتے۔ چنانچہ جو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم الگ ہو کر بیٹھ گئے تھے، انہوں نے احادیث کو مدوّن کرنا شروع کر دیا۔ اور اس کے نتیجے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور آپ کا لایا ہوا دین آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے مدوّن اور مرتب ہو گیا۔ اور ایک بہت بڑا ذخیرہ چھوڑ گئے۔

اپنی اصلاح کی فکر کرو

بہر حال، فتنہ کے دور میں یہ حکم دیا کہ گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ جاؤ اور اللہ اللہ کرو۔ اور اپنی اصلاح کی فکر کرو کہ میں گناہوں سے بچ جاؤں، اور اللہ تعالیٰ کا مطیع اور فرمانبردار بن جاؤں، اور میرے بیوی بچے بھی مطیع اور فرمانبردار بن جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک پیغمبر ہی ایسا نسخہ بتا سکتا ہے، ہر انسان کے بس کا کام نہیں کہ وہ ایسا نسخہ بتا سکے، اس لئے اس نسخے پر عمل کرتے ہوئے ہر انسان اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہو جائے۔ معاشرہ تو انہی افراد کے مجموعے کا نام ہے۔ جب ایک فرد کی اصلاح ہو گئی اور وہ درست ہو گیا تو کم از کم معاشرے سے ایک بُرائی تو دور ہو گئی۔ اور جب دوسرا فرد درست ہو گیا تو دوسری برائی درست ہو گئی۔ اسی طرح چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ اور افراد سے معاشرہ بنتا ہے۔ آہستہ آہستہ سارا معاشرہ درست ہو جائے گا۔

اپنے عیوب کو دیکھو

آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں، یہ شدید فتنے کا دور ہے۔ اس کے لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم چودہ سو سال پہلے یہ نسخہ بتا گئے کہ کسی پارٹی میں شامل مت ہونا، حتی الامکان گھر میں بیٹھو، اور تماشہ دیکھنے کے لئے بھی گھر سے باہر مت جاؤ۔ اور اپنی اصلاح کی فکر کرو۔ اور یہ دیکھو کہ میرے اندر کیا برائی ہے۔ اور میں کن برائیوں کے اندر مبتلا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ پورے معاشرے کے اندر جو فتنہ پھیلا ہوا ہے، وہ میرے گناہوں کی نحوست ہو۔ ہر انسان کو یہ سوچنا چاہئے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے، شاید میرے گناہوں کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کے پاس لوگ قحط سالی کی شکایت کرنے گئے تو انہوں نے کہا کہ یہ سب میرے گناہوں کی وجہ سے ہو رہا ہے، میں یہاں سے چلا جاتا ہوں، شاید اللہ تعالیٰ تم پر رحمت نازل فرما دے۔ آج ہم لوگوں کو دوسروں پر تبصرہ کرنا آتا ہے کہ لوگ یوں

کررہے ہیں، لوگوں کے اندر یہ خرابیاں ہیں، جس کی وجہ سے فساد ہورہا ہے، لیکن اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھنے والا شاذونادر ہی آج کوئی ملے گا۔ اس لئے دوسروں کو چھوڑو اور اپنی اِصلاح کی فکر کرو۔

گناہوں سے بچاؤ

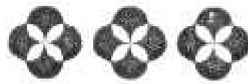
اور اپنی اصلاح کی فکر کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ صبح سے لے کر شام تک جو گناہ تم سے سرزد ہوتے ہیں، ان کو ایک ایک کرکے چھوڑنے کی فکر کرو۔ اور ہر روز اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ اور استغفار کرو۔ اور یہ دعا کرو کہ یا اللہ! یہ فتنہ کا زمانہ ہے۔ مجھے اور میرے گھر والوں اور میری اولاد کو اپنی رحمت سے اس فتنہ سے دور رکھیے۔

((اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْفِتَنِ مَا ظَھَرَ مِنْھَا وَمَا بَطَنَ))

"اے اللہ! ہم آپ کی تمام ظاہری اور باطنی فتنوں سے پناہ مانگتے ہیں"(۱)

دعا کرنے کے ساتھ ساتھ غیبت سے، نگاہ کے گناہ سے، فحاشی اور عریانی کے گناہوں سے، اور دوسروں کی دل آزاری کے گناہ سے، رشوت کے گناہ سے، سود کے گناہ سے اپنے آپ کو جتنا ہوسکے ان سے بچانے کی کوشش کرو۔ لیکن اگر غفلت میں یہ زندگی گزار دی تو پھر اللہ تعالیٰ بچائے، انجام بڑا خراب نظر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.



(۱) مسند احمد، مسند عبداللہ بن العباس، رقم: ۲٦٤٢

بدعات کیوں حرام ہیں؟ ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ﴾ (۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! سورۂ حجرات کی ابتدائی آیات کا بیان گزشتہ جمعہ کو شروع کیا تھا۔ پہلی آیت کا ترجمہ یہ ہے:

''اے ایمان والو! اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرو''

اس آیت سے کئی احکام نکلتے ہیں، جن میں سے تین احکام کا بیان گزشتہ جمعہ کو ہو چکا ہے۔

بدعت دین میں اضافہ کے مترادف ہے

اس آیت سے چوتھا حکم یہ نکل رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے واسطے سے جو دین ہمیں عطا فرمایا ہے، وہ کامل اور مکمل دین ہے، جس کی صراحت قرآن کریم نے دوسری جگہ فرمائی:

﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ﴾ (۲)

''آج میں نے تمہارا دین تمہارے لئے مکمل کر دیا، اور اپنی نعمت کو تمہارے اُوپر کامل کر دیا''

لہٰذا کوئی بھی ایسا عمل جو حقیقت میں دین نہیں ہے، اور جو عمل حضور ﷺ کے زمانے میں نہیں تھا، اور حضور ﷺ نے اس کی تلقین نہیں فرمائی تھی، اور قرآن کریم میں اس کا حکم نہیں آیا، صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے اس کو اختیار نہیں کیا تھا، ایسے نئے عمل کو ہم دین کا حصہ سمجھ کر شروع کر دیں، اور اس عمل کو واجب یا سنت قرار دیں، یا اس عمل کے ترک کرنے والے پر ملامت شروع

☆ اصلاحی خطبات (۱۶/۲۲۳۔۲۳۸)، بیت المکرم، کراچی۔

(۱) الحجرات: ۱ (۲) المائدۃ: ۳

کردیں، یہ طرزِ عمل بھی حضور ﷺ سے آگے بڑھنے کے مرادف ہے، جس کی اس آیت میں ممانعت کی گئی ہے۔

جدید چیزوں کا استعمال جائز ہے

دیکھئے! بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو حضور ﷺ کے عہدِ مبارک میں نہیں تھیں، نہ ان کا رواج تھا، لیکن زمانے کے حالات کی تبدیلی کی وجہ سے وہ چیزیں وجود میں آئیں، اور لوگوں نے ان سے فائدہ اُٹھانا شروع کردیا۔ مثلاً حضورِ اقدس ﷺ کے زمانے میں بجلی نہیں تھی، آج ہمارا بجلی کے بغیر گزارا نہیں ہوتا۔ اس زمانے میں پنکھے نہیں تھے، آج ہمارا پنکھے کے بغیر گزارا نہیں۔ اس زمانے میں گھوڑے اور اُونٹوں پر سفر ہوتا تھا، آج موٹروں کی، بسوں کی، ریلوں اور ہوائی جہازوں کی بھرمار ہے، ان کے بغیر گزارا نہیں۔ لیکن یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ کوئی ان کو دین کا حصہ نہیں سمجھتا، مثلاً کوئی شخص یہ نہیں کہتا کہ پنکھا چلانا سنت ہے، کوئی شخص یہ نہیں کہتا کہ بجلی جلانا واجب ہے، اور شرعی اعتبار سے ضروری ہے، کوئی شخص یہ نہیں کہتا کہ ریل میں سفر کرنا سنت یا مستحب ہے، یا واجب ہے، لہٰذا کوئی شخص ان چیزوں کو دین کا حصہ نہیں سمجھتا، بلکہ ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے نئے نئے طریقے وجود میں آتے رہتے ہیں، اس لئے شریعت نے بھی ان پر کوئی پابندی نہیں لگائی، ان سب چیزوں کو استعمال کرنا شرعاً جائز ہے۔

ہر بدعت گمراہی ہے

لیکن کوئی نیا کام انسان اس خیال سے شروع کرے کہ یہ دین کا حصہ ہے، یا یہ سوچ کہ یہ کام واجب ہے، یا سنت ہے، یا فرض ہے، یا مستحب ہے، یا یہ ثواب کا کام ہے، حالانکہ وہ کام نہ تو حضورِ اقدس ﷺ نے کیا، نہ آپ نے اس کا حکم دیا، اور نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے وہ کام کیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ دین کے معاملے میں ہم حضورِ اقدس ﷺ سے آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ استغفر اللہ۔ شریعت میں اسی کا نام ''بدعت'' ہے۔ ''بدعت'' کے لفظی معنی ہیں ''نئی چیز''، لہٰذا لغت کے اعتبار سے تو یہ پنکھا بھی بدعت ہے، یہ بجلی بھی بدعت ہے، یہ ٹائلز اور ماربل بھی بدعت ہے، یہ کاریں یہ بسیں اور یہ ہوائی جہاز بھی بدعت ہے۔ لیکن شریعت کی اصطلاح میں ''بدعت'' اس نئے کام کو کہا جاتا ہے جس کا حکم نہ قرآن کریم نے دیا ہو، اور نہ ہی سنت سے اس کا ثبوت ہو، اور نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس پر عمل کیا ہو، اور نہ ہی اس کی تلقین کی ہو، ایسے کام کو شریعت کی اصطلاح میں ''بدعت'' کہا جاتا ہے۔ بدعت کے بارے میں جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((كُلُّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ))(۱)

ہر وہ نیا کام جو دین میں پہلے داخل نہیں تھا، اور نہ دین کا حصہ تھا، آج اس کو دین میں داخل کر دیا گیا، وہ ''بدعت'' ہے، اور ہر بدعت گمراہی ہے، اور ہر گمراہی جہنم میں لے جانے والی ہے۔

بدعت گمراہی کیوں ہے؟

''بدعت'' گمراہی کیوں ہے؟ اس لئے کہ بدعت میں اگر غور کیا جائے تو یہ نظر آئے گا کہ جو شخص بدعت کو اختیار کرنے والا ہے وہ درحقیقت یہ سمجھتا ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول نے جو دین ہمیں دیا تھا وہ ادھورا اور ناقص تھا، آج میں نے اس میں اس عمل کا اضافہ کر کے اس کو مکمل کر دیا۔ گویا کہ آدمی عملی طور پر بدعت کے ذریعہ یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ میں اللہ اور اس کے رسول سے آگے نکل جاؤں۔ جو چیز دین میں داخل کی جاتی ہے بظاہر دیکھنے میں وہ ثواب کا کام معلوم ہوتی ہے، عبادت لگتی ہے، لیکن چونکہ وہ عبادت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق نہیں ہوتی، اس لئے وہ عبادت بدعت ہے، اور بدعت گمراہی ہے۔ جتنی بدعات ہوتی ہیں ان میں براہِ راست گناہ کا کام نہیں ہوتا، لیکن چونکہ اس عمل کو کسی اتھارٹی کے بغیر دین کے اندر شامل کر دیا گیا، اس عمل کے بارے میں ہمارے پاس قرآن کی اور سنت کی کوئی اتھارٹی نہیں تھی، بلکہ ہم نے اپنی طرف سے اس کو دین میں داخل کر دیا، اس لئے وہ بدعت بن گئی۔

شب برأت میں سو رکعت نفل پڑھنا

مثلاً بعض لوگوں نے ۱۵؍شعبان کی رات یعنی شبِ برأت میں لوگوں کے لئے نماز کا ایک خاص طریقہ مقرر کر دیا، وہ یہ کہ ایک ہی تحریمہ اور ایک سلام کے ساتھ سو رکعتیں نفل پڑھیں، اور ہر رکعت میں خاص خاص سورتوں کا پڑھنا مقرر کر دیا کہ پہلی رکعت میں فلاں سورۃ، دوسری میں فلاں سورۃ اور تیسری میں فلاں سورۃ وغیرہ۔ ایک زمانے میں یہ طریقہ اتنی شہرت اختیار کر گیا تھا کہ جگہ جگہ باقاعدہ جماعت کے ساتھ سو رکعتیں پڑھی جا رہی تھیں۔ اگر کوئی شخص یہ سو رکعتیں نہیں پڑھتا تو اس کو برا کہا جاتا کہ اس نے شبِ برأت نہیں منائی۔

اب آپ دیکھیں کہ جو شخص شبِ برأت میں سو رکعتیں پڑھ رہا ہے، کیا وہ کوئی چوری کر رہا ہے، یا ڈاکے ڈال رہا ہے، یا وہ بدکاری کر رہا ہے، نہیں، بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہو کر اللہ کا

---

(۱) سنن النسائي، كتاب صلاة العيدين، باب كيف الخطبة، رقم: ۱۵٦۰، سنن أبي داؤد، كتاب السنة، رقم: ۳۹۹۱، سنن ابن ماجه، المقدمة، رقم: ٤٥۔

ذکر کر رہا ہے، رکوع، سجدے کر رہا ہے، لیکن تمام علماء اُمت نے فرمایا کہ یہ عمل گناہ ہے، اور بدعت ہے، ناجائز ہے، اس لئے کہ اس نے اپنی طرف سے دین میں ایک چیز کا اضافہ کر دیا، جو دین کا حصہ نہیں تھا، لہٰذا یہ عمل بدعت ہو گیا، اور گناہ ہو گیا۔

ہم کوئی گناہ کا کام نہیں کر رہے

اگر ان سے پوچھا جائے کہ بھائی تم یہ جو عمل کر رہے ہو، اس کا نہ تو قرآن کریم میں کہیں ذکر ہے، نہ حدیث شریف میں اس کا کہیں ذکر ہے، یہ عمل تو بدعت ہے، یہ کیسے جائز ہو گیا؟ وہ لوگ جواب میں کہتے ہیں کہ ہم کوئی گناہ کر رہے ہیں، یا ہم چوری ڈاکہ ڈال رہے ہیں؟ بلکہ ہم تو قرآن کریم پڑھ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدے کر رہے ہیں، ہم اللہ تعالیٰ کی تسبیح کر رہے ہیں، کوئی گناہ کا کام تو نہیں کر رہے ہیں۔

مغرب کی تین کے بجائے چار رکعت پڑھیں تو کیا نقصان؟

خوب سمجھ لیجئے کہ کوئی بھی عبادت اس وقت تک عبادت کہلانے کی مستحق نہیں جب تک اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس کی سند موجود نہ ہو، ورنہ وہ عبادت بدعت ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر پانچ نمازیں فرض فرمائی ہیں، اور ہر نماز کی رکعتوں کی تعداد متعین فرمائی ہے کہ فجر میں دو رکعت فرض پڑھو، اور ظہر، عصر اور عشاء میں چار چار رکعت فرض پڑھو، اور مغرب میں تین رکعت پڑھو، اب اگر کوئی آدمی یہ سوچے کہ یہ تین رکعتوں کی تعداد تو اچھی معلوم نہیں ہوتی، لہٰذا مغرب میں تین کے بجائے چار رکعت پڑھوں گا، اب اگر کوئی شخص مغرب کی تین رکعت کے بجائے چار رکعت پڑھ لے تو کیا اس نے کوئی ڈاکہ ڈالا، کوئی چوری کی، کیا اس نے بدکاری کی؟ کیا اس نے شراب پی لی؟ نہیں، بلکہ اس نے تو ایک رکعت زیادہ پڑھ لی، اس میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی، ایک رکوع زیادہ کیا، دو سجدے زیادہ کیے، اور اس میں اللہ تعالیٰ کی تسبیح زیادہ کی۔ لیکن اس شخص نے یہ جو چوتھی رکعت اپنی طرف سے زیادہ پڑھ لی، اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ثواب زیادہ ملنے کے بجائے یہ ایک رکعت پہلی تین رکعتوں کو بھی لے ڈوبے گی، اور اس کی نماز نہیں ہو گی۔ اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مغرب کی نماز کا جو طریقہ بتایا گیا تھا، اس طریقہ سے ہٹ کر اس نے اپنے طریقے پر نماز پڑھ لی، اور اس طریقہ کو دین کا حصہ سمجھ کر اس کو دین میں داخل کر لیا، اسی کا نام "بدعت" ہے۔

افطار کرنے میں جلدی کیوں؟

یاد رکھئے! دین نام ہے اس بات کا کہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جس کام کا جس درجہ

میں حکم دیا ہے، بس اسی درجہ میں اس کی اتباع کی جائے، اور اس پر عمل کیا جائے، اگر اس سے آگے یا پیچھے ہٹو گے تو وہ دین نہیں۔ اور اگر دین سمجھ کر اس کو اختیار کر رہے ہو تو وہ ''بدعت'' ہے۔ جیسے رمضان میں ہم روزہ رکھتے ہیں، روزے کے لئے صبح سحری کھاتے ہیں، سارا دن بھوکے رہتے ہیں، اور جب آفتاب غروب ہو جاتا ہے تو افطار کر لیتے ہیں۔ شریعت کا حکم یہ ہے کہ جب آفتاب غروب ہو جائے تو افطار کرنے میں جلدی کرو، افطار کرنے میں دیر مت کرو، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ افطار کرنے میں جلدی کیوں کریں؟ جب دن بھر اللہ کے لئے بھوکے پیاسے رہے تو اب اگر ایک گھنٹہ مزید بھوکے پیاسے رہ جائیں گے تو اس میں کیا قیامت آ جائے گی؟ اور کیا خرابی پیدا ہو جائے گی؟ بظاہر تو اس میں کوئی گناہ کی بات نظر نہیں آتی۔ لیکن نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ آفتاب غروب ہوتے ہی جلد از جلد افطار کرو، اور کچھ کھا پی لو۔ (۱)

اس لئے کہ اللہ کا حکم یہ تھا کہ تمہیں آفتاب کے غروب ہونے تک بھوکا پیاسا رہنا ہے، اب آفتاب غروب ہونے کے بعد روزہ نہیں ہے، اب اگر تم اس روزے کو آگے بڑھاؤ گے اور یہ سوچو گے کہ ایک گھنٹے کے بعد افطار کروں گا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ روزے کی جو میعاد اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے مقرر کی تھی، اس میں تم نے اپنی طرف سے اضافہ کر دیا، یہ اتباع نہیں ہوئی، اتباع تو یہ ہے کہ جب وہ کہیں کہ مت کھاؤ، تو نہ کھانا عبادت ہے، اور جب وہ کہیں کہ کھاؤ تو اب کھانا واجب ہے، اگر نہیں کھاؤ گے تو گنہگار ہو گے۔

عید کے دن روزہ رکھنے پر گناہ کیوں؟

یا مثلاً روزہ رکھتے ہوئے رمضان کا پورا مہینہ گزر گیا، اور روزے رکھنے کی اتنی فضیلت ہے کہ جو شخص رمضان کے روزے رکھے، اللہ تعالیٰ اس کے اگلے پچھلے گناہ معاف فرما دیتے ہیں، (۲) اور روزے کی یہ فضیلت ہے کہ روزہ رکھنے کی وجہ سے اس کے منہ سے جو بو آ رہی ہے، اللہ تعالیٰ کو وہ بو مشک وعنبر سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ (۳) لیکن جب عید کا دن آ گیا تو اب اگر کسی نے روزہ رکھ لیا تو وہی روزہ جو رمضان میں بڑے اجر وثواب کا موجب تھا، اب اُلٹا عذاب کا موجب بن جائے گا، حالانکہ اگر کوئی شخص عید کے دن روزہ رکھ لے تو بظاہر تو کوئی گناہ نظر نہیں آتا، کیونکہ وہ روزہ رکھ کر ایک عبادت

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الصوم، باب تعجیل الافطار، رقم: ۱۸۲۲، صحیح مسلم، کتاب الصیام، رقم: ۱۸٤۲، سنن أبی داؤد، کتاب الصوم، رقم: ۲۰۰۵

(۲) صحیح البخاری، کتاب الإیمان، باب صوم رمضان احتسابا من الإیمان، رقم: ۳۷

(۳) صحیح البخاری، کتاب الصوم، باب فضل الصوم، رقم: ۱۷٦۱

ہی انجام دے رہا ہے۔ لیکن چونکہ وہ شخص اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے خلاف عبادت کر رہا ہے، لہٰذا وہ عبادت نہیں، بلکہ وہ گناہ ہے، اس پر عذاب ہوگا۔ تو دین نام ہے ''اتباع'' کا۔ اب اگر کوئی شخص دین میں کوئی نیا طریقہ جاری کر کے اس کا نام ''عبادت'' رکھ دے، اور اس کو دین کا حصہ قرار دیدے، اور اس کو ''سنت'' کہے، اور اس کی طرف لوگوں کو دعوت دے، اور اگر کوئی شخص اس پر عمل نہ کرے تو اس پر لعنت و ملامت کرے، اور یہ کہے کہ یہ شخص بے دین ہے، یہ طرزِ عمل اس کو ''بدعت'' بنا دیتا ہے، اور بدعت ہونے کے نتیجے میں وہ ثواب کا کام ہونے کے بجائے اُلٹا گناہ کا کام بن جاتا ہے، اس لئے کہ وہ شخص دین میں اپنی طرف سے اضافہ کر کے گویا کہ وہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے، جبکہ قرآن کریم کا حکم یہ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ (۱)

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرو۔ جس حد پر انہوں نے رہنے کے لئے کہا ہے، اسی حد پر رہو، اللہ سے آگے نہ بڑھو، اگر آگے بڑھو گے تو تم بدعت کے مرتکب ہو گے۔

سفر میں چار رکعت پڑھنا گناہ کیوں؟

سفر کی حالت میں اللہ تعالیٰ نے رکعتوں کی تعداد کم فرما دی اور یہ حکم دیا کہ شرعی سفر کے دوران چار فرضوں کے بجائے دو فرض پڑھو۔ اب اگر کوئی آدمی یہ سوچے کہ اللہ تعالیٰ نے بیشک میرے لئے رکعتوں کی تعداد میں کمی کر دی ہے، لیکن میرا دل نہیں مان رہا ہے، میں تو پوری چار رکعت ہی پڑھوں گا۔ ایسا کرنا اس کے لئے جائز نہیں، حالانکہ اگر وہ شخص دو رکعتیں زائد پڑھ رہا ہے تو وہ کوئی گناہ نہیں کر رہا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں اضافہ کر رہا ہے، لیکن چونکہ وہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے حکم کے خلاف عبادت کر رہا ہے، اس وجہ سے ناجائز اور گناہ ہے، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اس پر پکڑ ہو جائے گی کہ ہم نے تم سے دو رکعتیں پڑھنے کو کہا تھا، تم نے چار کیوں پڑھیں؟ معلوم ہوا کہ دین نام ہے ''اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی اتباع'' کا، وہ جب کم پڑھنے کا حکم دیں تو کم پڑھو، وہ جب زیادہ کا حکم دیں تو زیادہ پڑھو، لیکن اپنی طرف سے اس کے اندر کمی زیادتی تمہارے لئے جائز نہیں۔

یہ نکتہ اس لئے سمجھنا ضروری ہے کہ آج ہمارے معاشرے میں بے شمار طریقے دین کے نام پر جاری کر دیئے گئے ہیں، اور اس طرح جاری کر دیے گئے ہیں کہ گویا کہ وہ دین کا لازمی حصہ ہیں، اگر

(۱) الحجرات: ۱

کوئی شخص وہ کام نہ کرے تو وہ ملامتی ہے، اس پر لعنت و ملامت کی جاتی ہے، اس پر طعن وتشنیع کی جاتی ہے، اس کو برا سمجھا جاتا ہے، اور اس کو ایک طرح سے مسلمانوں کی برادری سے خارج سمجھا جاتا ہے۔ وہ تمام طریقے جو حضورِ اقدس ﷺ سے ثابت نہیں ہیں، صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے ثابت نہیں ہیں، اور ان کو دین کا حصہ بنالیا گیا ہے، وہ سب ''بدعات'' کی فہرست میں شامل ہیں، اور یہ آیتِ کریمہ جو میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی یہ ان کی ممانعت کررہی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے آگے بڑھنے کی کوشش مت کرو۔

شبِ برأت میں حلوہ گناہ کیوں؟

مثلاً شبِ برأت میں حلوہ پکنا چاہئے، اور یہ حلوہ شبِ برأت کا لازمی حصہ بن گیا ہے، اگر حلوہ نہیں پکا تو شبِ برأت ہی نہیں ہوئی۔ یا مثلاً رجب میں کونڈے ہوتے ہیں، اگر کوئی شخص کونڈے نہ کرے تو وہ ملامتی ہے، وہ وہابی ہے، اس پر طرح طرح کی طعن وتشنیع کی جاتی ہے۔ اب اگر ان سے پوچھا جائے کہ کیا کونڈے کا حکم قرآن کریم میں کہیں آیا ہے؟ یا حضورِ اقدس ﷺ نے حدیث میں ارشاد فرمایا؟ یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس پر عمل کیا تھا؟ کوئی ثبوت نہیں، بس اپنی طرف سے ایک طریقہ جاری کرکے اس کو اس طرح لازمی قرار دے دیا گیا کہ اگر کوئی نہ کرے تو وہ لعنت و ملامت کا مستحق ہے، اس کو ''بدعت'' کہتے ہیں۔ اب اگر ان سے یہ کہا جائے کہ یہ عمل تو ''بدعت'' ہے تو جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ ہم کوئی گناہ کا کام کررہے ہیں؟ ہم کوئی چوری ڈاکہ ڈال رہے ہیں؟ بلکہ اپنے گھر کے ہی آٹے سے یہ پوریاں بنائیں، اور یہ حلوہ بنایا، اور اس کو محلّہ میں تقسیم کردیا، اس میں گناہ کی کیا بات ہوئی؟ ارے بھائی! تم روزانہ پوری بناؤ، روزانہ حلوہ بناؤ، اور اس کو تقسیم کرو، کوئی گناہ کی بات نہیں۔ لیکن اس کو دین کا لازمی حصہ قرار دینا اور یہ کہنا کہ جو شخص یہ کام نہیں کررہا، وہ ملامت کا مستحق ہے، تمہارا یہ طرزِ عمل اس کام کو ''بدعت'' بنادیتا ہے، جس کے بارے میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

((كُلُّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ))(۱)

اور جو شخص اس عمل کو کسی اتھارٹی کے بغیر دین کا حصہ بناتا ہے، وہ شخص اپنے آپ کو اللہ اور اس کے رسول سے آگے بڑھانے کی کوشش کررہا ہے، جس کی اس آیت میں ممانعت کی گئی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول سے آگے بڑھنے کی کوشش مت کرو۔

---

(۱) سنن النسائي، كتاب صلاة العيدين، باب كيف الخطبة، رقم: ۱۵٦۰، سنن أبي داؤد، كتاب السنة، رقم: ۳۹۹۱، سنن ابن ماجه، المقدمة، رقم: ٤٥

ایصالِ ثواب کا صحیح طریقہ

شریعت نے اس بات کی اجازت دی ہے کہ اگر کسی شخص کا انتقال ہو جائے تو اس کے عزیز و اقارب اس کے لئے ایصالِ ثواب کریں، کوئی بھی نیک عمل کر کے اس کا ثواب اس کو پہنچائیں، اتنی بات نبی کریم ﷺ کی حدیث سے ثابت ہے۔ مثلاً تلاوتِ قرآن کریم کے ذریعے کسی کو ثواب پہنچائیں، نفلیں پڑھ کر پہنچائیں، تسبیحات پڑھ کر پہنچائیں، حج کر کے ثواب پہنچائیں، روزہ رکھ کر پہنچائیں، طواف کر کے ثواب پہنچائیں، عمرہ کر کے ثواب پہنچائیں، یہ سب جائز ہیں، اور نبی کریم ﷺ سے اس طرح ایصال کرنا ثابت ہے۔ لیکن اس ایصالِ ثواب کے لئے شریعت نے کوئی خاص طریقہ مقرر نہیں کیا کہ بس اسی طریقے سے کرنا ہوگا، بلکہ سہولت کے ساتھ آدمی کو جس عبادت کا موقع ہو، اس عبادت کے ذریعہ ایصالِ ثواب کر دے، مثلاً کسی کو تلاوت کے ذریعہ ایصالِ ثواب کرنے کا موقع ہے، وہ تلاوت کے ذریعہ ایصال کر دے، اگر نفلیں پڑھ کر ایصالِ ثواب کرنے کا موقع ہو تو نفلیں پڑھ کر ایصالِ ثواب کر دے۔ بس اخلاص کے ساتھ ایصالِ ثواب کر دے، شرعاً ایصالِ ثواب کے لئے نہ تو دن مقرر ہے نہ وقت مقرر ہے، نہ اس کے لئے کوئی طریقہ مقرر ہے، نہ تقریب مقرر ہے۔

تیجہ کرنا گناہ کیوں؟

لیکن لوگوں نے یہ طریقہ اپنی طرف سے مقرر کر لیا کہ مرنے کے تیسرے دن سب کا جمع ہونا ضروری ہے، اس دن سب مل کر قرآن خوانی کریں گے، اور جس جگہ ''تیجہ'' ہوگا، وہاں کھانے کی دعوت بھی ہوگی۔ اگر ویسے ہی پہلے دن یا دوسرے دن یا تیسرے دن قرآن شریف اکیلے پڑھ لیتے، لوگوں کے آنے کی وجہ سے جمع ہو کر پڑھ لیتے تو یہ طریقہ اصلاً جائز تھا، لیکن یہ تخصیص کرنا کہ تیسرے دن ہی قرآن خوانی ہوگی، اور سب مل کر ہی کریں گے، اور اس میں دعوت ضرور ہوگی، اور جو ایسا نہ کرے وہ ''وہابی'' ہے، جب اس مخصوص طریقہ کو دین کا لازمی حصہ قرار دیدیا کہ اس کے بغیر دین مکمل نہیں، اور اگر کوئی یہ عمل نہ کرے تو عمل نہ کرنے کے نتیجے میں اس کو مطعون کیا جائے، اس کو گناہ گار قرار دیا جائے تو یہی چیز اس عمل کو بدعت بنا دیتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر کسی میّت کا تیجہ نہ ہوا تو کہنے والے اس میّت کو طعنہ دیتے ہیں کہ

مر گیا مردود، نہ فاتحہ نہ درود

اس طرح اس میّت پر طعنہ ہو رہا ہے، جو بیچارہ دنیا سے چلا گیا۔ بس لازمی سمجھنے اور طعنہ دینے نے اس عمل کو بدعت بنا دیا، ورنہ ضروری سمجھے بغیر جس دن چاہو ایصالِ ثواب کرلو، پہلے دن کرلو،

دوسرے دن کرلو، تیسرے دن کرلو، چوتھے دن کرلو، پانچویں دن کرلو، مگر یہ تیجہ، دسواں، چالیسواں یہ سب بدعت ہیں۔

عید کے دن گلے ملنا بدعت کیوں؟

اسی طرح ہمارے یہاں یہ عام دستور ہے کہ عید کے دن عید کی نماز کے بعد آپس میں گلے ملتے ہیں، اور معانقہ کرتے ہیں۔ اب معانقہ کرنا کوئی گناہ کا کام نہیں، جائز ہے، لیکن گلے ملنا اس وقت سنت ہے جب کوئی شخص سفر سے آیا ہے، اور اس سے پہلی ملاقات ہو رہی ہے، تو اس وقت حضور ﷺ کی سنت یہ ہے کہ اس سے گلے ملا جائے، اور معانقہ کیا جائے۔ عام حالات میں معانقہ کرنا سنت بھی نہیں، اور گناہ بھی نہیں۔ مثلاً ایک مسلمان بھائی آپ سے ملنے کے لئے آیا، آپ کا دل چاہا کہ اس سے گلے ملوں، آپ نے اسے گلے سے لگالیا تو اس میں کوئی حرج نہیں، اس میں نہ تو کوئی گناہ ہے، اور نہ یہ عمل سنت ہے۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھے کہ عید کے روز عید کی نماز کے بعد گلے ملنا حضورِ اقدس ﷺ کی سنت ہے، یا یہ عمل دین کا حصہ ہے، یا اگر گلے نہ ملے تو گویا کہ عید ہی نہ ہوئی، یا گناہ کا ارتکاب ہو گیا، یا دین میں خلل واقع ہو گیا، اگر اس عقیدے کی وجہ سے کوئی شخص عید کے دن گلے مل رہا ہے تو گلے ملنا بھی بدعت اور ناجائز ہے، اگر سادہ طریقے سے صرف اپنی خوشی کے اظہار کے لئے گلے مل رہا ہے تو ٹھیک ہے، اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن اس کو سنت سمجھنا اور اس کو عید کا لازمی حصہ قرار دینا اس عمل کو بدعت بنا دیتا ہے۔

فرض نماز کے بعد اجتماعی دعا کا حکم

اسی طرح فرض نماز کے بعد دعا کرنا نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے۔ حضورِ اقدس ﷺ نماز کے بعد دعا فرمایا کرتے تھے، لیکن حضورِ اقدس ﷺ کے عہدِ مبارک میں دعا اس طرح ہوتی تھی کہ حضورِ اقدس ﷺ اپنے طور پر دعا فرما رہے ہیں، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے طور پر دعا فرما رہے ہیں۔ آج کل دعا کا جو طریقہ رائج ہو گیا ہے کہ امام دعا کے الفاظ کہتا ہے اور باقی لوگ اس پر آمین کہتے ہیں، یہ طریقہ روایات میں کہیں حضورِ اقدس ﷺ سے ثابت نہیں۔ لیکن یہ طریقہ ناجائز بھی نہیں، حضورِ اقدس ﷺ نے اس کو ناجائز بھی نہیں کیا، لہٰذا اگر کوئی شخص یہ طریقہ اختیار کرے تو کوئی گناہ نہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص دعا کے اس طریقے کو لازمی قرار دیدے، اور اس کو نماز کا ضروری حصہ بنا دے، اور اس طریقے پر دعا نہ کرنے والے پر طعن و تشنیع کرے تو اس صورت میں یہ عمل ''بدعت'' ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ حضرات نے یہاں دیکھا ہوگا کہ میں جمعہ کی نماز کے بعد کبھی اجتماعی

دعا کراتا ہوں، اور کبھی چھوڑ دیتا ہوں۔ جب پہلی مرتبہ میں نے دعا نہیں کرائی تو بہت سے لوگوں نے سوال کیا کہ حضرت! آپ نے دعا چھوڑ دی؟ میں نے جواب دیا کہ میں نے اسی لئے چھوڑی کہ لوگوں کے دلوں میں اس دعا کے بارے میں یہ خیال پیدا ہو رہا تھا کہ یہ دعا نماز کا لازمی حصہ ہے، اور جب دعا چھوڑ دی تو لوگوں کو اشکال ہوگیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ اجتماعی دعا کے بغیر نماز نامکمل ہے۔ بس یہ خیال اس کو ''بدعت'' بنا دیتا ہے، اس لئے کبھی دعا کر لینی چاہئے اور کبھی چھوڑ دینی چاہئے۔

جب لوگوں سے یہ کہا جاتا ہے کہ ''تیجہ'' کرنا بدعت ہے، ''چالیسواں'' کرنا بدعت ہے، تو جواب میں عام طور پر لوگ یہی کہتے ہیں کہ ہم تو کوئی گناہ کا کام نہیں کر رہے، بلکہ ہم تو قرآن شریف پڑھ رہے ہیں، اور لوگوں کی دعوت کر رہے ہیں، اور نہ قرآن شریف پڑھنا گناہ ہے، اور نہ لوگوں کی دعوت کرنا گناہ ہے۔ بیشک یہ دونوں گناہ نہیں، بشرطیکہ ان کو لازم مت سمجھو، اور اگر کوئی شخص اس میں شریک نہ ہو تو اس کو طعنہ مت دو، اور اس عمل کو دین کا حصہ مت سمجھو، تو پھر یہ عمل بیشک جائز ہے۔ جو آیتِ کریمہ میں نے تلاوت کی، اس کے معنی یہ ہیں کہ ''اللہ اور اللہ کے رسول سے آگے بڑھنے کی کوشش مت کرو'' اس مفہوم میں یہ سب بدعات بھی داخل ہیں کہ اپنی طرف سے کوئی طریقہ گھڑ کر اس کو لازمی قرار دے دیا جائے، اور جو شخص وہ طریقہ اختیار نہ کرے، اس کو مطعون کیا جائے۔

قبروں پر پھول کی چادر چڑھانا

اسی طرح قبروں پر پھولوں کی چادریں چڑھانا ''بدعت'' میں داخل ہے۔ دیکھئے! ویسے ہی آپ کا دل چاہا کہ میں اپنے باپ کی قبر پر چادر چڑھاؤں، چنانچہ اس کو دین کا حصہ اور ثواب سمجھے بغیر آپ نے قبر پر چادر چڑھا دی تو یہ جائز ہے۔ لیکن اس کو دین کا حصہ قرار دینا، اور باعثِ اجر و ثواب قرار دینا، اور اگر کوئی شخص نہ چڑھائے تو اس پر طعنہ دینا، اور یہ کہنا کہ اس نے میت کی تعظیم میں کوتاہی کا ارتکاب کیا ہے، یہ چیزیں اس عمل کو بدعت بنا دیتی ہیں۔ جو چیز جس حد میں نبی کریم ﷺ نے مقرر فرمائی ہے، اس کو اس کی حد سے آگے بڑھانا، مثلاً جو عمل مستحب ہے، اس کو سنت کا درجہ دینا، اور جو عمل سنت ہے، اس کو واجب کا درجہ دینا، یہ سب بدعت میں داخل ہے، اور اس آیت ''لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ'' کی ممانعت کے تحت داخل ہے۔

خلاصہ

یہ ''بدعت'' کا مختصر مفہوم ہے، جس کا حکم اس آیتِ کریمہ سے نکل رہا ہے، اللہ تعالیٰ اپنی

رحمت سے ہمارے دلوں میں صحیح بات اُتار دے، اور دین کا صحیح مطلب ہماری سمجھ میں آ جائے، دین کی صحیح تشریح اور تعبیر ہماری سمجھ میں آ جائے، اور ہماری زندگی اپنی رضا کے مطابق قبول فرما لے، آمین۔
خوب سمجھ لیں کہ اس بیان کے ذریعہ کسی پر اعتراض کرنا مقصود نہیں، کسی پر ملامت کرنا مقصود نہیں، ہم سب کو اللہ تعالیٰ کے پاس جانا ہے، ہم سب کو اپنی اپنی قبروں میں سونا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے پاس اپنے ایک ایک عمل کا جواب دینا ہے، لہٰذا کسی بات پر ڈٹنے اور اڑنے کی بات نہیں کہ یہ طریقہ تو ہمارے باپ دادا سے چلا آ رہا ہے، لہٰذا اس کو کیسے چھوڑیں؟ اللہ تعالیٰ ہمارے دل میں یہ بات ڈال دے کہ دین جو کچھ ہے وہ جناب **محمد** مصطفیٰ ﷺ کی تعلیم ہے، اس سے آگے بڑھ کر جو کام کیا جا رہا ہے وہ دین نہیں ہو سکتا، چاہے اس کا رواج صدیوں سے چلا آ رہا ہو، اور وہ کام قابلِ ترک ہے، اور چھوڑنے کے قابل ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.



تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک

بعد از خطبۂ مسنونہ!

"عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا فَقَالَ عُرِضَتْ عَلَيَّ الْأُمَمُ فَجَعَلَ يَمُرُّ النَّبِيُّ مَعَهُ الرَّجُلُ وَالنَّبِيُّ مَعَهُ الرَّجُلَانِ وَالنَّبِيُّ مَعَهُ الرَّهْطُ وَالنَّبِيُّ لَيْسَ مَعَهُ أَحَدٌ وَرَأَيْتُ سَوَادًا كَثِيْرًا سَدَّ الْأُفُقَ فَرَجَوْتُ أَنْ تَكُوْنَ أُمَّتِيْ فَقِيْلَ هٰذَا مُوْسٰى وَقَوْمُهٗ ثُمَّ قِيْلَ لِيْ انْظُرْ فَرَأَيْتُ سَوَادًا كَثِيْرًا سَدَّ الْأُفُقَ فَقِيْلَ لِيْ انْظُرْ هٰكَذَا وَهٰكَذَا فَرَأَيْتُ سَوَادًا كَثِيْرًا سَدَّ الْأُفُقَ فَقِيْلَ هٰؤُلَاءِ أُمَّتُكَ وَمَعَ هٰؤُلَاءِ سَبْعُوْنَ أَلْفًا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ بِغَيْرِ حِسَابٍ فَتَفَرَّقَ النَّاسُ وَلَمْ يُبَيَّنْ لَهُمْ فَتَذَاكَرَ أَصْحَابُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوْا أَمَّا نَحْنُ فَوُلِدْنَا فِي الشِّرْكِ وَلٰكِنَّا آمَنَّا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَلٰكِنْ هٰؤُلَاءِ هُمْ أَبْنَاؤُنَا فَبَلَغَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ هُمُ الَّذِيْنَ لَا يَتَطَيَّرُوْنَ وَلَا يَسْتَرْقُوْنَ وَلَا يَكْتَوُوْنَ وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ فَقَامَ عُكَّاشَةُ بْنُ مِحْصَنٍ فَقَالَ أَمِنْهُمْ أَنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ نَعَمْ فَقَامَ آخَرُ فَقَالَ أَمِنْهُمْ أَنَا فَقَالَ سَبَقَكَ بِهَا عُكَّاشَةُ"(۱)

اُمتِ محمدیہ کی کثرت

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میرے سامنے موسمِ حج کے موقع پر ساری اُمتیں پیش کی گئیں، یعنی بذریعہ کشف آپ کو تمام پچھلی اُمتیں دکھائی گئیں، مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اُمت اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اُمت اور دوسرے انبیاء کی اُمتیں

☆ اصلاحی خطبات (۱۵/۳۱-۶۲)، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔

(۱) صحیح البخاری، کتاب الطب، باب من لم یرق، رقم: ۵۳۱۱، صحیح مسلم، کتاب الایمان، رقم: ۳۲۳، سنن الترمذی، کتاب صفة القیامة...... الخ، رقم: ۲۳۷۰

حضورِ اقدس ﷺ کے سامنے پیش کی گئیں، اور ان کے ساتھ اُمتِ محمدیہ بھی آپ کے سامنے پیش کی گئی، تو مجھے اپنی اُمت کی تعداد جو کہ بہت بڑی تھی، اس کو دیکھ کر میرا دل بہت خوش ہوا۔ اس لئے کہ دوسرے انبیاء کے اُمتیوں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں تھی، جتنی رسول کریم ﷺ کی اُمت کی تعداد تھی۔

کثرتِ اُمت دیکھ کر آپ ﷺ کی خوشی

دوسری روایت میں یہ تفصیل ہے کہ جب گزشتہ انبیاء کی اُمتیں آپ ﷺ کے سامنے پیش کی جانے لگیں تو بعض انبیاء کی اُمت میں دو تین آدمی تھے، کسی کے ساتھ دس بارہ تھے، اس لئے کہ بعض انبیاء کرام علیہم السلام پر ایمان لانے والے معدودے چند افراد تھے، بعض انبیاء پر ایمان لانے والے دس بارہ افراد تھے، بعض پر ایمان لانے والے سو افراد تھے، بعض پر ایمان لانے والے ہزار تھے۔ جب یہ اُمتیں آپ کے سامنے پیش کی گئیں تو آپ کو ایک بڑا گروہ نظر آیا۔ آپ نے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ آپ کو بتلایا گیا کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اُمت ہے۔ کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کی اُمت تعداد کے اعتبار سے بہت زیادہ تھی۔ پھر بعد میں آپ کے سامنے ایک اور بڑا گروہ پیش کیا گیا جو سارے میدان پر چھا گیا، اور سارے پہاڑوں پر چھا گیا۔ میں نے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ آپ کو بتلایا گیا کہ یہ آپ کی اُمت ہے۔ پھر آپ سے سوال کیا گیا کہ کیا آپ راضی ہو گئے؟ یعنی کیا اس سے خوش ہیں کہ آپ کی اُمت کی اتنی بڑی تعداد ہے جو کسی اور پیغمبر کی اُمت کی نہیں ہے۔ میں نے جواب دیا ہاں اے میرے پروردگار، مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ الحمد للہ، میری اُمت کے اندر اتنی بڑی تعداد لوگوں کی موجود ہے۔

ستر ہزار افراد کا بلا حساب جنت میں دخول

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضورِ اقدس ﷺ کو یہ خوشخبری سنائی:

((اِنَّ مَعَ هٰؤُلَاءِ سَبْعِيْنَ اَلْفًا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ بِغَيْرِ حِسَابٍ))

یعنی یہ جو اُمت آپ کو نظر آ رہی ہے اس میں ستر ہزار افراد ایسے ہیں جو بلا حساب جنت میں داخل ہوں گے، ان سے حساب نہیں لیا جائے گا۔ پھر اس کی شرح فرمائی کہ وہ لوگ جو جنت میں بغیر حساب کے داخل ہوں گے یہ وہ لوگ ہیں جن کے اندر یہ چار صفات ہوں گی۔

چار اوصاف والے

پہلی صفت یہ ہے کہ وہ لوگ جو جھاڑ پھونک نہیں کرتے۔ دوسری صفت یہ ہے کہ وہ لوگ بیماری کا علاج داغ لگا کر نہیں کرتے۔ اہل عرب میں یہ رواج تھا کہ جب کسی بیماری کا کوئی علاج کارگر

نہیں ہوتا تھا تو اس وقت وہ لوگ لوہا گرم کر کے بیمار کے جسم سے لگاتے تھے۔ تیسری صفت یہ کہ وہ بدشگونی نہیں لیتے کہ فلاں بات ہوگئی تو اس سے برا شگون لے لیا۔ چوتھی صفت یہ ہے کہ وہ لوگ ان باتوں کے بجائے اللہ تبارک وتعالیٰ پر توکل کرتے ہیں۔ جن لوگوں میں یہ چار صفتیں ہوں گی وہ ان ستر ہزار افراد میں شامل ہوں گے جو بلا حساب کتاب جنت میں داخل ہوں گے۔

ستر ہزار کا عدد کیوں؟

اور یہ جو ستر ہزار افراد بلا حساب کتاب جنت میں داخل ہوں گے، ان کے لئے جو عدد بیان کیا گیا ہے کہ وہ ستر ہزار ہوں گے، بعض حضرات نے اس کی تشریح میں فرمایا کہ واقعۃً وہ ستر ہزار افراد ہوں گے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ ستر ہزار کا لفظ یہاں عدد بیان کرنے کے لئے نہیں ہے، بلکہ کثرت کو بیان کرنا مقصود ہے، جیسے کوئی شخص کسی چیز کی کثرت کو بیان کرتا ہے تو اس کے لئے عدد بیان کر دیتا ہے، جبکہ مقصود عدد بیان کرنا نہیں ہوتا، بلکہ کثرت بیان کرنی مقصود ہوتی ہے، اسی طرح یہاں بھی اس عدد سے یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اس اُمت کے بے شمار افراد کو بلا حساب وکتاب کے جنت میں داخل فرمائیں گے۔ اور بعض حضرات نے یہ فرمایا کہ یہ جو ستر ہزار افراد ہوں گے، پھر ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ستر ہزار افراد ہوں گے جن کو اللہ تعالیٰ جنت میں داخل فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اپنی رحمت سے ہم سب کو جنت میں داخل فرمادے۔ آمین

ستر ہزار میں شامل ہونے کی دعا

جس وقت حضور اکرم ﷺ نے صحابہ کرام کے سامنے یہ بات ارشاد فرمائی تو ایک صحابی حضرت عُکاشہ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے، عرض کیا:

"يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! فَادْعُ اللّٰهَ اَنْ يَّجْعَلَنِيْ مِنْهُمْ"

"یا رسول اللہ! میرے لئے آپ دعا فرمادیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان میں داخل فرمادیں"

حضورِ اقدس ﷺ نے اسی وقت ان کے لئے دعا فرمادی کہ یا اللہ، ان کو ان لوگوں میں داخل فرمادے جو بلا حساب وکتاب کے جنت میں داخل ہونے والے ہیں۔ بس ان کا تو پہلے مرحلے پر ہی کام بن گیا۔ جب دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دیکھا کہ یہ تو بڑا اچھا موقع ہے تو ایک صاحب اور کھڑے ہوگئے اور کہا کہ یا رسول اللہ! میرے لئے دعا فرمادیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی ان میں داخل

فرمادیں۔ اس پر حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((سَبَقَكَ بِهَا عُكَّاشَةُ))

''عکاشہ تم سے سبقت لے گئے''

مطلب یہ تھا کہ چونکہ سب سے پہلے انہوں نے دعا کی درخواست کردی، میں نے اس کی تعمیل کردی، اب یہ سلسلہ مزید دراز نہیں ہوگا، اب اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں گے اس کو داخل فرمائیں گے۔

ہر مسلمان کو یہ دعا مانگنی چاہئے

اس حدیث میں اُمتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے لئے بشارت ہے، اور ان لوگوں کے لئے بڑی بشارت ہے جن کو اللہ تعالیٰ اس جماعت میں داخل فرمالیں جو بلاحساب و کتاب جنت میں داخل کردی جائے گی۔ ہمارا کیا منہ ہے کہ ہم یہ کہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس میں شامل فرمالیں، لیکن ان کی رحمت کے پیشِ نظر ایک ادنیٰ سے ادنیٰ اُمتی بھی یہ دعا مانگ سکتا ہے کہ یا اللہ، میں اس قابل تو نہیں ہوں، لیکن آپ کی رحمت سے کچھ بعید نہیں کہ میرے جیسے آدمی کو بھی بلاحساب و کتاب کے جنت میں داخل فرمادیں۔ آپ کی رحمت کی وسعت میں کوئی کمی نہیں آتی۔ لہٰذا ہر مسلمان کو یہ دعا مانگنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بلاحساب و کتاب کے جنت میں داخل فرمادیں۔

تکلیف یقینی اور فائدہ غیر یقینی والا علاج

بہرحال، اس حدیث میں چار صفات بیان فرمائی ہیں کہ جن میں یہ چار صفات پائی جائیں گی، وہ جنت میں بلاحساب داخل ہوں گے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ لوگ علاج کے وقت داغ نہیں لگاتے۔ اس زمانے میں اہلِ عرب کے یہاں یہ طریقہ تھا کہ لوگ جب کسی بیماری کا علاج کرتے اور کوئی دوا کارگر نہ ہوتی تو ان کے یہاں یہ بات مشہور تھی کہ لوہا آگ پر گرم کرکے اس بیمار کے جسم پر لگایا جائے۔ اس کے ذریعے مریض کو سخت تکلیف ہوتی تھی۔ ظاہر ہے کہ جب جلتا ہوا لوہا جسم سے لگے گا تو کیا قیامت ڈھائے گا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ یہ علاج ہے اور اس سے بیماری دور ہوتی ہے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے اس طریقۂ علاج کو پسند نہیں فرمایا، اس لئے کہ اس طریقۂ علاج میں تکلیف نقد ہے اور فائدہ یقینی نہیں، اور وہ علاج جس میں تکلیف تو نقد ہو جائے اور فائدہ کا پتہ نہ ہو کہ فائدہ ہوگا یا نہیں، ایسا علاج پسندیدہ نہیں، نبی کریم ﷺ نے اس کو ناپسند فرمایا۔

علاج میں بھی اعتدال مطلوب ہے

دوسری وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ درحقیقت یہ داغنے کا طریقہ علاج کے اندر غلو اور مبالغہ ہے۔ عرب میں یہ مقولہ مشہور تھا کہ "آخِرُ الدَّوَاءِ اَلْکَیُّ" یعنی آخری علاج داغ لگانا ہے۔ بتلانا یہ مقصود ہے کہ جب آدمی بیمار ہو جائے تو اس کا علاج کرنا سنت ہے، لیکن علاج ایسا ہونا چاہئے جو اعتدال کے ساتھ ہو، یہ نہیں کہ علاج کے اندر آپ انتہا کو پہنچ جائیں، اور مبالغہ سے کام لیں، یہ بات پسندیدہ نہیں۔ یہ درحقیقت اس بات کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کی کمی ہے، جس کی وجہ سے آدمی مبالغہ کر رہا ہے۔ انسان اسباب ضرور اختیار کرے، لیکن اعتدال کے ساتھ کرے۔ حدیث میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

"اَجْمِلُوْا فِی الطَّلَبِ"(۱)

یعنی ایک اجمالی کوشش کرو، اور پھر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو، یہ ہے سنت، لہٰذا علاج میں اس طرح کا انہماک، اور بہت زیادہ غلو یہ پسندیدہ نہیں۔

بدشگونی اور بدفالی کوئی چیز نہیں

دوسری صفت جو بیان فرمائی وہ بدشگونی ہے۔ اس کا بیان پہلے ہو چکا ہے کہ بدشگونی لینا کہ فلاں عمل سے یہ بدفالی ہو گئی، مثلاً بلی راستہ کاٹ گئی تو اب سفر ملتوی کر دیں، وغیرہ۔ یہ سب باتیں جاہلیت کے زمانے کی باتیں تھیں، اور اس کا اصل سبب اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کی کمی تھی، اس وجہ سے فرمایا کہ وہ لوگ بدشگونی نہیں کرتے۔

تعویذ گنڈوں میں افراط و تفریط

تیسری صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ لوگ جھاڑ پھونک نہیں کرتے، یعنی وہ لوگ جو جنت میں بلاسبب داخل ہوں گے وہ جھاڑ پھونک کے ذریعے علاج نہیں کرتے۔ اس کے بارے میں تفصیل یہ ہے کہ ہمارے زمانے میں جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈوں کے بارے میں لوگوں کے درمیان افراط و تفریط پائی جا رہی ہے۔ بعض لوگ وہ ہیں جو سرے سے جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈوں کے بالکل ہی قائل نہیں،

---

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب التجارات، باب الاقتصاد فى طلب المعيشة، رقم:۲۱۳۵، مؤطا مالك، كتاب الجامع، باب أنه كان يقالَ الحمد لله الذى خلق كل شيء ......الخ، كنزالعمال، رقم: ۹۲۹۱

بلکہ وہ لوگ اس قسم کے تمام کاموں کو ناجائز سمجھتے ہیں۔ اور بعض لوگ تو اس کام کو شرک قرار دیتے ہیں۔ اور دوسری طرف بعض لوگ ان تعویذ گنڈوں کے اتنے زیادہ معتقد اور ان میں اتنے زیادہ منہمک ہیں کہ ان کو ہر کام کے لئے ایک تعویذ ہونا چاہئے، ایک وظیفہ ہونا چاہئے، ایک گنڈا ہونا چاہئے۔ میرے پاس روزانہ بے شمار لوگوں کے فون آتے ہیں کہ صاحب بچی کے رشتے نہیں آرہے ہیں، اس کے لئے کوئی وظیفہ بتادیں، روزگار نہیں مل رہا ہے، اس کے لئے کوئی وظیفہ بتادیں، میرا قرضہ ادا نہیں ہو رہا ہے، اس کے لئے کوئی وظیفہ بتادیں۔ دن رات لوگ بس اس فکر میں رہتے ہیں کہ سارا کام ان وظیفوں سے اور ان تعویذ گنڈوں سے ہو جائے، ہمیں ہاتھ پاؤں ہلانے کی ضرورت نہ پڑے۔

جھاڑ پھونک میں غیر اللہ سے مدد

یہ دونوں باتیں افراط وتفریط کے اندر داخل ہیں، اور شریعت نے جو راستہ بتایا ہے وہ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ہے، جو قرآن وسنت سے سمجھ میں آتا ہے۔ یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ جھاڑ پھونک کی کوئی حیثیت نہیں، اور تعویذ کرنا ناجائز ہے۔ اس لئے کہ اگرچہ اس روایت میں ان لوگوں کی فضیلت بیان کی گئی ہے جو جھاڑ پھونک نہیں کرتے، لیکن خوب سمجھ لیجئے کہ اس سے ہر قسم کی جھاڑ پھونک مراد نہیں، بلکہ اس حدیث میں زمانۂ جاہلیت میں جھاڑ پھونک کا جو طریقہ تھا، اس کی طرف اشارہ ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں عجیب وغریب قسم کے منتر لوگوں کو یاد ہوتے تھے، اور یہ مشہور تھا کہ یہ منتر پڑھو تو اس سے فلاں بیماری سے افاقہ ہو جائے گا، فلاں منتر پڑھو تو اس سے فلاں کام ہو جائے گا، وغیرہ، اور ان منتروں میں اکثر وبیشتر جنات اور شیاطین سے مدد مانگی جاتی تھی، کسی میں بتوں سے مدد مانگی جاتی تھی۔ بہر حال ان منتروں میں ایک خرابی تو یہ تھی کہ ان میں غیر اللہ سے اور بتوں سے اور شیاطین سے مدد مانگی جاتی تھی کہ تم ہمارا یہ کام کردو، اسی طرح ان منتروں میں مشرکانہ الفاظ ہوتے تھے۔

جھاڑ پھونک کے الفاظ کو مؤثر سمجھنا

دوسری خرابی یہ تھی کہ اہل عرب ان الفاظ کو بذاتِ خود مؤثر مانتے تھے، یعنی ان کا یہ عقیدہ نہیں تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ تاثیر دے گا تو ان میں تاثیر ہوگی اور اللہ تعالیٰ کی تاثیر کے بغیر تاثیر نہیں ہوگی، بلکہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ان الفاظ میں بذاتِ خود تاثیر ہے، اور جو شخص یہ الفاظ بولے گا اس کو شفا ہو جائے گی۔ یہ دو خرابیاں تو تھیں ہی، اس کے علاوہ بسا اوقات وہ الفاظ ایسے ہوتے تھے کہ ان کے معنی ہی سمجھ میں نہیں آتے تھے، بالکل مہمل قسم کے الفاظ ہوتے تھے، جن کے کوئی معنی نہیں ہوتے تھے، وہ الفاظ بولے بھی جاتے تھے، اور ان الفاظ کو تعویذ کے اندر لکھا بھی جاتا تھا۔ درحقیقت ان الفاظ میں بھی اللہ کے سوا

شیاطین اور جنات سے مدد مانگی جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ سب شرک کی باتیں تھیں، اس لئے نبی کریم ﷺ نے جاہلیت کے جھاڑ پھونک کے طریقے کو منع فرما دیا۔ اور یہ فرمایا کہ جو لوگ اس قسم کے جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈوں میں مبتلا نہیں ہوتے، یہ وہ لوگ ہوں گے جن کو اللہ تعالیٰ بلا حساب و کتاب جنت میں داخل فرمائیں گے۔ لہٰذا اس حدیث میں جس جھاڑ پھونک کا ذکر ہے اس سے وہ جھاڑ پھونک مراد ہے جس کا زمانۂ جاہلیت میں رواج تھا۔

ہر مخلوق کی خاصیت اور طاقت مختلف ہے

اس کی تھوڑی سی حقیقت بھی سمجھ لیجئے کہ یہ کارخانۂ حیات یہ کائنات کا پورا نظام اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے مختلف چیزوں میں مختلف خاصیتیں اور مختلف تاثیریں رکھ دی ہیں، مثلاً پانی کے اندر یہ تاثیر رکھی ہے کہ وہ پیاس بجھاتا ہے، آگ کے اندر جلانے کی خاصیت رکھ دی ہے، اگر اللہ تعالیٰ یہ تاثیر آگ سے نکال دیں تو آگ جلانا چھوڑ دے گی، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے اسی آگ کو اللہ تعالیٰ نے گلزار بنا دیا تھا۔ ہوا کے اندر تاثیر الگ رکھی ہے۔ مٹی کی تاثیر الگ ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مختلف قسم کی مخلوقات پیدا فرمادی ہیں، انسان، جنات، جانور، شیاطین، وغیرہ، اور ان میں سے ہر ایک کو کچھ طاقت دے رکھی ہے۔ انسان کو طاقت دے رکھی ہے، گدھے گھوڑے کو بھی طاقت دے رکھی ہے، شیر اور ہاتھی کو بھی طاقت دے رکھی ہے، اور ہر ایک کی طاقت کا معیار اور پیمانہ مختلف ہے، شیر جتنا طاقتور ہے، انسان اتنا طاقتور نہیں ہے، سانپ کے اندر زہر رکھ دیا، اگر وہ کسی کو کاٹ لے تو وہ مر جائے، اسی طرح بچھو کے اندر زہر رکھ دیا ہے، لیکن اس کے کاٹنے سے مرتا نہیں، بلکہ تکلیف ہوتی ہے۔ بہرحال ہر چیز کی خاصیتیں مختلف ہیں، اور طاقتیں مختلف ہیں۔

جنات اور شیاطین کی طاقت

اسی طرح جنات اور شیاطین کو بھی اللہ تعالیٰ نے کچھ طاقتیں دے رکھی ہیں، وہ طاقتیں انسان کے لئے باعثِ تعجب ہوتی ہیں، مثلاً جنات کو اور شیاطین کو یہ طاقت حاصل ہے کہ وہ کسی کو نظر نہ آئیں، یہ طاقت انسان کو حاصل نہیں، اگر انسان یہ چاہے کہ میں کسی کو نظر نہ آؤں، تو وہ ایسی صورت حاصل نہیں کر سکتا۔ اگر انسان یہ چاہے کہ میں ایک لمحہ میں یہاں سے اُڑ کر امریکہ چلا جاؤں تو یہ طاقت اس کو حاصل نہیں ہے۔ لیکن بعض جنات اور شیاطین کو اللہ تعالیٰ نے یہ طاقت دے رکھی ہے۔ یہ شیاطین لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے اور ان کو اللہ تعالیٰ کے دین سے پھیرنے کے لئے بعض اوقات انسانوں کو ایسے کلمات کہنے کی ترغیب دیتے ہیں جو شرک والے ہیں، وہ شیاطین انسانوں سے یہ کہتے ہیں کہ اگر تم

وہ کلمات کہو گے جو شرک والے ہیں اور نعوذ باللہ، اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کرو گے تو ہم خوش ہوں گے، اور جو طاقت اللہ تعالیٰ نے ہمیں دے رکھی ہے، اس کو تمہارے حق میں استعمال کریں گے۔

اس عمل کا دین سے کوئی تعلق نہیں

مثلاً فرض کریں کہ کسی کی کوئی چیز گم ہوگئی ہے، اور وہ بیچارہ ڈھونڈتا پھر رہا ہے، اب اگر کسی جن یا شیطان کو پتہ چل گیا کہ وہ کہاں پڑی ہوئی ہے تو وہ اس چیز کو اُٹھا کر ایک منٹ میں لاسکتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ طاقت دی ہے۔ اس شیطان نے اپنے معتقدین سے یہ کہہ رکھا ہے کہ اگر تم یہ کلمات کہو گے تو میں تمہاری مدد کروں گا، اور وہ چیز لاکر دیدوں گا۔ اس کا نام "جادو" اس کا نام "سحر" اور "کہانت" ہے، اور اسی کو "سفلی" عمل بھی کہا جاتا ہے، اس عمل کا تعلق نہ کسی نیکی سے ہے، نہ تقویٰ سے، نہ دین سے ہے، اور نہ ہی ایمان سے، بلکہ بدترین کافر بھی اس طرح کے شعبدے دکھا دیتے ہیں، اس وجہ سے کہ ان کے ہاتھ میں بعض جنات اور شیاطین مسخر ہیں، وہ جنات ان کا کام کر دیتے ہیں، لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بہت پہنچا ہوا آدمی ہے، اور بڑا نیک آدمی ہے، حالانکہ اس عمل کا روحانیت سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ اس عمل کے لئے ایمان بھی ضروری نہیں، اسی لئے سفلی عمل اور سحر کو حدیث شریف میں سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے، اور سحر کرنے والے کی نوبت کفر تک پہنچتی ہے۔ بہر حال یہ طریقہ جو زمانۂ جاہلیت میں رائج تھا، نبی کریم ﷺ نے اس کو منع فرمایا کہ اگر اللہ پر ایمان ہے، اگر اللہ تعالیٰ کی قدرت پر ایمان ہے تو پھر یہ شرکیہ کلمات کہہ کر اور فضول مہمل کلمات ادا کر کے شیاطین کے ذریعہ کام کرانا شریعت میں ناجائز اور حرام ہے، اور کسی مسلمان کا یہ کام نہیں ہے۔

بیمار پر پھونکنے کے مسنون الفاظ

لیکن ساتھ ہی رسول کریم ﷺ نے اس قسم کے منتروں کے بجائے اور شرکیہ کلمات کے بجائے آپ نے خود اللہ جل شانہ کے نام مبارک سے جھاڑ پھونک کیا۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ طریقہ سکھایا، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی شخص بیمار ہو جائے تو یہ کلمات کہو:

((اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اَذْهِبِ الْبَاْسَ وَاشْفِ اَنْتَ الشَّافِیْ لَا شِفَاءَ اِلَّا شِفَاءُ كَ، شِفَاءً لَا يُغَادِرُ سَقَمًا))(۱)

اور بعض اوقات آپ نے کلمات سکھا کر فرمایا کہ ان کلمات کو پڑھ کر تھوکو، اور اس کے ذریعہ جھاڑو، آپ نے خود بھی اس پر عمل فرمایا، اور صحابہ کرام کو بھی اس کی تلقین فرمائی۔

(۱) صحیح البخاری، کتاب المرضی، باب دعاء العائد للمریض، (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

معوذتین کے ذریعہ دم کرنے کا معمول

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا روزانہ کا معمول تھا کہ رات کو سونے سے پہلے معوذتین پڑھتے، اور بعض روایات میں "قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ" کا بھی اضافہ ہے، یعنی "قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ" اور "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ" اور "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ" ان تینوں سورتوں کو تین تین مرتبہ پڑھتے، اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں پر پھونک مارتے، اور پھر پورے جسم پر ہاتھ پھیرتے۔ یہ جھاڑ پھونک خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی۔ اور آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اس عمل کے ذریعہ شیطانی اثرات سے حفاظت رہتی ہے، سحر سے اور فضول حملوں سے انسان محفوظ رہتا ہے۔ (۱)

مرضِ وفات میں اس معمول پر عمل

ایک اور حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مرضِ وفات میں تھے، اور صاحبِ فراش تھے، اور اتنے کمزور ہوگئے تھے کہ اپنا دستِ مبارک پوری طرح اُٹھانے پر قادر نہیں تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مجھے خیال آیا کہ رات کا وقت ہے، اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ساری عمر یہ عمل فرماتے رہے کہ معوذتین پڑھ کر اپنے ہاتھوں پر دم فرماتے تھے، اور پھر ان ہاتھوں کو سارے جسم پر پھیرتے تھے، لیکن آج آپ کے اندر یہ طاقت نہیں کہ یہ عمل فرمائیں، چنانچہ میں نے خود معوذتین پڑھ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر دم کیا، اور آپ ہی کے دستِ مبارک کو آپ کے جسم مبارک پر پھیر دیا، اس لئے کہ اگر میں اپنے ہاتھوں کو آپ کے جسم مبارک پر پھیرتی تو اس کی اتنی تاثیر اور اتنا فائدہ نہ ہوتا جتنا فائدہ خود آپ کے دستِ مبارک پھیرنے سے ہوتا۔ اور بھی متعدد مواقع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تلقین فرمائی کہ اگر جھاڑ پھونک کرنی ہے تو اللہ کے کلام سے کرو، اور اللہ کے نام سے کرو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے نام میں یقیناً جو تاثیر ہے وہ شیاطین کے شرکیہ کلام میں کہاں ہو سکتی ہے۔ لہٰذا آپ نے اس کی اجازت عطا فرمائی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) رقم: ۵۲۴۳، صحیح مسلم، کتاب السلام، باب استحباب رقیة المریض، رقم: ۴۰۶۱، سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول الله، باب فی دعاء المریض، رقم: ۳۴۸۸، ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے "اے اللہ، اے ہمارے رب! بیماری کو دور کردے اور شفا عطا فرمادے، تو ہی شفا دینے والا ہے شفا وہی ہے جو تو عطا کرے، ہم تجھ سے شفا کا سوال کرتے ہیں ایسی شفا جو بیماری کو بالکل ختم کردے"

(۱) صحیح البخاری، کتاب الدعوات، باب التعوذ والقراءة عند المنام، رقم: ۵۸۴۴، صحیح مسلم، کتاب السلام، رقم: ۴۰۶۵۔ سنن أبی داود، کتاب الطب، رقم: ۳۴۰۳

حضرت ابوسعید خُدری رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ

روایات میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ آتا ہے کہ ایک مرتبہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایک قافلہ کہیں سفر پر جارہا تھا، راستے میں ان کا زادِراہ، کھانے پینے کا سامان ختم ہوگیا، راستے میں غیر مسلموں کی ایک بستی پر اس قافلے کا گزر ہوا، انہوں نے جاکر بستی والوں سے کہا کہ ہم مسافر لوگ ہیں، اور کھانے پینے کا سامان ختم ہوگیا ہے، اگر تمہارے پاس کچھ کھانے پینے کا سامان ہو تو ہمیں دیدو، ان لوگوں نے شاید مسلمانوں سے تعصب اور مذہبی دشمنی کی بنیاد پر کھانا دینے سے انکار کردیا کہ ہم تمہاری مہمانی نہیں کرسکتے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے قافلے نے بستی کے باہر پڑاؤ ڈال دیا، رات کا وقت تھا، انہوں نے سوچا کہ رات یہاں پر گزار کر صبح کسی اور جگہ پر کھانا تلاش کریں گے۔

اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ اس بستی کے سردار کو سانپ نے کاٹ لیا، اب بستی والوں نے سانپ کے کاٹنے کے جتنے علاج تھے، وہ سب آزمالیے، لیکن اس کا زہر نہیں اُترتا تھا، کسی نے ان سے کہا کہ سانپ کا زہر اُتارنے کے لئے جھاڑ پھونک کی جاتی ہے، اگر جھاڑ پھونک جاننے والا ہو تو اس کو بلایا جائے، تاکہ وہ آکر زہر اُتاردے۔ انہوں نے کہا کہ بستی میں تو جھاڑ پھونک کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ کسی نے کہا کہ وہ قافلہ جو بستی کے باہر ٹھہرا ہوا ہے، وہ مولوی قسم کے لوگ معلوم ہوتے ہیں، ان کے پاس جاکر معلوم کرو، شاید ان میں سے کوئی شخص سانپ کی جھاڑ جانتا ہو، چنانچہ بستی کے لوگ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے پاس آئے، اور پوچھا کہ کیا آپ میں کوئی شخص ہے جو سانپ کے ڈسے کو جھاڑ دے، بستی کے ایک شخص کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ٹھیک ہے میں جھاڑ دوں گا، لیکن تم لوگ بہت بخیل ہو کہ ایک مسافر قافلہ آیا ہوا ہے، تم سے کہا کہ ان کے کھانے پینے کا انتظام کردو، تم نے ان کے کھانے کا کوئی انتظام نہیں کیا۔ بستی والوں نے کہا کہ ہم بکریوں کا پورا گلہ آپ کو دے دیں گے، لیکن ہمارے آدمی کا تم علاج کردو۔

چنانچہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ خود اپنا واقعہ سناتے ہیں کہ مجھے جھاڑ پھونک تو کچھ نہیں آتا تھا، لیکن میں نے سوچا کہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں یقیناً برکت ہوگی، اس لئے میں ان لوگوں کے ساتھ بستی میں گیا، اور وہاں جاکر سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کرتا رہا، سورۂ فاتحہ پڑھتا اور دم کرتا، اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ اس کا زہر اُتر گیا، اب وہ لوگ بہت خوش ہوئے، بکریوں کا ایک گلہ ہمیں دے دیا، ہم نے بکریوں کا گلہ ان سے لے تو لیا، لیکن بعد میں خیال آیا کہ ہمارے لئے ایسا کرنا جائز بھی ہے یا نہیں؟ اور یہ بکریاں ہمارے لئے حلال بھی ہیں یا نہیں؟ لہٰذا جب تک حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ پوچھ لیں، اس

وقت تک ان کو استعمال نہیں کریں گے۔

جھاڑ پھونک پر معاوضہ لینا

چنانچہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو سارا واقعہ سنایا، اور پوچھا کہ یا رسول اللہ، اس طرح بکریوں کا گلہ ہمیں حاصل ہوا ہے، ہم اس کو رکھیں یا نہ رکھیں؟ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے لئے اس کو رکھنا جائز ہے، لیکن یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ کیسے پتہ چلا کہ سانپ کے کاٹنے کا یہ علاج ہے؟ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یا رسول اللہ، میں نے سوچا کہ بے ہودہ قسم کے کلام میں تاثیر ہوسکتی ہے تو اللہ کے کلام میں تو بطریق اولیٰ تاثیر ہوگی، اس وجہ سے میں سورۂ فاتحہ پڑھتا رہا، اور دم کرتا رہا، اللہ تعالیٰ نے اس سے فائدہ پہنچا دیا۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے اس عمل سے خوش ہوئے، اور ان کی تائید فرمائی، اور بکریوں کا گلہ رکھنے کی بھی اجازت عطا فرمائی۔ اب دیکھئے، اس واقعے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جھاڑ پھونک کی نہ صرف تائید فرمائی، بلکہ اس عمل کے نتیجے میں بکریوں کا جو گلہ بطور انعام کے ملا تھا، اس کو رکھنے کی اجازت عطا فرمائی[1] اس قسم کے بے شمار واقعات ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی یہ عمل فرمایا اور صحابہ کرام سے بھی کرایا۔ یہ تو جھاڑ پھونک کا قضیہ ہوا۔

تعویذ کے مسنون کلمات

اب تعویذ کی طرف آیئے۔ تعویذ کاغذ پر لکھے جاتے ہیں، اور ان کو کبھی پیا جاتا ہے، اور کبھی گلے اور بازو میں باندھا جاتا ہے، کبھی جسم کے کسی اور حصے پر استعمال کیا جاتا ہے۔ خوب سمجھ لیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تو یہ ثابت نہیں کہ آپ نے کوئی تعویذ لکھا ہو، لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے تعویذ لکھنا ثابت ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے صحابہ کرام کو یہ کلمات سکھائے تھے:

((اَعُوْذُ بِکَلِمَاتِ اللّٰہِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَاللّٰہُ خَیْرٌ حَافِظًا وَّھُوَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ))

چنانچہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جو یہودی سے مسلمان ہوئے تھے، اور یہودی ان کے دشمن تھے، اور ان کے خلاف جادو وغیرہ کرتے رہتے تھے، تو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ کلمات سکھاتے ہوئے فرمایا تھا کہ تم یہ کلمات خود پڑھا کرو، اور اپنے اُوپر ان کا دم کرلیا کرو، پھر انشاء اللہ کوئی

(۱) صحیح البخاری، کتاب الطب، باب النفث فی الرقیۃ، رقم: ۵۳۰۸

جادو تم پر اثر نہیں کرے گا۔ چنانچہ وہ یہ کلمات پڑھا کرتے تھے۔

ان کلمات کے فائدے

اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اگر رات کو سوتے ہوئے کسی کی آنکھ گھبراہٹ سے کھل جائے، اور اس کو خوف محسوس ہو تو اس وقت یہ کلمات پڑھ لے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی بڑی اولاد کو تو یہ کلمات سکھا دیئے ہیں، اور یاد کرا دیئے ہیں، تا کہ ان کو پڑھ کر وہ اپنے اُوپر دم کرتے رہا کریں، اور اس کے نتیجے میں وہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں رہیں، اور جو میرے چھوٹے بچے ہیں، وہ یہ کلمات خود سے نہیں پڑھ سکتے، ان کے لئے میں نے یہ کلمات کاغذ پر لکھ کر ان کے گلے میں ڈال دیئے ہیں[1] یہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا اثر ہے، اور ثابت ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ اگر کسی عورت کی ولادت کا وقت ہو تو ولادت میں سہولت پیدا کرنے کے لئے تشتری یا صاف برتن میں یہ کلمات لکھ کر اس کو دھو کر اس خاتون کو پلا دیا جائے تو اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے ولادت میں سہولت فرما دیتے ہیں، اسی طرح بہت سے صحابہ اور تابعین سے منقول ہے کہ وہ لکھ کر لوگوں کو تعویذ دیا کرتے تھے۔

اصل سنت ''جھاڑ پھونک'' کا عمل ہے

لیکن ایک بات یاد رکھنی چاہئے جو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی ہے، اور احادیث سے یقیناً وہی بات ثابت ہوتی ہے، وہ یہ کہ تعویذ کا فائدہ ثانوی درجے کا ہے، اصل فائدے کی چیز ''جھاڑ پھونک'' ہے، جو براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، یہ عمل آپ نے خود فرمایا، اور صحابہ کرام کو اس کی تلقین فرمائی، اس عمل میں زیادہ تاثیر اور زیادہ برکت ہے، اور تعویذ اس جگہ استعمال کیا جائے جہاں آدمی وہ کلمات خود نہ پڑھ سکتا ہو، اور نہ دوسرا شخص پڑھ کر دم کر سکتا ہو، اس موقع پر تعویذ دیدیا جائے، ورنہ اصل تاثیر ''جھاڑ پھونک'' میں ہے۔ بہر حال صحابہ کرام سے دونوں طریقے ثابت ہیں۔

کون سے ''تمائم'' شرک ہیں

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تعویذ لٹکانا شرک ہے، اور گناہ ہے، اس کی وجہ ایک حدیث ہے جس کا مطلب لوگ صحیح نہیں سمجھتے، اس کے نتیجے میں وہ تعویذ لٹکانے کو ناجائز سمجھتے ہیں، چنانچہ حدیث

(۱) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللّٰہ، باب منه، رقم: ۳٤٥١

شریف میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ الرُّقٰی وَالتَّمَائِمَ وَالتِّوَلَۃَ شِرْکٌ))(۱)

''تمائم'' تمیمۃ کی جمع ہے، اور عربی زبان میں ''تمیمۃ'' کے جو معنی ہیں اُردو میں اس کے لئے کوئی لفظ نہیں تھا، اس لئے لوگوں نے غلطی سے اس کے معنی ''تعویذ'' سے کر دیئے، اس کے نتیجے میں اس حدیث کے معنی یہ ہوئے کہ ''تعویذ شرک ہے''۔ اب لوگوں نے اس بات کو پکڑ لیا کہ ہر قسم کا تعویذ شرک ہے۔ حالانکہ یہ بات صحیح نہیں۔ ''تمیمۃ'' عربی زبان میں سیپ کی ان کوڑیوں کو کہا جاتا ہے جن کو زمانۂ جاہلیت میں لوگ دھاگے میں پرو کر بچوں کے گلوں میں ڈال دیا کرتے تھے، اور ان کوڑیوں پر مشرکانہ منتر پڑھے جاتے تھے، اور دوسری طرف یہ کہ ان کوڑیوں کو بذاتِ خود مؤثر سمجھا جاتا تھا، یہ ایک مشرکانہ عمل تھا، جس کو ''تمیمۃ'' کہا جاتا تھا، اور رسول اللہ ﷺ نے اس کی ممانعت فرمائی کہ تمائم شرک ہے۔

جھاڑ پھونک کے لئے چند شرائط

لیکن جہاں تک اللہ تعالیٰ کے نام کے ذریعہ جھاڑ پھونک کا تعلق ہے، وہ خود حضورِ اقدس ﷺ سے اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے، اس لئے وہ ٹھیک ہے، لیکن اس کے جواز کے لئے چند شرائط انتہائی ضروری ہیں، ان کے بغیر یہ عمل جائز نہیں۔

پہلی شرط یہ ہے کہ جو کلمات پڑھے جائیں ان میں کوئی کلمہ ایسا نہ ہو جس میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے مدد مانگی گئی ہو، اس لئے کہ بعض اوقات ان میں ''یا فلاں'' کے الفاظ ہوتے ہیں، اور اس جگہ پر اللہ کے علاوہ کسی اور کا نام ہوتا ہے، ایسا تعویذ، ایسا گنڈا، ایسی جھاڑ پھونک حرام ہے، جس میں غیر اللہ سے مدد لی گئی ہو۔

دوسری شرط یہ ہے کہ اگر جھاڑ پھونک کے الفاظ یا تعویذ میں لکھے ہوئے الفاظ ایسے ہیں جن کے معنی ہی معلوم نہیں کہ کیا معنی ہیں، ایسا تعویذ استعمال کرنا بھی ناجائز ہے، اس لئے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی مشرکانہ کلمہ ہو، اور اس میں غیر اللہ سے مدد مانگی گئی ہو، یا اس میں شیطان سے خطاب ہو، اس لئے ایسے تعویذ بالکل ممنوع اور ناجائز ہیں۔

یہ رُقیہ حضور ﷺ سے ثابت ہے

البتہ ایک ''رقیہ'' ایسا ہے جس کے معنی ہمیں معلوم نہیں، لیکن حضورِ اقدس ﷺ نے اس کی

(۱) سنن أبی داؤد، کتاب الطب، باب فی تعلیق التمائم، رقم: ۳۳۸۵، سنن ابن ماجہ، کتاب الطب، باب تعلیق التمائم، رقم: ۳۵۲۱، مسند أحمد، مسند عبداللہ بن مسعود، رقم: ۳۴۳۳۔

اجازت دی ہے، چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک صحابی نے حضورِ اقدس ﷺ کے سامنے عرض کیا کہ ایک عمل ایسا ہے کہ اگر سانپ یا بچھو کسی کو کاٹ لے تو اس کے کاٹے کا اثر زائل کرنے کے لئے اور اس کے شر سے محفوظ رہنے کے لئے ہم یہ الفاظ پڑھتے ہیں:

"شَجَّةٌ قَرْنِيَّةٌ مِلْحَةُ بَحْرٍ قفطا"(۱)

اب اس کے معنی تو ہمیں معلوم نہیں، لیکن جب حضور اکرم ﷺ پر پیش کیا گیا تو آپ نے اس کو منع نہیں فرمایا، شاید یہ عبرانی زبان کے الفاظ ہیں۔ اور یہ حدیث صحیح سند کی ہے، اس لئے علماء کرام نے فرمایا کہ صرف یہ ایک "رقیہ" ایسا ہے جس کے معنی معلوم نہ ہونے کے باوجود اس کے ذریعہ جھاڑ پھونک بھی جائز ہے، اور اس کے ذریعہ تعویذ لکھنا بھی جائز ہے۔ البتہ اس پر ایسا بھروسہ کرنا کہ گویا انہی کلمات کے اندر بذاتِ خود تاثیر ہے، یہ حرام ہے، بلکہ ان کلمات کو ایک تدبیر سمجھے، اس سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

بہرحال، تعویذ اور جھاڑ پھونک کی یہ شرعی حقیقت ہے، لیکن اس معاملے میں افراط و تفریط ہو رہی ہے، ایک طرف تو وہ لوگ ہیں جو اس عمل کو حرام اور ناجائز کہتے ہیں، ان کی تفصیل تو عرض کر دی۔

تعویذ دینا عالم اور متقی ہونے کی دلیل نہیں

دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ بس سارا دین ان تعویذ گنڈوں کے اندر منحصر ہے، اور جو شخص تعویذ گنڈا کرتا ہے وہ بہت بڑا عالم ہے، وہ بہت بڑا نیک آدمی ہے، متقی اور پرہیز گار ہے، اسی کی تقلید کرنی چاہئے، اس کا معتقد ہونا چاہئے۔ اور جو شخص تعویذ گنڈا نہیں کرتا یا جس کو تعویذ گنڈا کرنا نہیں آتا اس کے بارے میں یہ سمجھتے ہیں کہ اس کو دین کا علم ہی نہیں۔ بہت سے لوگ میری طرف رجوع کرتے ہیں کہ فلاں مقصد کے لئے تعویذ دے دیجئے، میں ان سے جب کہتا ہوں کہ مجھے تو تعویذ دینا نہیں آتا تو وہ لوگ بہت حیران ہوتے ہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ جو اتنا بڑا دارالعلوم بنا ہوا ہے، اس میں تعویذ گنڈے ہی سکھائے جاتے ہیں، اور اس میں جو درس ہوتے ہیں وہ سب تعویذ اور جھاڑ پھونک کے ہوتے ہیں، لہٰذا جس کو جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈا نہیں آتا، وہ یہاں پر اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ جو اصل کام یہاں پر سیکھنے کا تھا، وہ تو اس نے سیکھا ہی نہیں۔

تعویذ گنڈے میں انہماک مناسب نہیں

ان لوگوں نے سارا دین تعویذ گنڈے میں سمجھ لیا ہے، اور ان لوگوں کا خیال یہ ہے کہ دنیا کی

(۱) المعجم الکبیر، رقم: ۹۹۰۷ (۴۱۹/۸)، مصنف ابن أبي شيبة (۱۲۹/۷)

کوئی غرض ایسی نہیں ہے جس کا علاج کوئی تعویذ نہ ہو، چنانچہ ان کو ہر کام کے لئے ایک تعویذ چاہئے۔ فلاں کام نہیں ہو رہا ہے، اس کے لئے کیا وظیفہ پڑھوں؟ فلاں کام کے لئے ایک تعویذ دیدیں۔ لیکن ہمارے اکابر نے اعتدال کو ملحوظ رکھا کہ جس حد تک حضورِ اقدس ﷺ نے عمل کیا، اس حد تک ان پر عمل کریں، یہ نہیں کہ دن رات آدمی یہی کام کرتا رہے، اور دین و دنیا کا ہر کام تعویذ گنڈے کے ذریعہ کرے، یہ بات غلط ہے۔ اگر یہ عمل درست ہوتا تو پھر سرکارِ دو عالم ﷺ کو جہاد کرنے کی کیا ضرورت تھی، بس کافروں پر کوئی ایسی جھاڑ پھونک کرتے کہ وہ سب حضور ﷺ کے قدموں میں آکر ڈھیر ہو جاتے۔ آپ نے اس جھاڑ پھونک پر کبھی کبھی عمل بھی کیا ہے، لیکن اتنا غلو اور انہماک بھی نہیں کیا کہ ہر کام کے لئے تعویذ گنڈے کو استعمال فرماتے۔

ایک انوکھا تعویذ

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک دیہاتی آدمی آیا۔ اس کے دماغ میں یہی بسا ہوا تھا کہ مولوی اگر تعویذ گنڈا نہیں جانتا تو وہ بالکل جاہل ہے، اس کو کچھ نہیں آتا، چنانچہ آپ کو بڑا عالم سمجھ کر آپ کے پاس آیا، اور کہا کہ مجھے تعویذ دیدو۔ مولانا نے فرمایا کہ مجھے تو تعویذ آتا نہیں۔ اس نے کہا کہ اجی نہیں مجھے دیدو۔ حضرت نے فرمایا کہ مجھے آتا نہیں تو کیا دیدوں؟ لیکن وہ پیچھے پڑ گیا کہ مجھے تعویذ دیدو۔ حضرت فرماتے ہیں کہ مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا لکھوں، تو میں نے اس تعویذ میں لکھ دیا کہ ''یا اللہ یہ مانتا نہیں، میں جانتا نہیں، آپ اپنے فضل و کرم سے اس کا کام کر دیجئے'' یہ لکھ کر میں نے اس کو دیدیا کہ یہ لٹکا لے، اس نے لٹکا لیا، اللہ تعالیٰ نے اسی کے ذریعہ اس کا کام بنا دیا۔

ٹیڑھی مانگ پر نرالا تعویذ

حضرت ہی کا واقعہ ہے کہ ایک عورت آئی، اور اس نے کہا کہ جب میں سر کے بال بناتی ہوں تو مانگ ٹیڑھی بن جاتی ہے، سیدھی نہیں بنتی، اس کا کوئی تعویذ دیدو۔ حضرت نے فرمایا کہ مجھے تعویذ آتا نہیں، اور اس کا کیا تعویذ ہوگا کہ مانگ سیدھی نہیں نکلتی۔ مگر وہ عورت پیچھے پڑ گئی۔ حضرت فرماتے ہیں کہ جب اس نے زیادہ اصرار کیا تو میں نے ایک کاغذ پر لکھ دیا ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، اھدنا الصراط المستقیم''، اس کا تعویذ بنا کر پہن لو تو شاید تمہاری مانگ سیدھی ہو جائے۔ اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سیدھی کر دی ہوگی۔ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کا معاملہ اپنے نیک بندوں کے ساتھ یہ ہوتا ہے کہ جب ان کی زبان سے کوئی کلمہ نکل جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو سچا کر دیتے ہیں۔ بہر حال، بزرگوں کے واقعات اور حالات میں یہ جو لکھا ہوتا ہے کہ فلاں بزرگ نے یہ کلمہ لکھ دیا، اس سے فائدہ ہو گیا وہ اسی طرح ہے

کہ اللہ تعالیٰ کے کسی نیک بندے سے کوئی درخواست کی گئی، اور اس کے دل میں یہ آیا کہ یہ کلمات لکھ دوں، شاید اس سے فائدہ ہو جائے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعہ فائدہ دے دیا۔

ہر کام تعویذ کے ذریعہ کرانا

آج کل یہ صورتِ حال یہ ہو گئی ہے کہ ہر وقت آدمی اسی جھاڑ پھونک کے دھندے میں لگا رہتا ہے، ہر وقت اسی تعویذ گنڈے کے چکر میں لگا رہتا ہے کہ صبح سے شام تک جو بھی کام ہو وہ تعویذ کے ذریعہ ہو، فلاں کام کا الگ تعویذ ہونا چاہئے، فلاں کام کا الگ تعویذ ہونا چاہئے، ملازمت کا الگ تعویذ ہونا چاہئے، بیماری کا الگ تعویذ ہونا چاہئے، ہر چیز کا الگ تعویذ ہونا چاہئے، ہر چیز کی ایک الگ دعا ہونی چاہئے۔ تعویذ گنڈے میں اتنا انہماک اور غلو سنت کے خلاف ہے۔ آپ ﷺ نے کبھی کبھی جھاڑ پھونک کی ہے، لیکن یہ نہیں تھا کہ دنیا کے ہر کام کے لئے جھاڑ پھونک کر رہے ہیں۔ کافروں کے ساتھ جہاد ہو رہے ہیں، لڑائی ہو رہی ہے، کہیں یہ منقول نہیں کہ کفار کو زیر کرنے کے لئے آپ نے کوئی جھاڑ پھونک کی ہو۔

تعویذ کرنا نہ عبادت نہ اس پر ثواب

ہاں! دعا ضرور فرماتے تھے، اس لئے کہ سب سے بڑی اور اصل چیز دعا ہے۔ یاد رکھئے، تعویذ اور جھاڑ پھونک کے ذریعہ علاج جائز ہے، مگر یہ عبادت نہیں۔ قرآن کریم کی آیات کو اور قرآن کریم کی سورتوں کو اور اللہ تعالیٰ کے ناموں کو اپنے کسی دنیوی مقصد کے لئے استعمال کرنا زیادہ سے زیادہ جائز ہے، لیکن یہ کام عبادت نہیں، اور اس میں ثواب نہیں ہے۔ جیسے آپ کو بخار آیا، اور آپ نے دوا پی لی، تو یہ دوا پینا جائز ہے، لیکن دوا پینا عبادت نہیں، بلکہ ایک مباح کام ہے۔ اسی طرح تعویذ کرنا اور جھاڑ پھونک کرنا، اس تعویذ اور جھاڑ پھونک میں اگرچہ اللہ کا نام استعمال کیا، لیکن جب تم نے اس کو اپنے دنیاوی مقصد کے لئے استعمال کیا تو اب یہ بذاتِ خود ثواب اور عبادت نہیں۔

اصل چیز دعا کرنا ہے

لیکن اگر براہِ راست اللہ تعالیٰ سے مانگو، اور دو رکعت صلوٰۃ الحاجۃ پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ یا اللہ! اپنی رحمت سے میرا یہ مقصد پورا فرما دیجئے، یا اللہ! میری مشکل حل فرما دیجئے، یا اللہ! میری یہ پریشانی دور فرما دیجئے، تو اس دعا کرنے میں ثواب ہی ثواب ہے۔ حضورِ اقدس ﷺ کی سنت یہ ہے کہ جب کوئی حاجت پیش آئے تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کرو، اور اگر دو رکعت صلوٰۃ الحاجۃ پڑھ کر دعا

کرو تو زیادہ اچھا ہے۔ اس سے یہ ہوگا کہ جو مقصد ہے وہ اگر مفید ہے تو انشاء اللہ حاصل ہوگا، اور ثواب تو ہر حال میں ملے گا، اس لئے کہ دعا کرنا چاہے دنیا کی غرض سے ہو وہ ثواب کا موجب ہے، اس لئے کہ دعا کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةِ"

''دعا بذاتِ خود عبادت ہے''[1]

تعویذ کرنے کو اپنا مشغلہ بنالینا

لہٰذا اگر کسی شخص کو ساری عمر جھاڑ پھونک کا طریقہ نہ آئے، تعویذ لکھنے کا طریقہ نہ آئے، لیکن وہ براہِ راست اللہ تعالیٰ سے دعا کرے تو یقیناً اس کا یہ عمل اس تعویذ اور جھاڑ پھونک سے بدرجہا افضل اور بہتر ہے۔ لہٰذا ہر وقت تعویذ گنڈے میں لگے رہنا یہ عمل سنت کے مطابق نہیں۔ جو بات نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے جس حد تک ثابت ہے اس کو اسی حد پر رکھنا چاہئے، اس سے آگے نہیں بڑھنا چاہئے۔ اگر کبھی ضرورت پیش آئے تو اللہ تعالیٰ کا نام لے کر جھاڑ پھونک کرنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن ہر وقت اس کے اندر انہماک اور غلو کرنا اور اس کو اپنا مشغلہ بنالینا کسی طرح بھی درست نہیں، بس، تعویذ گنڈوں کی یہ حقیقت ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

روحانی علاج کیا ہے؟

اب لوگوں نے یہ تعویذ گنڈے، یہ عملیات، یہ وظیفے، اور جھاڑ پھونک ان کا نام رکھ لیا ہے ''روحانی علاج'' حالانکہ یہ بڑے مغالطے اور دھوکے میں ڈالنے والا نام ہے، اس لئے کہ روحانی علاج تو دراصل انسان کے اخلاق کی اصلاح کا نام تھا، اس کے ظاہری اعمال کی اصلاح اور اس کے باطن کے اعمال کی اصلاح کا نام تھا، یہ اصل میں روحانی علاج تھا، مثلاً ایک شخص کے اندر تکبر ہے، اب یہ تکبر کیسے زائل ہو؟ یا مثلاً حسد پیدا ہوگیا ہے، وہ کیسے زائل ہو؟ یا مثلاً بغض پیدا ہوگیا ہے، وہ کیسے زائل ہو؟ حقیقت میں اس کا نام ''روحانی علاج'' ہے، لیکن آج اس تعویذ گنڈے کے علاج کا نام روحانی علاج رکھ دیا ہے، جو بڑے مغالطے والا عمل ہے۔

صرف تعویذ دینے سے پیر بن جانا

اور اگر کسی شخص کا تعویذ گنڈا اور جھاڑ پھونک اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے کامیاب ہوگیا تو اس

(۱) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب منه، رقم: ۳۲۹۳

شخص کے متقی اور پرہیزگار ہونے کی دلیل نہیں، اور نہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ شخص دینی اعتبار سے مقتدیٰ بن گیا ہے، وہ تو اللہ تعالیٰ نے الفاظ میں تاثیر رکھ دی ہے، جو شخص بھی اس کو پڑھے گا، تاثیر حاصل ہو جائے گی۔ یہ بات اس لئے بتادی کہ بعض اوقات لوگ یہ دیکھ کر کہ اس کے تعویذ بڑے کارگر ہوتے ہیں، اس کی جھاڑ پھونک بڑی کامیاب ہوتی ہے، اس کو ''پیر صاحب'' بنا لیتے ہیں، اور اس کو اپنا مقتدیٰ قرار دیتے ہیں، چاہے اس شخص کی زندگی شریعت کے احکام کے خلاف ہو، چاہے اس کی زندگی سنت کے مطابق نہ ہو، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی اتباع کرنے والے بھی خلافِ شرع امور کا ارتکاب کرتے ہیں۔

ایک عامل کا وحشت ناک واقعہ

میں نے خود اپنی آنکھوں سے ایک وحشت ناک منظر دیکھا، وہ یہ کہ ایک مسجد میں جانا ہوا، معلوم ہوا کہ یہاں ایک عامل صاحب آئے ہوئے ہیں، نماز اور سنت وغیرہ پڑھ کر باہر نکلا تو دیکھا کہ باہر لوگوں کی دورویہ لمبی قطار لگی ہوئی ہے، اور عامل صاحب مسجد سے باہر نکلے تو لوگ قطار میں کھڑے ہوئے تھے، انہوں نے اپنے منہ کھول دیئے، اور پھر پیر صاحب نے ایک ایک شخص کے منہ کے اندر تھوکنا شروع کر دیا، ایک شخص داہنی طرف، پھر بائیں طرف کے منہ میں تھوکتے، اس طرح ہر شخص کے منہ میں اپنا بلغم اور تھوک ڈالتے جارہے تھے، اور پھر آخر میں کچھ لوگ بالٹیاں، ڈونگے اور جگ لیے کھڑے تھے، اور ہر ایک اس انتظار میں تھا کہ پیر صاحب اس کے اندر تھوک دیں، تاکہ اس کی برکتیں اس کو حاصل ہو جائیں۔ یہ بات اس حد تک اس لئے پہنچی تھی کہ اس کے تعویذ گنڈے کارآمد ہوتے تھے۔

حاصلِ کلام

خدا کے لئے اس معاملے میں اپنے مزاج کے اندر اعتدال پیدا کریں۔ راستہ وہی ہے جو جناب رسول اللہ ﷺ نے اختیار فرمایا، یا آپ کے صحابہ کرام نے اختیار فرمایا۔ اور یہ بات خوب اچھی طرح یاد رکھیں کہ اصل چیز براہِ راست اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا اور مانگنا ہے کہ یا اللہ! میرا یہ کام کر دیجئے، اس سے بہتر کوئی تعویذ نہیں، اس سے بہتر کوئی کام نہیں۔ اور یہ جھاڑ پھونک اور یہ تعویذ کوئی عبادت نہیں، بلکہ علاج کا ایک طریقہ ہے، اس پر کوئی اجر و ثواب مرتب نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ اس کی اُجرت لینا، دینا بھی جائز ہے۔ اگر یہ عبادت ہوتی تو اس پر اُجرت لینا جائز نہ ہوتا، کیونکہ کسی عبادت پر اُجرت لینا جائز نہیں، مثلاً کوئی شخص تلاوت کرے، اور اس پر اُجرت لے تو یہ حرام ہے، لیکن تعویذ پر اُجرت لینا

جائز ہے۔ بہر حال، اگر واقعۃً ضرورت پیش آ جائے تو حدود و قیود میں رہ کر اس کو استعمال کر سکتے ہیں، لیکن اس کی حدود و قیود سے آگے بڑھنا، اور ہر وقت انہی تعویذ گنڈوں کی فکر میں رہنا یہ کوئی سنت کا طریقہ نہیں۔ اور حدیث شریف میں یہ جو فرمایا کہ وہ لوگ بلا حساب و کتاب کے جنت میں داخل ہوں گے جو جھاڑ پھونک نہیں کرتے اس حدیث کے ایک معنی تو میں نے بتا دیئے کہ اس سے زمانۂ جاہلیت میں کی جانے والی جھاڑ پھونک مراد ہے، اور بعض علماء نے فرمایا کہ ایک حدیث میں یہ اشارہ بھی موجود ہے کہ جو جائز جھاڑ پھونک ہے اس میں بھی غلو اور مبالغہ، اور اس میں زیادہ انہماک بھی پسندیدہ نہیں، بلکہ آدمی اصل بھروسہ اللہ تعالیٰ پر رکھے، اور جب ضرورت پیش آئے تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرے، یہی بہترین علاج ہے، اس کے نتیجے میں یہ بشارت بھی حاصل ہوگی، جو اس حدیث میں بیان کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو اس کا مصداق بنا دے، اور ہم سب کو اللہ تعالیٰ جنت میں بلاحساب داخلہ نصیب فرما دے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.



دنیا کی حقیقت ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

"أَمَّا بَعْدُ!

عَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ((إِنَّ الدُّنْيَا حُلْوَةٌ خَضِرَةٌ، وَإِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى مُسْتَخْلِفُكُمْ فِيْهَا فَيَنْظُرُ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ فَاتَّقُوا الدُّنْيَا وَاتَّقُوا النِّسَاءَ))(۱)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بیشک دنیا میٹھی اور سرسبز ہے، یعنی ایک انسان کو دنیا کی شان وشوکت، دنیا کی لذتیں، دنیا کی خواہشات بڑی خوشنما معلوم ہوتی ہیں، گویا کہ یہ دنیا خوشنما بھی ہے اور بظاہر خوش ذائقہ بھی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو تمہاری آزمائش کا ایک ذریعہ بنایا ہے، اور تم کو اس دنیا میں اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا ہے، تاکہ وہ یہ دیکھیں کہ تم اس دنیا میں کیسا عمل کرتے ہو، کیا دنیا کی یہ ظاہری خوبصورتی اور خوشنمائی تمہیں دھوکے میں ڈال دیتی ہے اور تم اس دنیا کے پیچھے لگ جاتے ہو یا تم اللہ اور اللہ کی پیدا کی ہوئی جنت اور آخرت کو یاد کرتے ہو اور اس کی تیاری کرتے ہو؟

لہٰذا تم دنیا سے بچو اور عورتوں سے بچو، اس لئے کہ عورت بھی مرد کے لئے دنیا کے فتنوں میں سے ایک فتنہ ہے، اگر انسان جائز طریقے کو چھوڑ کر ناجائز طریقے سے عورت سے لطف اندوز ہو، تو پھر یہ عورت دنیا کا دھوکہ اور فریب ہے۔

حقیقی زندگی

"عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ:

☆ اصلاحی خطبات (۱۲/۲۲۹۔۲۵۵)، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) صحیح مسلم، کتاب الرقاق، باب اکثر اهل الجنة الفقراء، رقم: ۲۷٤۲، سنن الترمذی، کتاب الفتن عن رسول الله صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، باب ماجاء ما أخبر النبي ...... الخ، رقم: ۲۱۱۷، سنن ابن ماجه، کتاب الجهاد، رقم: ۲۸٦٤

((اَللّٰھُمَّ لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشُ الْاٰخِرَۃِ))(۱)

’’حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضورِاقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کرتے ہوئے فرمایا کہ اے اللہ! حقیقی زندگی تو آخرت کی زندگی ہے‘‘

یعنی دنیا کی زندگی تو اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی، ہیچ در ہیچ ہے۔

قبر تک تین چیزیں جاتی ہیں

’’عَنْ أَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ((یَتْبَعُ الْمَیِّتَ ثَلَاثَۃٌ، أَھْلُہٗ وَمَالُہٗ وَعَمَلُہٗ، فَیَرْجِعُ اِثْنَانِ وَیَبْقٰی وَاحِدٌ یَرْجِعُ أَھْلُہٗ وَمَالُہٗ وَیَبْقٰی عَمَلُہٗ))(۲)

’’حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضورِاقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کسی شخص کا انتقال ہوجاتا ہے اور اس کا جنازہ قبرستان لے جایا جاتا ہے تو اس وقت میّت کے ساتھ تین چیزیں جاتی ہیں، ایک عزیز و اقارب جو اس شخص کو دفن کرنے کے لئے جاتے ہیں، دوسرا اس کا مال ساتھ جاتا ہے۔ (اس لئے کہ بعض جگہوں پر یہ رواج ہے کہ مرنے والے کا مال قبرستان تک ساتھ لے جاتے ہیں) اور تیسرا اس کا عمل ہے جو اس کے ساتھ جاتا ہے، پھر فرمایا کہ قبر تک اس کو پہنچانے کے بعد دو چیزیں تو واپس لوٹ آتی ہیں، ایک عزیز و اقارب اور دوسرے اس کا مال وغیرہ، اور تیسری چیز یعنی اس کا عمل، وہ اس کے ساتھ قبر میں جاتا ہے‘‘

مال اور عزیز و اقارب کام آنے والے نہیں

اس سے معلوم ہوا کہ میّت کے اہل و عیال اور عزیز و اقارب جن کو وہ اپنا محبوب سمجھتا تھا، جن

(۱) صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الخندق، رقم: ۲۷۴۱، صحیح مسلم، کتاب الجھاد والسیر، باب غزوۃ الأحزاب وھی الخندق، رقم:۳۳۶۶، سنن الترمذی، کتاب المناقب عن رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ، باب مناقب أبی موسی الأشعری، رقم:۳۷۹۱، مسند أحمد بن حنبل، رقم:۸۵۹۴

(۲) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب سکرات الموت، رقم:۶۰۳۳، صحیح مسلم ،کتاب الرقاق، باب، رقم: ۵۲۶۰، سنن الترمذی، کتاب الزھد عن رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ، باب باب ماجاء مثل ابن آدم وأھله وولده وماله وعمله،رقم:۲۳۰۱، سنن النسائی، کتاب الجنائز، باب النھی عن سب الأموات، رقم:۱۹۱۱

کو اپنا پیارا سمجھتا تھا، جن کے ساتھ محبتیں اور تعلقات تھے، جن کے بغیر ایک پل گزارنا مشکل معلوم ہوتا تھا، وہ سب اس کو قبر کے اندر کام آنے والے نہیں، اور وہ مال جس پر اس کو بڑا فخر اور ناز تھا کہ میرے پاس اتنا مال ہے، اتنا بینک بیلنس ہے، وہ بھی سب یہاں رہ جاتا ہے، وہ چیز جو اس کے ساتھ قبر کے اندر جاتی ہے وہ اس کا عمل ہے جو اس نے دنیا میں رہ کر کیا تھا، اس کے علاوہ کوئی چیز ساتھ جانے والی نہیں ہے۔

چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب کسی میّت کو دفن کرنے کے بعد اس کے عزیز و اقارب وہاں سے جانے لگتے ہیں تو ان کے جانے کے وقت میّت ان کے قدموں کی آواز سنتا ہے، اور یہ آواز اس کو یہ بتانے کے لئے سنائی جاتی ہے کہ جن لوگوں پر تم بھروسہ کیے ہوئے تھے، جن کے ساتھ تمہارے صبح و شام گزر رہے تھے، جن کی محبت پر تم نے بھروسہ کر رکھا تھا، وہ سب تمہیں اس گڑھے میں اُتار کر چلے گئے، حقیقت میں وہ تمہارا ساتھ دینے والے نہیں تھے، گویا کہ مال بھی ساتھ چھوڑ گیا اور عزیز و اقارب بھی ساتھ چھوڑ گئے، صرف ایک عمل ساتھ جارہا ہے، اب اگر نیک عمل ساتھ میں ہے تو اس صورت میں قبر کا وہ گڑھا اس نیک عمل کے نور کی وجہ سے منور ہو جاتا ہے، اس میں روشنی ہو جاتی ہے، اس میں وسعت ہو جاتی ہے، اور پھر وہ قبر کا گڑھا نہیں رہتا، بلکہ جنت کا ایک باغ بن جاتا ہے۔

قبر ـــ جنت کا باغ یا جہنم کا گڑھا

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب نیک عمل والا بندہ قبر میں رکھا جاتا ہے تو اس کو خطاب کر کے کہا جاتا ہے:

((نَمْ کَنَوْمَةِ الْعَرُوْسِ الَّذِیْ لَا یُوْقِظُهُ اِلَّا اَحَبُّ اَهْلِهِ اِلَیْهِ))(۱)

اب تمہارے لئے جنت کی کھڑکی کھول دی گئی ہے، اب جنت کی ہوائیں تمہارے پاس آئیں گی، تم اس طرح سو جاؤ جس طرح دلہن سوتی ہے اور اس دلہن کو سب سے زیادہ محبوب شخص بیدار کرتا ہے، اس کے علاوہ کوئی دوسرا بیدار نہیں کرتا۔ لہٰذا اگر عمل اچھا ہے تو وہ قبر کا گڑھا ابدی راحتوں کا پیش خیمہ بن جاتا ہے اور وہ جنت کا ایک باغ بن جاتا ہے۔ اور خدا نہ کرے اگر عمل خراب ہے تو پھر وہ جہنم کا گڑھا بن جاتا ہے، اس کے اندر عذاب ہے، اور عذاب اور تکلیفوں کا سلسلہ قبر کے اندر ہی شروع ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کی اس سے حفاظت فرمائے۔ اس لئے حضورِ اقدس ﷺ نے پناہ مانگی کہ اے اللہ! میں عذابِ قبر سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں۔

(۱) سنن الترمذی، کتاب الجنائز، باب ما جاء فی عذاب القبر، رقم: ۹۹۱

اس دنیا میں اپنا کوئی نہیں

لہٰذا اس حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ یہ حقیقت بیان فرما رہے ہیں کہ جب وہ وقت آئے گا اور لوگ قبر کے گڑھے میں تمہیں رکھ کر چلے جائیں گے، اس وقت تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اس دنیا میں اپنا کوئی نہیں، نہ عزیز و اقارب اور رشتہ دار اپنے ہیں اور نہ یہ مال اپنا ہے، لیکن اس وقت پتہ چلنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا، اس لئے کہ اگر اس وقت اپنی حالت بدلنا بھی چاہے گا اور اپنی اصلاح کرنا چاہے گا تو اس کا وقت گزر چکا ہوگا، بلکہ جب وہ وقت آ جائے گا تو پھر اس کو مہلت نہیں دی جائے گی، چنانچہ لوگ اپنا برا انجام دیکھ کر اللہ تعالیٰ سے عرض کریں گے کہ ایک مرتبہ ہمیں پھر دنیا میں بھیج دیجئے کہ وہاں جا کر خوب صدقہ خیرات کریں گے اور نیک عمل کریں گے، لیکن باری تعالیٰ فرمائیں گے کہ

﴿وَلَن يُؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفۡسًا إِذَا جَآءَ أَجَلُهَا﴾ (۱)

''جب موت کا وقت آ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کسی کو مؤخر نہیں کرتے''

موت کا وقت آ جانے کے بعد کسی نبی کو، کسی ولی کو، کسی صحابی کو اور کسی بھی بڑے سے بڑے آدمی کو مؤخر نہیں کیا جاتا۔ لہٰذا اس وقت اپنی اصلاح کا خیال آنے کا فائدہ کچھ نہیں ہے، اس لئے حضورِ اقدس ﷺ پہلے سے ہمیں باخبر کر رہے ہیں کہ اس وقت کے آنے سے پہلے یہ بات سوچ لو کہ اس وقت یہ سب تمہیں چھوڑ کر چلے جائیں گے، تم اکیلے رہ جاؤ گے اور صرف تمہارا عمل تمہارے ساتھ جائے گا۔

شکریہ اے قبر تک پہنچانے والو شکریہ
اب اکیلے ہی چلے جائیں گے اس منزل سے ہم

اس لئے حضورِ اقدس ﷺ فرما رہے ہیں کہ آج ہی سے اس بات کا استحضار کر لو، پھر تمہیں یہ نظر آئے گا کہ دنیا کی ساری لذتیں، منفعتیں، دنیا کے کاروبار، دنیا کی خواہشات ہیچ در ہیچ ہیں، اور اصل چیز وہ ہے جو آخرت کے لئے تیار کی گئی ہو۔

جہنم کا ایک غوطہ

"عَنۡ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ ((يُؤۡتٰى بِأَنۡعَمِ أَهۡلِ الدُّنۡيَا مِنۡ أَهۡلِ النَّارِ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ فَيُصۡبَغُ فِي النَّارِ صَبۡغَةً ثُمَّ يُقَالُ: يَا ابۡنَ آدَمَ هَلۡ رَأَيۡتَ خَيۡرًا قَطُّ هَلۡ مَرَّ بِكَ نَعِيۡمٌ قَطُّ فَيَقُوۡلُ: لَا وَاللّٰهِ يَا

(۱) المنافقون: ۱۱

رَبِّ! وَيُؤْتَى بِأَشَدِّ النَّاسِ بُؤْسًا فِي الدُّنْيَا مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ فَيُصْبَغُ صَبْغَةً فِي الْجَنَّةِ فَيُقَالُ لَهُ يَا ابْنَ آدَمَ: هَلْ رَأَيْتَ بُؤْسًا قَطُّ هَلْ مَرَّ بِكَ شِدَّةٌ قَطُّ فَيَقُولُ: لَا وَاللّٰهِ يَا رَبِّ! مَا مَرَّبِيْ بُؤْسٌ قَطُّ وَلَا رَأَيْتُ شِدَّةً قَطُّ)) (۱)

''حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ایک ایسے شخص کو بلائیں گے جس کی ساری زندگی نعمتوں میں گزری ہوگی، اور دنیا کے تمام انسانوں میں سب سے زیادہ جس کو دنیا کی نعمتیں میسر آئی ہوں گی، یعنی مال سب سے زیادہ، اہل وعیال زیادہ، نوکر چاکر، دوست احباب، کوٹھی بنگلے، اور دنیا کے اسبابِ عیش وعشرت سب سے زیادہ اس کو ملے ہوں گے، ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ بلائیں گے۔ اب آپ اندازہ لگائیں کہ جب سے یہ دنیا پیدا ہوئی، اس وقت سے لے کر قیامت کے دن تک جتنے انسان پیدا ہوئے، ان میں سے ایسے شخص کا انتخاب کیا جائے گا جو اس دنیا میں سب سے زیادہ مالدار، سب سے زیادہ خوشحال اور سب سے زیادہ خوش وخرم رہا ہوگا، اور اس کو جہنم کے اندر ایک غوطہ دیا جائے گا اور ملائکہ سے کہا جائے گا کہ اس کو جہنم کے اندر ایک غوطہ دلا کر لے آؤ، پھر اس شخص سے پوچھا جائے گا کہ اے ابن آدم! کیا تم نے کبھی کوئی راحت اور آرام اور خوشحالی دیکھی ہے؟ کیا تم پر کبھی کوئی نعمت گزری، یعنی مال و دولت، عیش و آرام کچھ ملا ہے؟ وہ شخص جواب میں کہے گا کہ اے پروردگار! میں نے کبھی راحت و آرام، عیش وعشرت، مال و دولت کی شکل تک نہیں دیکھی۔ وہ ساری عمر جو دنیا کے اندر نعمتوں میں، راحتوں میں، مال و دولت میں، عیش و آرام میں گزاری تھی، جہنم کے ایک غوطے سے وہ سب نعمتیں اور راحتیں بھول جائے گا، اس لئے کہ اس ایک غوطے میں اس کو اتنی اذیت، اتنی تکلیف اور اتنا عذاب اور اتنی پریشانی ہوگی کہ وہ اس کی وجہ سے دنیا کی نعمتیں بھول جائے گا۔

جنت کا ایک چکر

اس کے بعد ایک ایسے شخص کو بلایا جائے گا جو دنیا میں سب سے زیادہ تنگ دستی، پریشانی اور فقر وفاقے کا شکار رہا ہوگا، گویا کہ دنیا میں اس نے اس طرح زندگی گزاری ہوگی کہ کبھی راحت و آرام کی شکل ہی نہیں دیکھی ہوگی، اس کو بلا کر جنت کا ایک چکر لگوایا جائے گا اور فرشتوں سے کہا جائے گا کہ اس کو ذرا جنت میں سے ایک مرتبہ گزار کر لے آؤ اور پھر اس سے پوچھا جائے گا کہ اے آدم کے بیٹے! کیا کبھی تم نے فقر وفاقہ دیکھا؟ کیا کبھی تم پر سختی اور پریشانی کا زمانہ گزرا؟ وہ جواب میں کہے گا کہ خدا کی

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب صفات المنافقین، باب صبغ أنعم أهل الدنيا فی النار، رقم: ۵۰۲۱، مسند أحمد، رقم: ۱۲۶۳۸

قسم! میرے اُوپر تو کبھی کوئی سختی اور پریشانی کا زمانہ نہیں گزرا اور کبھی مجھ پر فقر و فاقہ نہیں گزرا۔ اس لئے کہ دنیا کی ساری زندگی جو مصیبت، پریشانی اور آلام میں گزاری تھی، جنت کا ایک چکر لگانے کے بعد وہ سب بھول جائے گا۔

دنیا بے حقیقت چیز ہے

یہ سب حضورِ اقدس ﷺ کی بتائی ہوی باتیں ہیں اور ان کے بتانے کا مقصد یہ ہے کہ یہ دنیا کی نعمتیں آخرت کے مقابلے میں اتنی بے حقیقت، اتنی ناپائیدار اور ہیچ در ہیچ ہیں کہ جہنم کی ذرا سی تکلیف کے سامنے دنیا کی ساری راحتیں انسان بھول جائے گا، اور ساری عمر کی تکلیفیں اور مصائب و آلام جنت کا ایک چکر لگانے کے بعد بھول جائے گا۔ یہ دنیا اتنی بے حقیقت چیز ہے، جس کی خاطر تم دن رات دوڑ دھوپ میں لگے ہوئے ہو، صبح سے لے کر شام تک، شام سے لے کر صبح تک ہر وقت دماغ پر یہی فکر مسلط ہے کہ کس طرح دنیا زیادہ سے زیادہ کمالوں؟ کس طرح پیسے جوڑلوں؟ کس طرح مکان بنالوں؟ کس طرح زیادہ سے زیادہ اسباب عیش و عشرت جمع کرلوں؟ دن رات بس اسی کی دوڑ دھوپ ہے، اس لئے حضورِ اقدس ﷺ فرمارہے ہیں کہ ذرا سوچ لو کہ کس چیز کی طلب میں تم لگے ہوئے ہو، اور اس کے مقابلے میں آخرت کی نعمتیں اور تکلیفیں بھولے ہوئے ہو۔ ''زہد'' اسی کا نام ہے کہ انسان دنیا کی حقیقت کو پہچان لے اور دنیا کے ساتھ وہی معاملہ کرے جس کی وہ مستحق ہے، اور آخرت کے ساتھ وہ معاملہ کرے جس کی وہ مستحق ہے۔

دنیا کی حیثیت ایک پانی کا قطرہ ہے

عَنِ الْمُسْتَوْرَدِ بْنِ شَدَّادٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((وَاللّٰهِ مَا الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا مِثْلُ مَا يَجْعَلُ أَحَدُكُمْ إِصْبَعَهُ فِي الْيَمِّ فَلْيَنْظُرْ بِمَ تَرْجِعُ))(۱)

''حضرت مستورد بن شداد رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آخرت کے مقابلے میں دنیا کی مثال ایسی ہے جیسے کہ تم میں سے کوئی شخص اپنی انگلی سمندر میں ڈالے اور پھر وہ انگلی نکال لے''

(۱) صحیح مسلم، کتاب الجنة، باب فناء الدنیا، رقم: ۵۱۰۱، سنن الترمذی، کتاب الزهد عن رسول الله صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، رقم: ۲۲۴۵، سنن ابن ماجه، کتاب الزهد، رقم: ۴۰۹۸، مسند أحمد، رقم: ۱۷۳۲۲

یعنی اس انگلی پر جتنا پانی لگا ہوا ہوگا، آخرت کے مقابلے میں دنیا کی اتنی بھی حیثیت نہیں، اس لئے کہ سمندر پھر بھی متناہی ہے، غیر متناہی نہیں ہے، اور آخرت کی نعمتیں غیر متناہی ہیں، لا فانی ہیں، کبھی ختم ہونے والی نہیں ہیں، اس لئے دنیا کی آخرت کے مقابلے میں وہ نسبت بھی نہیں ہے جو نسبت سمندر کو انگلی میں لگے ہوئے پانی سے ہوتی ہے، لیکن سمجھانے کے لئے فرمایا کہ دنیا بس اتنی ہے جتنا انگلی ڈبونے سے پانی لگ جاتا ہے، باقی آخرت ہے۔

اب عجیب بات یہ ہے کہ انسان صبح سے شام تک اس انگلی پر لگے ہوئے پانی کی فکر میں تو ہے اور اس سمندر کو بھولا ہوا ہے جس سمندر کے ساتھ مرنے کے بعد واسطہ پیش آنا ہے۔ اور خدا جانے اس کے ساتھ کب واسطہ پیش آجائے، آج پیش آجائے، کل پیش آجائے، کسی وقت کی گارنٹی نہیں، ہر لمحے پیش آسکتا ہے۔ اسی غفلت کے پردے کو اٹھانے کے لئے حضرات انبیاء علیہم السلام دنیا میں تشریف لائے کہ آنکھوں پر جو غفلت کا پردہ پڑا ہوا ہے اور اس کے نتیجے میں دن رات کی دوڑ دھوپ اس انگلی میں لگے ہوئے پانی پر لگی ہوئی ہے، اس سے توجہ ہٹا کر آخرت کے سمندر کی طرف توجہ لگائیں۔

دنیا ایک مردار بکری کے بچے کے مثل ہے

عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ بِالسُّوْقِ وَالنَّاسُ كَنَفَتَهُ فَمَرَّ بِجَدْيٍ أَسَكَّ مَيِّتٍ فَتَنَاوَلَهُ فَأَخَذَ بِأُذُنِهِ ثُمَّ قَالَ((أَيُّكُمْ يُحِبُّ أَنَّ هٰذَا لَهُ بِدِرْهَمٍ)) فَقَالُوْا: مَا نُحِبُّ أَنَّهُ لَنَا بِشَيْءٍ وَمَا نَصْنَعُ بِهِ؟ قَالَ((أَتُحِبُّوْنَ أَنَّهُ لَكُمْ؟)) قَالُوْا وَاللّٰهِ لَوْ كَانَ حَيًّا كَانَ عَيْبًا فِيْهِ لِأَنَّهُ أَسَكُّ فَكَيْفَ وَهُوَ مَيِّتٌ! فَقَالَ ((فَوَاللّٰهِ لَلدُّنْيَا أَهْوَنُ عَلَى اللّٰهِ مِنْ هٰذَا عَلَيْكُمْ))(۱)

"حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ایک بازار میں گزرے، اور آپ کے دونوں طرف لوگ چل رہے تھے، تو آپ بکری کے ایک مردار بچے کے پاس سے گزرے۔ وہ بکری کا بچہ بھی عیب دار تھا، یعنی چھوٹے کانوں والا تھا اور مردار بھی تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مردار بچے کو کان سے پکڑ کر اٹھایا اور پھر فرمایا:

"تم میں سے کون شخص بکری کے اس مردار بچے کو ایک درہم میں خریدنے کے لئے تیار ہے؟"

(۱) صحیح مسلم، كتاب الزهد، باب، رقم: ۵۲۵۷، سنن أبي داؤد، كتاب الطهارة، رقم: ۱۵۸، مسند أحمد، رقم: ۱۴۴۰۲

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ ایک درہم تو کیا، معمولی چیز کے بدلے میں بھی اس کو کوئی لینے کو تیار نہیں ہے، ہم اس کو لے کر کیا کریں گے؟ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ایک درہم میں نہ سہی، کیا تم میں سے کوئی اس کو مفت میں لینے کو تیار ہے؟''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ خدا کی قسم! اگر یہ بچہ زندہ بھی ہوتا تو بھی یہ عیب دار تھا، اس لئے کہ اس کے کان چھوٹے ہیں، تو جب زندہ لینے کے لئے کوئی تیار نہ ہوتا تو مردار لینے کو کون تیار ہوگا؟

اس کے بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تمہاری نظروں میں بکری کے اس مردار بچے کی لاش جتنی بے حقیقت اور ذلیل چیز ہے، اس سے زیادہ بے حقیقت اور ذلیل چیز یہ دنیا ہے جو تمہارے سامنے ہے۔ تم میں سے کوئی شخص بھی اس مردار بچے کو مفت میں لینے کو بھی تیار نہیں، اور وہ دنیا جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس سے زیادہ بے حقیقت اور ذلیل ہے، تم اس کے پیچھے دن رات پڑے ہوئے ہو''

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا یہ انداز تھا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جگہ جگہ اور قدم قدم پر اس دنیا کی بے ثباتی بتانے کے لئے آپ ایسی باتیں ارشاد فرماتے تھے۔

اُحد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کردوں

وَعَنْ أَبِیْ ذَرٍّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: کُنْتُ أَمْشِیْ مَعَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ حَرَّۃِ الْمَدِیْنَۃِ فَاسْتَقْبَلَنَا أُحُدٌ فَقَالَ ((یَا أَبَا ذَرٍّ!)) قُلْتُ: لَبَّیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! قَالَ ((مَا یَسُرُّنِیْ أَنَّ عِنْدِیْ مِثْلَ أُحُدٍ ھٰذَا ذَھَبًا تَمْضِیْ عَلَیَّ ثَلَاثَۃُ أَیَّامٍ وَعِنْدِیْ مِنْہُ دِیْنَارٌ إِلَّا شَیْئًا أَرْصُدُہٗ لِدَیْنٍ إِلَّا أَنْ أَقُوْلَ بِہٖ فِیْ عِبَادِ اللّٰہِ ھٰکَذَا وَھٰکَذَا وَھٰکَذَا عَنْ یَمِیْنِہٖ وَعَنْ شِمَالِہٖ وَمِنْ خَلْفِہٖ)) ثُمَّ مَشٰی فَقَالَ ((إِنَّ الْأَکْثَرِیْنَ ھُمُ الْأَقَلُّوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ إِلَّا مَنْ قَالَ ھٰکَذَا وَھٰکَذَا وَھٰکَذَا عَنْ یَمِیْنِہٖ وَعَنْ شِمَالِہٖ وَمِنْ خَلْفِہٖ وَقَلِیْلٌ مَا ھُمْ)) ثُمَّ قَالَ لِیْ مَکَانَکَ لَا تَبْرَحْ..................الخ[1]

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم: ما یسرنی أن عندی مثلا أحد، رقم:۵۹۶۳، صحیح مسلم، کتاب الایمان عن رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ، رقم:۲۵۶۸، مسند أحمد، رقم:۲۰۳۸۵

''حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ بھی درویش صحابی ہیں، فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ کے ''حرہ'' سے گزر رہا تھا، ''حرہ'' کالے پتھر والی زمین کو کہا جاتا ہے، جن حضرات کو مدینہ منورہ حاضری کا موقع ملا ہے، انہوں نے دیکھا ہوگا کہ مدینہ منورہ کے چاروں طرف کالے پتھروں والی زمین ہے، اس کو ''حرہ'' کہا جاتا ہے، راستے میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ چلتے چلتے ہمارے سامنے اُحد پہاڑ آ گیا اور وہ ہمیں نظر آنے لگا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''اے ابوذر!''

میں نے عرض کیا ''یارسول اللہ! میں حاضر ہوں، کیا بات ہے؟''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اے ابوذر! یہ تمہیں سامنے جو اُحد پہاڑ نظر آ رہا ہے، اگر یہ سارا پہاڑ سونے کا بنا کر مجھے دے دیا جائے، تب بھی مجھے یہ بات پسند نہیں ہے کہ تین دن مجھ پر اس حالت میں گذریں کہ اس میں سے ایک دینار بھی میرے پاس باقی رہے، ہاں اگر میرے اُوپر کسی کا قرضہ ہے تو صرف قرضہ اُتارنے کے لئے جتنے دینار کی ضرورت ہو وہ تو رکھ لوں، اس کے علاوہ ایک دینار بھی میں اپنے پاس رکھنے کے لئے تیار نہیں، اور وہ مال میں اس طرح اور اس طرح اور اس طرح مٹھیاں بھر بھر کے لوگوں میں تقسیم کر دوں''

وہ کم نصیب ہوں گے

پھر آگے فرمایا:

((اِنَّ الْاَكْثَرِيْنَ هُمُ الْاَقَلُّوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِلَّا مَنْ قَالَ هٰكَذَا وَهٰكَذَا وَهٰكَذَا عَنْ يَمِيْنِهٖ وَعَنْ شِمَالِهٖ وَمِنْ خَلْفِهٖ وَقَلِيْلٌ مَا هُمْ))

''یاد رکھو! دنیا میں جن کے پاس مال و دولت بہت زیادہ ہے، بڑے بڑے مالدار، بڑے بڑے سرمایہ دار، بڑے بڑے دولت مند، وہ قیامت کے دن بہت کم نصیب ہوں گے''

یعنی دنیا میں جتنی دولت زیادہ ہے، قیامت میں اس کے حساب سے آخرت کی نعمتوں میں ان کا حصہ دوسروں کے مقابلے میں کم ہوگا، سوائے ان دولت مندوں کے جو اپنی دولت کو اس طرح خرچ کریں اور اس طرح خرچ کریں اور اس طرح خرچ کریں، یعنی مٹھیاں بھر بھر کے اللہ کے راستے

میں خیرات کریں، لہٰذا جو ایسا کریں گے وہ تو محفوظ رہیں گے اور جو ایسا نہیں کریں گے، تو پھر یہ ہوگا کہ جتنی دولت زیادہ ہوگی، آخرت میں اتنا ہی کم حصہ ہوگا۔ اور پھر فرمایا کہ دنیا میں جن کے پاس دولت زیادہ ہے اور وہ دنیا میں خیرات وصدقات کر کے آخرت میں اپنا حصہ بڑھا لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے یہاں ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔

حضور ﷺ کا حکم نہ ٹوٹے

ساری باتیں راستے میں گزرتے ہوئے ہو رہی تھیں، پھر ایک جگہ پہنچ کر حضورِ اقدس ﷺ نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم اس جگہ ٹھہرو، میں ابھی آتا ہوں۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد رات کے اندھیرے میں حضورِ اقدس ﷺ کہیں تشریف لے گئے اور مجھے پتہ نہیں چلا کہ آپ کہاں تشریف لے گئے، یہاں تک کہ آپ نظروں سے اوجھل ہو گئے، اس کے بعد مجھے کوئی آواز سنائی دی، اس آواز کے نتیجے میں مجھے یہ خوف ہوا کہ کوئی دشمن حضورِ اقدس ﷺ کے سامنے آ گیا ہو اور اس کی یہ آواز ہو، اس لئے میں نے آپ ﷺ کے پاس جانے کا ارادہ کیا، لیکن مجھے یاد آیا کہ حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا تھا کہ اپنی جگہ سے مت ہلنا۔ یہ تھے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین، جب حضورِ اقدس ﷺ نے یہ فرما دیا کہ اپنی جگہ سے مت ہلنا اور یہیں رہنا، اس کے بعد آواز آنے کے نتیجے میں یہ خطرہ بھی ہوا کہ کہیں کوئی شخص حضورِ اقدس ﷺ کو نقصان نہ پہنچا دے، لیکن حضور ﷺ کا ارشاد یاد آ گیا کہ یہیں ٹھہرنا، کہیں مت جانا، اس لئے میں وہاں بیٹھا رہا۔

صاحبِ ایمان جنت میں ضرور جائے گا

تھوڑی دیر میں حضورِ اقدس ﷺ تشریف لے آئے تو میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے ایک آواز سنی تھی جس کی وجہ سے مجھے آپ کے اُوپر خطرہ ہونے لگا تھا۔ حضورِ اقدس ﷺ نے پوچھا کہ کیا تم نے وہ آواز سنی تھی؟ میں نے کہا: جی ہاں! میں نے وہ آواز سنی تھی۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ آواز درحقیقت حضرت جبرئیل علیہ السلام کی تھی، حضرت جبرئیل علیہ السلام میرے پاس تشریف لائے اور انہوں نے یہ خوشخبری سنائی کہ یا رسول اللہ! آپ کی اُمت میں سے جو شخص بھی اس حالت میں مر جائے کہ اس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا ہو، یعنی کفر کا کوئی کلمہ نہ کہا ہو، بلکہ توحید کی حالت میں مر گیا اور توحید پر ایمان رکھتے ہوئے دنیا سے گزر گیا تو وہ ضرور جنت میں جائے گا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی نہ کسی وقت ضرور جنت میں جائے گا۔ اگر برے اعمال کیے ہیں تو برے اعمال کی سزا پا کر جائے گا، لیکن جنت میں ضرور جائے گا۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے سوال کیا: یا رسول اللہ! کیا اگر چہ اس نے زنا کیا ہو اور چوری کی ہو، تب بھی وہ جنت میں جائے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا کہ چاہے اس نے زنا کیا ہو، اور چاہے اس نے چوری کی ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اگر چہ اس نے گناہوں کا ارتکاب کیا ہو، لیکن دل میں ایمان ہے تو آخر میں کسی نہ کسی وقت انشاء اللہ جنت میں پہنچ جائے گا، البتہ جن گناہوں کا ارتکاب کیا، جو بداعمالیاں کیں، ان کی سزا میں پہلے جہنم میں جائے گا اور اس کو گناہوں کی سزا دینے کے لئے جہنم میں رکھا جائے گا۔ اگر بدکاری کی تھی، چوری کی تھی، ڈاکے ڈالے تھے، غیبت کی تھی، جھوٹ بولا تھا، رشوت لی تھی، سود کھایا تھا، ان سب گناہوں کی سزا پہلے جہنم میں دی جائے گی پھر ایمان کی بدولت انشاء اللہ آخر میں کسی نہ کسی وقت جنت میں پہنچ جائے گا۔

گناہوں پر جرأت مت کرو

لیکن کوئی شخص یہ نہ سمجھے کہ چلو جنت کی خوشخبری مل گئی ہے کہ آخر میں تو جنت میں جانا ہی ہے، لہٰذا خوب گناہ کرتے جاؤ، اس میں کوئی حرج نہیں۔ خوب سن لیجئے! ابھی آپ پیچھے ایک حدیث سن آئے ہیں کہ دنیا کے اندر عیش و عشرت اور راحت و آرام میں زندگی گزارنے والے کو جہنم میں صرف ایک غوطہ دیا گیا تو اس ایک غوطے نے دنیا کی ساری خوشیاں اور سارے عیش و آرام کو بھلا دیا، ساری دنیا ہیچ معلوم ہونے لگی، ساری خوشیاں غارت ہوگئیں، اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ دنیا میں کوئی خوشی اور کوئی راحت حاصل نہیں کی۔ لہٰذا جہنم کے ایک غوطے کی بھی کسی کو سہار اور برداشت ہے؟ اس لئے یہ حدیث ہم لوگوں کو گناہوں پر جری نہ کرے کہ جنت میں جانا ہی ہے، اس لئے گناہ کرتے جاؤ۔ اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائے۔

دنیا میں مسافر کی طرح رہو

"عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: أَخَذَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَنْكِبِيْ فَقَالَ ((كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيْبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيْلٍ))"(۱)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ ایک دن حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھا، کندھوں پر ہاتھ رکھنا بڑی شفقت، بڑی محبت، بڑے پیار کا انداز ہے اور اس کے

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الرقاق، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم : كن في الدنيا كأنك غريب. رقم: ۵۹۳۷، سنن الترمذي، كتاب الزهد، رقم: ۲۲۵۵، سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، رقم: ٤١٠٤، مسند أحمد، رقم: ٤٥٣٤

بعد فرمایا:

''دنیا میں اس طرح رہو جیسے اجنبی ہو یا راستے کے راہی اور مسافر ہو''

یعنی جیسے مسافر سفر کے دوران کہیں کسی منزل پر ٹھہرا ہوا ہوتا ہے، تو وہ یہ نہیں کرتا کہ اس منزل ہی کی فکر میں لگ جائے اور جس مقصد کے لئے سفر کیا تھا، وہ مقصد بھول جائے ۔ فرض کیجئے کہ ایک شخص یہاں سے لاہور کسی کام کے لئے گیا، اب جس مقصد کے لئے لاہور آیا تھا، وہ کام تو بھول گیا اور اس فکر میں لگ گیا کہ یہاں اپنے لئے مکان بنالوں اور یہاں اسبابِ عیش وعشرت جمع کرلوں، اس شخص سے زیادہ احمق کون ہوگا۔

دنیا ایک ''خوبصورت جزیرے'' کے مانند ہے

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ ایک مثال بیان فرماتے ہیں کہ ایک جہاز کہیں جارہا تھا اور وہ پورا جہاز مسافروں سے بھرا ہوا تھا ۔ راستے میں ایک جزیرہ آیا تو جہاز کے کپتان نے اس جزیرہ پر جہاز کو روک دیا تاکہ آگے کے سفر کے لئے کچھ راشن اور ضرورت کا سامان لے لیا جائے ۔ اور اس کپتان نے اعلان کردیا کہ ہمیں چونکہ چند گھنٹوں کے لئے اس جزیرے پر ٹھہرنا ہے، لہٰذا اگر کوئی مسافر اس جزیرے پر اُترنا چاہے تو اُتر سکتا ہے، ہماری طرف سے اجازت ہے ۔ چنانچہ جہاز پر جتنے لوگ سوار تھے، سب کے سب اُتر کر جزیرے کی سیر کے لئے چلے گئے ۔ جزیرہ بڑا شاندار اور خوشنما تھا، اس میں بہت خوبصورت قدرتی مناظر تھے، چاروں طرف قدرتی مناظر کا حسن و جمال بکھرا ہوا تھا، لوگ ان خوبصورت مناظر سے بہت محظوظ ہوتے رہے، یہاں تک کہ جہاز کی روانگی کا وقت قریب آگیا تو کچھ لوگوں نے سوچا کہ اب واپس چلنا چاہئے، روانگی کا وقت آرہا ہے، چنانچہ وہ لوگ جہاز پر واپس آگئے اور جہاز کی عمدہ اور اعلیٰ اور آرام دہ جگہوں پر قبضہ کرکے بیٹھ گئے، دوسرے کچھ لوگوں نے سوچا کہ یہ جزیرہ تو بہت خوبصورت اور بہت خوشنما ہے، ہم تھوڑی دیر اور اس جزیرے میں رہیں گے اور لطف اندوز ہوں گے، چنانچہ تھوڑی دیر اور گھومنے کے بعد خیال آیا کہ کہیں جہاز روانہ نہ ہوجائے اور جہاز کی طرف دوڑے ہوئے آئے، یہاں آکر دیکھا کہ جہاز کی اچھی اور عمدہ جگہوں پر قبضہ ہوچکا ہے، چنانچہ ان کو بیٹھنے کے لئے خراب اور گھٹیا جگہیں مل گئیں اور وہ وہیں بیٹھ گئے اور یہ سوچا کہ کم از کم جہاز پر تو سوار ہوگئے ۔ کچھ لوگ اور تھے، انہوں نے سوچا کہ یہ جزیرہ تو بڑا شاندار ہے، یہاں تو بہت مزہ آرہا ہے، جہاز میں مزہ نہیں آرہا تھا، چنانچہ وہ اس جزیرے پر رک گئے اور ان خوبصورت قدرتی مناظر میں اتنے بدمست ہوئے کہ ان کو واپسی کا خیال بھی بھول گیا، اتنے میں جہاز روانہ ہوگیا اور وہ لوگ اس میں سوار نہ ہوسکے ۔ دن کے وقت تو وہ جزیرہ بہت خوشنما معلوم ہورہا تھا اور اس کے مناظر بہت حسین معلوم

ہو رہے تھے، لیکن جب شام کو سورج غروب ہو گیا اور رات سر پر آ گئی تو وہی خوبصورت جزیرہ رات کے وقت بھیانک بن گیا کہ اس خوبصورت جزیرے میں ایک لمحہ گزارنا مشکل ہو گیا، کہیں درندوں کا خوف، کہیں جانوروں کا خوف۔

اب بتایئے! وہ قوم جو جزیرے کے حسن و جمال میں اتنی محو ہو گئی کہ جو جہاز جا رہا تھا، اس کو چھوڑ دیا، وہ قوم کتنی احمق اور بے وقوف ہے۔

یہ مثال بیان کرنے کے بعد امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس دنیا کی مثال اس جزیرے جیسی ہے، لہٰذا اس دنیا میں دل لگا کر بیٹھ جانا اور اس کی خوشنمائیوں پر فریفتہ ہو جانا ایسا ہی ہے جیسے وہ قوم جو اس جزیرے کی خوشنمائیوں پر فریفتہ ہو گئی تھی، اور جس طرح اس جزیرے پر رہنے والوں کو ساری دنیا احمق اور بیوقوف کہے گی، اسی طرح اس دنیا پر دل لگانے والوں کو بھی دنیا احمق اور بیوقوف کہے گی۔

دنیا سفر کی ایک منزل ہے، گھر نہیں

اس لئے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا کہ دنیا میں اس طرح رہو جیسے ایک مسافر رہتا ہے اور جیسے ایک اجنبی آدمی رہتا ہے، اس لئے کہ یہ دنیا سفر کی ایک منزل ہے، خدا جانے اصل وطن کی طرف روانگی کا وقت کب آ جائے۔ ایک حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((اَلدُّنْیَا دَارُ مَنْ لَا دَارَ لَهٗ وَلَهَا یَجْمَعُ مَنْ لَا عَقْلَ لَهٗ))(۱)

"یہ دنیا اس شخص کا گھر ہے جس کا کوئی گھر نہ ہو، اور اس کے لئے وہ شخص جمع کرتا ہے جس کے پاس عقل نہ ہو"

یعنی کیا تم اس دنیا کو اپنا گھر سمجھتے ہو؟ حالانکہ یہ دیکھو کہ انسان کا اپنا گھر کونسا ہوتا ہے؟ انسان کا اپنا گھر وہ ہوتا ہے جس میں انسان کو مکمل اقتدار حاصل ہو، اس کے قبضے میں ہو، اس کی ملکیت میں ہو، جس وقت تک چاہے وہ اس میں رہے اور اس میں داخل ہونے سے کوئی نہ روک سکے، اور اس کو اس میں سے کوئی باہر نہ نکال سکے، وہ حقیقت میں اپنا گھر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کسی دوسرے شخص کے گھر میں داخل ہو کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ میرا گھر ہے، اس لئے کہ دوسرے کے گھر پر اقتدار حاصل نہیں، اور اپنا گھر وہ ہے جس پر اقتدار حاصل ہو۔

اب آپ سوچئے کہ اس دنیا کے گھر پر کس قسم کا اقتدار آپ کو حاصل ہے؟ آپ کے اقتدار کا یہ حال ہے کہ جس دن آنکھ بند ہوئی، اس دن سارے گھر والے مل کر آپ کو قبر کے گڑھے میں پھینک کر

(۱) مسند أحمد، حدیث السیدۃ عائشة، رقم: ۲۳۲۸۳

آ جائیں گے، اب اس گھر سے آپ کا کوئی تعلق نہیں، وہ گھر کسی بھی وقت آپ سے چھن جائے گا، اور یہ مال و دولت بھی کسی وقت آپ سے چھن جائے گا، لہٰذا جس گھر پر اتنا اقتدار بھی آپ کو حاصل نہیں، اس کو آپ اپنا گھر کیسے سمجھتے ہو؟ اس لئے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ دنیا اس شخص کا گھر ہے جس کو آخرت کا وہ گھر ملنے والا نہیں ہے جو ہمیشہ رہنے والا ہے، جس پر ہمیشہ قبضہ رہے گا، وہ گھر کبھی ہاتھ سے نکلنے والا نہیں، لہٰذا آخرت میں جس کا گھر نہ ہو، وہ اس دنیا کو اپنا گھر بنائے۔

دنیا کو دل و دماغ پر حاوی نہ ہونے دو

پھر آگے دوسرا جملہ ارشاد فرمایا کہ اس کے لئے وہ شخص مال و دولت جمع کرتا ہے جس کو عقل نہ ہو۔ ان احادیث سے درحقیقت یہ بتلانا مقصود ہے کہ اس میں ضرور رہو، لیکن اس کی حقیقت سمجھ کر رہو، اس کو اپنے دل اور خیالات پر حاوی نہ ہونے دو، بلکہ یہ سمجھو کہ یہ دنیا راستے کی ایک منزل ہے جیسے تیسے گزر ہی جائے گی، لیکن اصل فکر آخرت کی ہونی چاہئے، یہ نہ ہو کہ صبح سے لے کر شام تک اسی کی دھن اور دھیان ہے، اسی کی سوچ اور اسی کی فکر ہے، یہ مسلمان کا کام نہیں، مسلمان کا کام تو یہ ہے کہ بقدرِ ضرورت دنیا کو اختیار کرے اور زیادہ فکر آخرت کی کرے۔

دل میں دنیا ہونے کی ایک علامت

دل میں دنیا کی محبت ہے یا نہیں، اس کی پہچان اور علامت کیا ہے؟ اس کی پہچان یہ ہے کہ یہ دیکھو کہ صبح سے لے کر شام تک تمہاری فکر اور سوچ کیا رہتی ہے، کیا ہر وقت یہ فکر رہتی ہے کہ زیادہ پیسے کہاں سے کمالوں؟ مال کس طرح جمع کرلوں؟ یا اس کا خیال بھی آتا ہے کہ مجھے مرنا بھی ہے، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دینا ہے، اگر مرنے کا خیال اور آخرت کا خیال آتا ہے، پھر تو الحمد للہ، دنیا کی محبت کی مذمت جو قرآن و حدیث میں وارد ہوئی ہے، وہ آپ کے دل میں نہیں۔ ہاں! اگر صبح سے لے کر شام تک دل و دماغ پر یہی چھایا ہوا ہے کہ کس طرح دنیا جمع کرلوں تو پھر وہ آخرت کو بھولے ہوئے ہے اور دنیا کی محبت دل میں بیٹھی ہوئی ہے۔

ایک سبق آموز قصہ

حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''گلستان'' میں ایک قصہ لکھا ہے کہ میں ایک مرتبہ سفر کر رہا تھا۔ سفر کے دوران میں نے ایک تاجر کے گھر میں قیام کیا۔ اس تاجر نے ساری رات میرا دماغ چاٹا اور اپنی تجارت کے قصے مجھے سناتا رہا کہ فلاں جگہ میری یہ تجارت ہے، ہندوستان میں فلاں کاروبار

ہے، ایران میں فلاں چیز کا کاروبار ہے، خراسان میں فلاں چیز کا کاروبار ہے، وغیرہ وغیرہ۔ سارے قصے سنانے کے بعد آخر میں کہنے لگا کہ میری تمام آرزوئیں تو پوری ہوگئیں، میری تجارت پروان چڑھ گئی ہے، البتہ اب مجھے ایک آخری سفر تجارت کے لئے کرنے کا ارادہ ہے، آپ دعا کردیجئے کہ میرا وہ سفر کامیاب ہوجائے تو اس کے بعد قناعت کی زندگی اختیار کرلوں گا اور بقیہ زندگی دکان پر بیٹھ کر گزار لوں گا۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے پوچھا کہ وہ آخری سفر کہاں کا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میں یہاں سے فلاں سامان خرید کر چین جاؤں گا، وہاں اس کو فروخت کروں گا، پھر چین سے چینی شیشہ خرید کر روم لے جاکر فروخت کروں گا، اس لئے کہ چینی شیشہ روم میں اچھے داموں میں فروخت ہوتا ہے، پھر روم سے فلاں سامان لے کر اسکندریہ جاؤں گا اور وہاں اس کو فروخت کروں گا، پھر اسکندریہ سے قالین ہندوستان لے جاکر فروخت کروں گا، اور ہندوستان سے گلاس خرید کر حلب لے جاکر فروخت کروں گا، وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح اس نے ساری دنیا کے طویل سفر کا منصوبہ پیش کیا اور کہا کہ دعا کرو کہ میرا یہ منصوبہ کسی طرح پورا ہوجائے تو اس کے بعد بقیہ زندگی قناعت کے ساتھ اپنی دکان پر گزاردوں گا۔ یعنی یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی بقیہ زندگی دکان پر گزارے گا۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ سب کچھ سننے کے بعد میں نے اس سے کہا کہ۔

آں شنید استی کہ در صحرائے غور
بار سالارے بیفتاد از ستور
گفت چشم تنگِ دنیادار را
یا قناعت پُر کند یا خاکِ گور

میں نے اس سے کہا کہ تم نے یہ قصہ سنا ہے کہ غور کے صحراء میں ایک بہت بڑے سوداگر کا سامان اس کے خچر سے گرا ہوا پڑا تھا، اس کا خچر بھی مرا ہوا پڑا تھا اور خود وہ سوداگر بھی مرا ہوا پڑا تھا، اور وہ سامان اپنی زبانِ حال سے یہ کہہ رہا تھا کہ دنیادار کی تنگ نگاہ کو یا قناعت پُر کرسکتی ہے یا قبر کی مٹی پُر کرسکتی ہے، اس کی تنگ نگاہ کو تیسری کوئی چیز پُر نہیں کرسکتی۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب یہ دنیا انسان کے اُوپر مسلط ہوجاتی ہے تو اس کے دل میں دنیا کے سوا دوسرا خیال نہیں آتا۔ یہ ہے "حبِ دنیا" جس سے منع کیا گیا ہے۔ اگر یہ "حبِ دنیا" نہ ہو اور پھر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے مال دیدے اور اس مال کے ساتھ دل اٹکا ہوا نہ ہو اور وہ مال اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی میں رکاوٹ نہ بنے، بلکہ وہ مال اللہ تعالیٰ کے احکام بجالانے میں صرف ہو، تو پھر وہ مال دنیا نہیں ہے بلکہ وہ مال بھی آخرت کا سامان ہے۔ لیکن اگر اس مال کے ذریعہ آخرت

کے کاموں میں رکاوٹ پیدا ہوگئی تو وہ حبِ دنیا ہے جس سے روکا گیا ہے۔

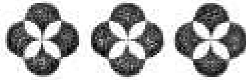
یہ ساری تفصیل کا خلاصہ ہے۔

دنیا کی محبت دل سے نکالنے کا طریقہ

البتہ "حبِ دنیا" کو دل سے نکالنے اور آخرت کی فکر دل میں پیدا کرنے کا راستہ یہ ہے کہ چوبیس گھنٹے میں سے تھوڑا سا وقت نکال کر اس بات کا مراقبہ کیا کرو۔ ہم لوگ غفلت میں دن رات گزار رہے ہیں، مرنے سے غافل ہیں، اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے سے غافل ہیں، حساب و کتاب سے غافل ہیں، جزا و سزا سے غافل ہیں، آخرت سے غافل ہیں، لہٰذا ہم لوگ ان چیزوں کا خیال بھی دل میں نہیں لاتے، اس لئے تھوڑا سا وقت نکال کر ہر شخص مراقبہ کیا کرے کہ ایک دن مروں گا، کس طرح اللہ تعالیٰ کے سامنے میری پیشی ہوگی؟ کیا سوال ہوں گے اور مجھے کیا جواب دینا ہوگا؟ ان سب باتوں کا استحضار کرے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی آدمی روزانہ ان باتوں کا مراقبہ کیا کرے تو چند ہی ہفتوں میں انشاء اللہ وہ یہ محسوس کرے گا کہ دنیا کی محبت دل سے نکل رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے مجھے اور آپ سب کو اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.



فکرِ آخرت ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

اَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى﴾ (۱)

حضرات علماء کرام، بزرگانِ محترم اور برادرانِ عزیز، وکارکنان مجلس صیانۃ المسلمین ساہیوال! یہ میرے لئے بہت عظیم سعادت کا موقع ہے کہ آج اپنے محترم بزرگوں کی زیارت اور صحبت سے استفادہ کا موقع اللہ تبارک وتعالیٰ نے عطا فرمایا۔

ہماری ایک بیماری

میں نے ایک آیت تلاوت کی جو سورۂ اعلیٰ کی آیت ہے اور قرآن کریم کا یہ اعجاز ہے کہ اس کی چھوٹی سے چھوٹی آیت لے لیجئے، وہ الفاظ کے اعتبار سے مختصر ہوگی، لیکن اگر اس کے معنی اور مفہوم کو دیکھا جائے اور اس کی گہرائی میں جایا جائے تو تنہا وہ چھوٹی سی آیت بھی انسان کی پوری زندگی کا دستور بن جاتی ہے۔ یہ چھوٹی سی آیت ہے، اس میں باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى﴾ (۲)

اس آیت میں اللہ جل جلالہ نے ہماری آپ کی ایک بنیادی بیماری کی تشخیص فرمائی ہے کہ تمہارے اندر یہ بیماری پائی جاتی ہے۔

اور وہ ایسی بیماری ہے کہ جو زندگی کے ہر شعبے میں ہمارے لئے تباہی اور ہلاکت لانے والی ہے۔ وہ بیماری بتائی اور پھر اس بیماری کا علاج بتایا۔ دو مختصر جملوں میں بیماری بھی بتادی، بیماری کا علاج بھی بتادیا، یہ بھی بتایا کہ تمہارے اندر کیا خرابی ہے، اور یہ بھی بتادیا کہ اس خرابی سے بچنے کا راستہ کیا ہے۔ فرمایا:

☆ اصلاحی خطبات (۹/ ۲۵۷۔۲۷۷)، بعد از نمازِ عشاء، ۱۴ مارچ ۱۹۸۸ء، جامع مسجد حقانیہ، ساہیوال، سرگودھا

(۱) الاعلیٰ: ۱۶۔۱۷ (۲) الاعلیٰ: ۱۶۔۱۷

﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا﴾ (۱)

تمہاری بنیادی خرابی یہ ہے کہ تم ہر معاملے میں اس دنیوی زندگی کو ترجیح دیتے ہو، دنیوی زندگی کے دائرے میں رہ کر سوچتے ہو، اسی کی بھلائی، اسی کی فلاح، اسی کی خوشحالی ہر وقت تمہارے پیش نظر رہتی ہے۔ اور اس دنیوی زندگی کو تم کس پر ترجیح دیتے ہو؟ مرنے کے بعد والی آخرت والی زندگی پر ــــ اس پر ترجیح دیتے ہو۔ یہ تو تمہاری بیماری ہے، اور اب بیماری کا علاج کیا ہے؟

اس بیماری کا علاج

علاج یہ ہے کہ ذرا یہ بات سوچو کہ یہ دنیا جس کی خاطر تم دوڑ دھوپ کر رہے ہو، تمہاری مسلسل جدوجہد، تمہاری دوڑ دھوپ، تمہاری شب و روز کی کوشش ساری اسی دنیا کی خوشحالی کے گرد گھوم رہی ہیں۔ تمہاری کوشش یہ ہے کہ میرا مکان اچھا بن جائے، مجھے پیسے مل جائیں، میری دنیا میں عزت ہو، لوگ میرا نام جانیں، لوگوں میں میری شہرت ہو جائے، مجھے بڑا منصب مل جائے، مجھے بڑا مرتبہ حاصل ہو جائے، تمہاری سوچ کا محور یہ دنیوی زندگی بنی ہوئی ہے۔

لیکن کیا کبھی تم نے یہ سوچا کہ جس کی خاطر یہ ساری دوڑ دھوپ کر رہے ہو، جس کی خاطر حلال و حرام ایک کر رکھا ہے، جس کی خاطر لڑائیاں مول لے رہے ہو، جس کی خاطر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن جاتے ہو، وہ کتنے دن کی زندگی ہے؟

اور اس کے بعد مرنے کے بعد جو زندگی آنے والی ہے وہ اس کے مقابلے میں کیسی خیر کی زندگی ہے اور یہاں کی زندگی کے مقابلے میں بہتر ہے، یہاں کی زندگی کے مقابلے میں کہیں زیادہ پائیدار اور غیر متناہی ہے۔

کوئی خوشی کامل نہیں

خوب سمجھ لیجئے دنیا کی کوئی خوشی کامل نہیں، ہر خوشی کے ساتھ غم کا کانٹا لگا ہوا ہے۔ کسی فکر کا کسی صدمے کا کسی تشویش کا کانٹا لگا ہوا ہے۔ کوئی خوشی کامل نہیں، کوئی لذت کامل نہیں۔ کھانا اچھا رکھا ہوا ہے، بھوک لگی ہوئی ہے، اس کے کھانے میں لذت آرہی ہے، لیکن کوئی فکر دماغ کے اوپر مسلط ہے اس کی وجہ سے سارا کھانا اکارت ہو رہا ہے، اس کی لذت مکدر ہو رہی ہے۔ دنیا کی کوئی خوشی ایسی نہیں ہے جو کامل ہو۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ مال و دولت جمع کرلوں گا تو اطمینان حاصل ہو جائے گا، سکون مل جائے گا،

(۱) الاعلیٰ: ۱۶

لیکن آپ ذرا بڑے بڑے سرمایہ داروں، بڑے بڑے مل کے مالکوں کی اندرونی زندگی میں جھانک کر دیکھئے، بظاہر یہ نظر آئے گا کہ یہ ملیں کھڑی ہوئی ہیں، عالیشان کاریں ہیں، شاندار بنگلے ہیں، حشم وخدم ہیں، نوکر چاکر ہیں، سارے اسباب راحت کے میسر ہیں۔ لیکن صاحب بہادر کو رات کے وقت نیند نہیں آتی۔ نیند لانے کے لئے گولیاں کھانی پڑتی ہیں۔ ڈاکٹر سے گولیاں لے لے کر کھا کھا کر نیند لاتے ہیں۔

آرام دہ بستر اور مسہریاں ہیں، ایئر کنڈیشنڈ کمرے ہیں، لیکن نیند نہیں آتی۔ اس کے مقابلے میں ایک مزدور ہے، ایک کسان ہے جس کے پاس یہ مسہری تو نہیں، یہ گدے اور یہ بستر ے تو نہیں، لیکن رات کے وقت میں تھک کر اپنے سر کے نیچے اپنا ہاتھ رکھ کر سوتا ہے، آٹھ گھنٹے کی بھر پور نیند لے کر اُٹھتا ہے۔ بتاؤ، رات اس سرمایہ دار کی اچھی گزری یا اس مزدور اور کسان کی اچھی گزری؟ تو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کا نظام ایسا بنایا ہے کہ اس کی کوئی خوشی کامل نہیں، کوئی لذت کامل نہیں، ہر خوشی کے ساتھ کوئی غم لگا ہوا ہے، اور ہر غم کے ساتھ کوئی خوشی لگی ہوئی ہے۔

تین عالم

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں تین عالم پیدا کیے ہیں۔ ایک عالم ہے جس میں خوشی ہی خوشی ہے، لذت ہی لذت ہے، مزہ ہی مزہ ہے، غم کا نام نہیں، صدمے کا گزر نہیں۔ وہ عالم ہے جنت، اس میں غم صدمے کا کوئی گزر نہیں، فکر وتشویش کا کوئی راستہ نہیں۔ ایک عالم اللہ نے وہ پیدا کیا ہے جو صدمے ہی کی جگہ ہے، اس میں غم ہی غم ہیں، تکلیف ہی تکلیف ہے، پریشانی ہی پریشانی ہے، صدمہ ہی صدمہ ہے، اس میں خوشی کا گزر نہیں، اس میں راحت کا گزر نہیں، وہ جہنم، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی رحمت سے اس سے محفوظ رکھے۔ آمین

تیسرا عالم پیدا کیا یہ دنیا، یہ غم اور خوشی سے ملی جلی ہے۔ اس میں غم بھی ہے، اس میں خوشی بھی ہے، اس میں لذت بھی ہے، اس میں راحت بھی ہے، اس میں تکلیف بھی ہے۔ یہ دنیا دونوں چیزوں سے ملی جلی ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ اس دنیا میں مجھے کوئی صدمہ نہ پہنچے، مجھے کوئی تکلیف نہ ہو، کوئی میری مرضی کے خلاف کام نہ ہو تو وہ دنیا کی حقیقت سے بے خبر ہے، اس دنیا میں یہ نہیں ہوسکتا۔ ارے اور تو اور اللہ کے محبوب ترین بندے یعنی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اس دنیا کے اندر تشریف لاتے ہیں تو ان کو بھی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ان کو بھی غم اُٹھانے پڑتے ہیں، ان کو بھی صدمے جھیلنے پڑتے ہیں۔

اگر اس دنیا میں کسی کو صرف راحت ملنی ہوتی، صرف خوشی ملنی ہوتی تو اللہ کے محبوب ترین

پیغمبروں سے زیادہ اس کا حقدار کوئی نہیں تھا۔ لیکن ان پر بھی صدمے آئے اور ان پر بھی تکلیفیں آئیں، بلکہ حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((أَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً اَلْاَنْبِيَاءُ ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ))(۱)

اس دنیا کے اندر سب سے زیادہ آزمائشیں انبیاء پر آتی ہیں، اس کے بعد جتنا جو قریب ہوتا ہے انبیاء سے، اتنی ہی آزمائشیں اس کے اُوپر آتی ہیں۔

میں عرض یہ کر رہا تھا کہ دنیا کی کوئی خوشی کامل نہیں، کوئی لذت کامل نہیں، کوئی راحت کامل نہیں اور جتنی بھی خوشی مل جائے پائیدار نہیں، اور کچھ پتہ نہیں کہ اگلے لمحے یہ خوشی حاصل رہے گی یا نہیں؟ ہوسکتا ہے کہ اگلے گھنٹے ختم ہو جائے، ہوسکتا ہے کل ختم ہو جائے، ہوسکتا ہے اگلے مہینے ختم ہو جائے، ہوسکتا ہے کہ ایک سال چل جائے اس کے بعد ختم۔ تو نہ خوشی کامل اور نہ غم کامل۔

آخرت کی خوشی کامل ہوگی

باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آخرت کی زندگی خیر ہے، خیر کے معنی کامل ہے۔ اس کی لذت بھی کامل، اس کی رحمت بھی کامل، اس کے اندر خوشی بھی کامل اور پائیدار بھی ہے۔ یعنی ختم ہونے والی نہیں، جو نعمت مل گئی وہ ہمیشہ کے لئے ملے گی۔

حدیث کا مضمون ہے یہاں دنیا میں آپ کو ایک کھانا اچھا لگ رہا ہے، دل چاہ رہا ہے کھائیں، ایک پلیٹ کھائی، دو پلیٹ کھائی ایک روٹی کھائی، آخر ایک حد ایسی آگئی کہ پیٹ بھر گیا، اب اگر کھانا بھی چاہیں تو کھا نہیں سکتے، اسی کھانے سے نفرت ہوگئی، وہی کھانا جس کی طرف دل لپک رہا تھا، جس کی طرف آدمی شوق سے بڑھ رہا تھا، چند لمحوں کے اندر اس سے نفرت ہوگئی، اب کھانے کو دل بھی نہیں چاہتا، کوئی انعام بھی دینا چاہے ہزار روپیہ بھی دینا چاہے کہ کھالو، نہیں کھائے گا۔ کیوں؟ اس پیٹ کی ایک حد تھی وہ حد آگئی، اس کے بعد اس میں گنجائش نہیں اور نہیں کھاتا۔ لیکن آخرت میں جو کھانا آئے گا یا جو بھی غذا ہوگی اس میں یہ مرحلہ نہیں آئے گا کہ صاحب اب پیٹ بھر گیا، دل تو چاہ رہا ہے، کھایا نہیں جاتا، یہ مرحلہ جنت میں نہیں۔ جو لذت وہ کامل ہے اس میں کوئی تکدر نہیں، تو باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آخرت بہتر بھی ہے اور پائیدار بھی ہے۔ دنیا بہتر بھی نہیں اور ناپائیدار بھی ہے۔ اس کے باوجود تمہارا یہ حال ہے کہ دنیوی زندگی ہی کو ترجیح دیتے ہو، شب و روز اس کی دوڑ دھوپ میں مگن ہو اور آخرت کا خیال نہیں کرتے۔

اس آیت میں اب ہم ذرا غور کریں تو یہ نظر آئے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں ہمارے سارے

(۱) کنز العمال، رقم: ۶۷۸۳

امراض ساری بیماریوں کی جڑ اور ان کا علاج بھی بتا دیا۔

موت یقینی ہے

اس دنیا کے اندر کوئی بات اتنی یقینی نہیں ہے اتنی متفق علیہ نہیں ہے کہ جتنی یہ بات یقینی اور متفق علیہ ہے کہ ہر انسان کو ایک دن مرنا ہے۔ کوئی بات اس سے زیادہ یقینی نہیں۔ یعنی یہ وہ بات ہے کہ جس کو مسلمان تو مسلمان کافر بھی مانتا ہے کہ ہاں! ایک دن وہ ضرور مرے گا۔ آج تک اس کائنات میں کوئی انسان ایسا پیدا نہیں ہوا جس نے یہ نظریہ پیش کیا ہو کہ انسان کو موت نہیں آئے گی۔ لوگوں نے خدا کا انکار کر دیا کہنے والوں نے کہہ دیا کہ خدا کو نہیں مانتے، لیکن موت سے انکار کرنے والا آج تک پیدا نہیں ہوا، بڑے سے بڑا دہریہ، بڑے سے بڑا ملحد، بڑے سے بڑا منکرِ خدا وہ بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے موت نہیں آئے گی، اور سب باتوں میں اختلاف، لیکن یہ بات ایسی ہے کہ اس پر سب متفق ہیں کہ موت آنی ہے، مرنا ہے۔ اس بات پر بھی سب متفق ہیں کہ مرنے کے دن کا پتہ نہیں کہ کب مریں گے۔ سائنس ترقی کر گئی، لوگ چاند پر پہنچ گئے، مریخ پر پہنچ گئے، کمپیوٹر ایجاد ہو گئے، مصنوعی آدمی ایجاد ہو گئے، سب کچھ ہو گیا۔ لیکن پوچھو ان سائنسدانوں سے کہ بتاؤ بھائی جو سامنے بیٹھا ہوا انسان ہے، اس کی موت کب آئے گی؟

ساری سائنس، سارے علوم وفنون یہاں آکر عاجز ہیں کوئی نہیں بتا سکتا کہ موت کب آئے گی لیکن عجیب معاملہ ہے کہ جتنی یہ بات یقینی ہے کہ مرنا ہے اور جتنا اس کا وقت غیر یقینی ہے اتنا ہی اس موت سے ہم اور آپ غافل ہیں۔

ذرا گریبان میں ہم سب منہ ڈال کر دیکھیں۔ صبح بیدار ہونے سے لے کر رات کو بستر پر جانے تک اس پورے وقت میں کیا کچھ سوچتے ہیں، کیا کیا خیالات آتے ہیں، دنیاداری کے، روزگار کے، محنت مزدوری کے، ملازمت کے، تجارت کے، زراعت کے، کاشتکاری کے، خدا جانے کیا کیا خیالات آتے ہیں۔ کیا کبھی خیال آتا ہے کہ ایک دن قبر میں جا کے سونا ہے؟ کبھی خیال آتا ہے کہ قبر میں جانے کے بعد کیا حالت پیش آنے والی ہے۔

حضرت بہلول کا واقعہ

ایک بزرگ گزرے ہیں ان کا نام تھا بہلول۔ ''بہلول مجذوب'' کہلاتے تھے۔ مجذوب قسم کے آدمی تھے۔ لیکن باتیں بڑی حکمت کی کیا کرتے تھے۔ اس واسطے ان کو لوگ بہلول دانا بھی کہتے ہیں، بہلول حکیم بھی، مجذوب بھی۔

ہارون رشید کے زمانے میں تھے اور ہارون رشید ان سے کبھی مذاق بھی کیا کرتا تھا، اور اعلان کر رکھا تھا کہ جب بہلول مجذوب میرے پاس آنا چاہیں تو کوئی ان کے لئے رکاوٹ نہ ہوا کرے، سیدھا میرے پاس پہنچ جائیں۔ایک دن ایسے ہی ہارون رشید کے پاس پہنچ گئے۔ ہارون رشید مذاق تو کرتے تھے، ہارون رشید کے ہاتھ میں چھڑی تھی، وہ چھڑی اُٹھا کر انہوں نے بہلول کو دی اور کہا: میاں بہلول یہ چھڑی میں تم کو امانت کے طور پر دیتا ہوں، ایسا کرنا کہ اس دنیا میں جو شخص تمہیں اپنے سے زیادہ بیوقوف ملے اس کو یہ چھڑی میری طرف سے ہدیہ دے دینا۔ اشارہ اس طرف تھا کہ تم سے زیادہ بیوقوف تو کوئی دنیا میں ہے ہی نہیں۔ تو اگر تمہیں اپنے سے زیادہ بیوقوف کوئی شخص ملے تو اس کو دیدینا۔ بہلول نے وہ چھڑی اُٹھا کر اپنے پاس رکھ لی۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ مہینے گزر گئے، سال گزر گئے۔ اتفاق سے ہارون رشید بیمار پڑ گئے۔ بیمار ایسے پڑے کہ بستر سے لگ گئے، نہ کہیں آنا، نہ کہیں جانا، حکیموں نے کہیں جانے آنے سے منع کر دیا۔

بہلول عیادت کے لئے ہارون رشید کے پاس پہنچے۔ جا کر کہا کہ امیر المؤمنین کیا حال ہے؟ کہا: بہلول! کیا حال سناؤں، بہت لمبا سفر درپیش ہے۔ کہاں کا سفر امیر المؤمنین؟ کہا کہ آخرت کا سفر۔ اچھا تو وہاں پر آپ نے کتنے لشکر بھیجے ہیں، کتنی چھولداریاں؟ کتنے خیمے؟ ہارون رشید نے کہا: بہلول تم بھی عجیب باتیں کرتے ہو، وہ سفر ایسا ہے کہ اس میں کوئی خیمہ نہیں جاتا، کوئی آدمی کوئی باڈی گارڈ کوئی لشکر ساتھ نہیں جاتا۔ اچھا جناب واپس کب آئیں گے؟ کہا کہ پھر تم نے ایسی بات شروع کر دی، وہ سفر آخرت کا سفر ہے، اس میں جانے کے بعد کوئی واپس نہیں آیا کرتا۔

اچھا اتنا بڑا سفر ہے کہ وہاں سے کوئی واپس بھی نہیں آتا اور کوئی آدمی بھی وہاں پہلے سے نہیں جا سکتا۔ کہا کہ ہاں بہلول! وہ ایسا ہی سفر ہے۔ کہا کہ امیر المؤمنین! پھر تو ایک امانت میرے پاس آپ کی بہت مدت سے رکھی ہوئی ہے جو آپ نے یہ کہہ کر دی تھی کہ اپنے سے زیادہ بیوقوف آدمی کو دے دینا، آج مجھے اس چھڑی کا مستحق آپ سے زیادہ کوئی نظر نہیں آتا۔ اس واسطے کہ میں دیکھتا تھا کہ جب آپ کو چھوٹا سا بھی سفر درپیش ہوتا جہاں سے جلدی واپسی ہوتی تو اس کے لئے آپ پہلے سے بہت سا لشکر بھیجا کرتے تھے۔ وہ آپ کا راستہ تیار کرتے تھے، منزلیں قائم کرتے تھے، لیکن اب آپ کا اتنا لمبا سفر ہو رہا ہے، اس کی کوئی تیاری بھی نہیں ہے اور جہاں سے واپس آنا بھی نہیں ہے، تو مجھے اپنے سے زیادہ بیوقوف صرف آپ ہی ملے ہیں، آپ کے علاوہ کوئی نہیں، یہ چھڑی آپ ہی کو مبارک ہو۔ ہارون رشید یہ بات سن کر رو پڑے، کہا کہ بہلول! ہم تمہیں دیوانہ سمجھا کرتے تھے، لیکن معلوم یہ ہوا کہ تم سے زیادہ حکیم کوئی نہیں۔

موت کو کثرت سے یاد کرو

واقعہ یہ ہے کہ اس دنیا میں ذرا سا کوئی معمول کے خلاف سفر درپیش آ جائے تو اس کی پہلے سے تیاریاں ہیں، اس کے تذکرے ہیں، اس کے لئے پہلے سے کیا کچھ منصوبے بنائے جاتے ہیں، لیکن جب آخرت کا سفر پیش آتا ہے اور وہ سفر بھی ایسا ہے بیٹھے بیٹھے پیش آ جاتا ہے۔ پہلے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب میرے بغیر اس دنیا کی گاڑی نہیں چل سکتی۔ میں نہیں ہوں گا تو بچوں کا کیا ہوگا؟ بیوی کا کیا ہوگا؟ اور کاروبار کا کیا ہوگا؟ وہ وقت آ رہا ہے لیکن ہم اور آپ اس کے بارے میں سوچنے کے لئے تیار نہیں۔ اپنے ہاتھوں سے جنازوں کو کندھے دیتے ہیں، اپنے ہاتھوں سے اپنے پیاروں کو قبر میں اُتارتے ہیں، اپنے ہاتھوں سے ان کو مٹی دے کر آتے ہیں۔ لیکن یہ سمجھ کر بیٹھ جاتے ہیں کہ ان کے ساتھ ہو گیا یہ واقعہ۔ ہمارا اس کے ساتھ کیا تعلق؟

سرکارِ دو عالم حضرت محمد ﷺ فرماتے ہیں:

''لذتوں کو ختم کرنے والی چیز یعنی موت کو کثرت سے یاد کیا کرو''(۱)

ذرا ہم اپنا جائزہ لیں کہ چوبیس گھنٹوں میں سے کتنا وقت ہم اس موت کو یاد کرنے میں صرف کرتے ہیں؟ بہرحال، اس حدیث کے ذریعہ حضورِ اقدس ﷺ نے بتلا دیا کہ تمہاری بنیادی بیماری یہ ہے کہ تم آخرت سے غافل ہو۔ آخرت اگر تمہارے پیشِ نظر ہو جائے، آخرت تمہاری آنکھوں کے سامنے آ جائے اور اس کی فکر تمہارے دل و دماغ پر سوار ہو جائے، تمہاری ساری زندگی کی مشکلات ختم ہو جائیں۔ سارے جرائم، ساری بدامنی، ساری بدعنوانیاں اس بنیاد پر ہیں کہ اسی دنیا کے گرد ہمارا دماغ چکر لگا رہا ہے، آخرت کی طرف نہیں دیکھتا، آخرت کو نہیں سوچتا۔ اس کا مال ہڑپ کر لوں، اس کا حق ضائع کر دوں، اس کا خون پی جاؤں۔ یہ سب اس لئے کرتا ہے تاکہ میری دنیا درست ہو جائے۔ مرنے کے بعد کیا ہوگا، اس کی کچھ فکر نہیں۔

اور یہ فکر سرورِ کونین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے پیدا کی، اور یہ جو کچھ آپ سیرت کے اندر امن و امان کے، سکون اور اطمینان کے واقعات پڑھتے ہیں، وہ درحقیقت اس فکرِ آخرت کا نمونہ ہیں، کہ دل و دماغ پر ہر وقت جنت کا خیال چھایا ہوا ہے کہ اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے، وہ جنت نظر آ رہی ہے اور اس جنت کے خیال میں، اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے پیش ہونے کے خیال میں انسان جو کام کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے والا کرتا ہے۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب صفة القیامة والرقائق والورع عن رسول الله صلی الله علیه وسلم، باب منه، رقم: ۲۳۸۴

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا واقعہ

ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ مدینہ منورہ کے باہر کسی علاقے میں گئے۔ ایک بکریوں کا چرواہا اُن کے پاس سے گزرا، جو روزے سے تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اس کی دیانت کو آزمانے کے لئے اس سے پوچھا کہ اگر تم بکریوں کے اس گلے میں سے ایک بکری ہمیں بیچ دو تو اس کی قیمت بھی تمہیں دیدیں گے، اور بکری کے گوشت میں سے اتنا گوشت بھی دیدیں گے جس پر تم افطار کرسکو۔ اس نے جواب میں کہا کہ یہ بکریاں میری نہیں ہیں، میرے آقا کی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اگر اس کی ایک بکری گم ہو جائے گی تو وہ کیا کرے گا؟ یہ سنتے ہی چرواہے نے پیٹھ پھیری اور آسمان کی طرف انگلی اُٹھا کر کہا: فأین اللہ؟ یعنی اللہ کہاں گیا؟ اور یہ کہہ کر روانہ ہوگیا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما چرواہے کے اس جملے کو دہراتے رہے۔ مدینہ منورہ پہنچے تو اس چرواہے کے آقا سے مل کر اس سے بکریاں بھی خرید لیں اور چرواہے کو بھی خرید لیا، پھر چرواہے کو آزاد کردیا، اور ساری بکریاں اس کو تحفے میں دیدیں۔[1]

یہ ہے وہ فکرِ آخرت کہ جنگل کی تنہائی میں بکریاں چراتے ہوئے چرواہے کے دماغ پر بھی یہ بات مسلط ہے کہ مجھے اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے، اور وہ زندگی بھی درست کرنی ہے۔ اگر غلط کام کرکے تھوڑے سے پیسے میرے ہاتھ آبھی گئے تو دنیا کا کچھ فائدہ شاید ہو جائے، لیکن آخرت میرے ہاتھ سے جاتی رہے گی۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا واقعہ

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ رات کے وقت لوگوں کے حالات دیکھنے کے لئے گشت کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ گشت کرتے ہوئے ایک گھر کے قریب سے گزرے۔ صبح کے جھٹ پٹے کا وقت تھا، اس گھر میں ایک ماں بیٹی آپس میں باتیں کررہی تھیں۔ ماں بیٹی سے کہہ رہی تھی کہ بیٹی! دودھ نکالنے کا وقت آگیا، دودھ نکالو اور ایسا کرنا کہ آج کل ہماری گائے دودھ کم دے رہی ہے، اس لئے دودھ میں پانی ملادینا تا کہ وہ زیادہ ہو جائے۔ بیٹی نے کہا کہ اماں جان! میں دودھ میں پانی ملا تو دوں، لیکن امیر المؤمنین کا یہ حکم آیا ہوا ہے کہ کوئی شخص دودھ میں پانی نہ ملائے۔

ماں نے کہا کہ بیٹی امیر المؤمنین کا حکم ضرور ہے، لیکن وہ یہاں کہاں پانی ملاتے ہوئے تجھے دیکھ رہے ہیں، وہ تو کہیں اپنے گھر میں سو رہے ہوں گے، اگر ملالے گی تو امیر المؤمنین کو پتہ بھی نہیں

---

(۱) أسد الغابة (۳/ ۲۲۸)

چلے گا۔ بیٹی نے کہا کہ اماں جان ٹھیک ہے، ہوسکتا ہے کہ امیر المؤمنین کو پتہ نہ چلے، لیکن امیر المؤمنین کا جو امیر ہے، وہ تو دیکھ رہا ہے، اور جب وہ دیکھ رہا ہے تو میں پھر یہ کام کیسے کر سکتی ہوں؟

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ باہر کھڑے ہوئے یہ گفتگو سن رہے ہیں اور واپس اپنے گھر جانے کے بعد صبح کے وقت اس لڑکی کے بارے میں معلوم کیا کہ یہ کون ہے؟ اس لڑکی کو بلایا اور اپنے صاحبزادے سے ان کا نکاح کر دیا اور انہیں کی نسل سے بعد میں امیر المؤمنین حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ عمر ثانی پیدا ہوئے۔

آخرت کی فکر

یہ ہے وہ ذہنیت کہ جو جانتی ہے کہ وَالْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی ،آخرت بہتر اور زیادہ پائیدار ہے، دل و دماغ پر جب یہ بات بیٹھ گئی تو پھر کوئی گناہ کوئی بدعنوانی کرنے کے لئے ہاتھ نہیں بڑھتا۔ ہر شخص اس کام کی طرف لپک رہا ہے جو جنت بنانے والا ہے اور اللہ کو خوش کرنے والا ہے اور اس کام سے رک رہا ہے جو اللہ کو ناراض کرنے والا ہے۔

یہ ہے درحقیقت اس آیت کا منشاء کہ اگر تم اپنی اس بیماری کو پہچان لو کہ تم ساری دوڑ دھوپ ساری فکر ساری سوچ دنیا کے لئے کر رہے ہو، کبھی بیٹھ کر یہ بھی سوچا کرو کہ اتنے آدمیوں کو میں نے مرتے ہوئے دیکھا ہے، قبر میں دفن ہوتے ہوئے دیکھا ہے، ایک دن میرے ساتھ بھی وہی معاملہ پیش آنے والا ہے، اور قبر کے اندر کیا ہونے والا ہے اس کی تفصیل سرکارِ دو عالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بتا گئے کہ قبر میں کیا ہوگا؟ قبر کے بعد کیا ہوگا؟ پورا قرآن کریم آخرت کے تذکرے سے بھرا ہوا ہے اور احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تفصیل سے بتا دیا کہ آخرت کے اندر کیا ہونے والا ہے، تاکہ آخرت کا خیال دلوں پر مسلط ہو جائے، آخرت کا خیال دلوں پر بیٹھ جائے۔ لیکن ہم اور آپ اپنے چوبیس گھنٹوں میں سے کوئی وقت اس کام کے لئے نہیں نکالتے کہ جس کے اندر ہم اور آپ اس بات کو سوچا کریں۔

یہ فکر کس طرح پیدا ہو؟

اب سوال یہ ہے کہ یہ دنیا کی زندگی کی فکر جو غالب آئی ہوئی ہے اس کو کیسے مغلوب کیا جائے؟ اور آخرت کی فکر کو غالب کیسے کیا جائے؟ کیسے یہ بات دل میں بیٹھے جو اس چرواہے کے دل میں بیٹھ گئی تھی؟ کیسے وہ بات دل میں بیٹھے جو اس نوجوان لڑکی کے دل میں بیٹھ گئی تھی کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے یہ بات کس طرح دل میں پیدا ہو؟

راستہ اس کا ایک ہی ہے وہ یہ کہ جس کو آخرت کی فکر ہو، جس کے دل میں اللہ کے سامنے

جوابدہی کا احساس ہو، اس کی صحبت اختیار کرلو، اس کے ساتھ رہو، اس کے پاس بیٹھو، اس کی باتیں سنو تو وہ آخرت کی فکر تمہارے دل میں بھی منتقل ہو جائے گی۔

یہ صحبت ہی وہ چیز ہے جس نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو بدل دیا۔ آخر یہ لوگ وہی تو تھے جو دنیا کی معمولی باتوں پر ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے، مرغی کے بچے کی خاطر چالیس سال جنگ جاری رہی۔ کنویں کی خاطر زمینوں کی خاطر معمولی معمولی بکریوں اور جانوروں کی خاطر ایک دوسرے کے گلے کاٹے جا رہے تھے، ایک دوسرے کی گردنیں اُتاری جا رہی تھیں، ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بنے ہوئے تھے، وہی لوگ تو تھے، لیکن جب سرکارِ دو عالم محمد مصطفیٰ ﷺ کی صحبت نصیب ہوگئی تو وہ ساری دنیا طلبی ایسی راکھ ہوئی کہ سارے گھربار مکہ مکرمہ میں چھوڑ کر دشمنوں کے حوالے کر کے صرف تن کے کپڑوں کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ طیبہ چلے آئے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی حالت

انصار مدینہ نے پیش کش کی کہ آپ ہمارے بھائی ہیں، لہٰذا ہماری زمینیں آدھی آپ لے لیں۔ آدھی ہم رکھ لیں، لیکن مہاجرین نے کہا کہ نہیں، ہم وہ زمینیں اس طرح لینے کے لئے تیار نہیں، البتہ آپ کی زمینوں میں محنت کریں گے، محنت کے بعد جو پیداوار ہوگی، وہ آپس میں تقسیم کرلیں گے ــــ بتایئے کہ ان کی وہ دنیا طلبی کہاں گئی؟

میدانِ جہاد میں جنگ ہو رہی ہے، موت آنکھوں کے سامنے ناچ رہی ہے، اس وقت کوئی حدیث سنا دیتا ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اللہ کے راستے میں شہید ہو تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو جنت کے اعلیٰ درجات عطا فرماتے ہیں۔ ایک صحابی نے پوچھا: کیا واقعی یہ بات رسول اللہ ﷺ سے تم نے سنی؟ کہا کہ ہاں میں نے سنی، میرے کانوں نے سنی، میرے دل نے یاد رکھا۔ ان صحابی نے کہا کہ اچھا بس اب تو میرے اُوپر جہاد سے علیحدگی حرام ہے۔ تلوار اُٹھائی اور دشمن کے نرغے کے اندر گھسے، تیر آکر سینے کے اُوپر لگا، سینے سے خون کا فوارہ ابلتا ہوا دیکھ کر جو الفاظ زبان سے جاری ہوتے ہیں وہ یہ کہ "فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ" رب کعبہ کی قسم آج میں کامیاب ہو گیا، آج منزل مل گئی۔ (۱)

یہ وہی دنیا کے طالب، وہی دنیا کے چاہنے والے، دنیا کے پیچھے دوڑنے والے تھے، لیکن نبی کریم سرورِ دو عالم محمد مصطفیٰ ﷺ کی صحبت سے آخرت دل و دماغ پر اس طرح چھا گئی۔

---

(۱) یہ جملہ حضرت عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ نے غزوۂ بئر معونہ میں شہادت سے پہلے کہا تھا۔ حیاۃ الصحابۃ (۳/۶۵۰)

جادوگروں کا مضبوط ایمان

قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب فرعون کو دعوت دی اور معجزہ دکھایا، عصا زمین پر ڈالا تو وہ سانپ بن گیا تو فرعون نے کہا کہ ان کے مقابلے کے لئے جادوگر لانے چاہئیں۔ سارے ملک سے جادوگر اکٹھے کرکے ان سے کہا کہ آج تمہارا مقابلہ ایک بڑے جادوگر سے ہے، اور آج تم ان کے اُوپر غالب آکر دکھاؤ، اپنے فن کا مظاہرہ کرو۔ جادوگر آئے، جو فرعون کے چہیتے جادوگر تھے۔ لیکن پہلے بھاؤ تاؤ طے کیا:

﴿قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ﴾ (۱)

پہلے یہ بتایئے فرعون صاحب کہ اگر ہم موسیٰ علیہ السلام پر غالب آگئے تو کچھ اُجرت بھی ملے گی یا نہیں ملے گی؟ کوئی انعام ملے گا کہ نہیں ملے گا؟

﴿قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ﴾ (۲)

ہاں ضرور انعام ملے گا اور نہ صرف انعام ملے گا بلکہ تمہیں ہمیشہ کے لئے اپنا مقرب بنالوں گا۔ جب مقابلہ کا وقت آیا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے جادوگر کھڑے ہوئے تو جادوگروں نے اپنی رسیاں ڈالیں، لاٹھیاں ڈالیں تو وہ سانپ بن کر چلنا شروع ہوگئیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی فرمائی اور فرمایا کہ اب تم اپنا عصا ڈالو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا ڈالا اور وہ عصا ایک اژدہا بن کر جتنے سانپ ان جادوگروں نے بنائے تھے ان سب کو ایک ایک کرکے نگلنا شروع کردیا۔ سارے سانپوں کو نگل گیا، جادوگر فن جانتے تھے۔ سمجھ گئے یہ جو کچھ دکھایا جارہا ہے یہ جادو نہیں ہے، اگر جادو ہوتا تو ہم غالب آجاتے، ہمارا جادو مغلوب ہوگیا اس لئے یہ جادو نہیں ہے۔

یہ جو بات کررہے ہیں کہ وہ اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے پیغمبر ہیں، وہ یقیناً اللہ کے پیغمبر ہیں۔ دل میں بات آگئی اور جب پیغمبر پر ایمان لے آئے، اور پیغمبر کے معجزہ کو آنکھوں سے دیکھ لیا اور پیغمبر کی ذرا سی دیر زیارت کرلی، صحبت اس کی حاصل ہوگئی، ایک دم سارے کے سارے جادوگر پکار اُٹھے:

﴿اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى﴾ (۳)

''ہم موسیٰ وہارون کے پروردگار پر ایمان لے آئے''

فرعون یہ سب نظارہ دیکھ رہا ہے، وہ کہتا ہے:

﴿اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ﴾ (۴)

---

(۱) الشعراء: ۴۱ (۲) الشعراء: ۴۲ (۳) طٰہٰ: ۷۰ (۴) طٰہٰ: ۷۱

ارے تم اس کے اوپر ایمان لے آئے، میں نے تمہیں اب تک ایمان لانے کی اجازت بھی نہیں دی، اجازت سے پہلے ایمان لے آئے، اور ساتھ میں پھر سزا کی دھمکی بھی دی کہ یاد رکھو کہ اگر تم اس پر ایمان لائے تو تمہارا حشر یہ ہوگا:

﴿لَأُ قَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَأُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى﴾ (۱)

میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ دوں گا، اور تمہیں کھجور کے شہتیر میں سولی پر چڑھاؤں گا اور تب پتہ چلے گا کہ کس کا عذاب زیادہ سخت ہے' یہ دھمکی دے رہا ہے فرعون۔ اب آپ ذرا غور فرمایئے کہ وہی جادوگر جو ابھی تھوڑی دیر پہلے بھاؤ تاؤ کر رہے تھے کہ کیا ہمیں اجرت بھی ملے گی؟ وہی جادوگر جو فرعون کی طلبی پر موسیٰ علیہ السلام کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے تھے، اب نہ صرف یہ کہ وہ اجرت کی طلب باقی نہ رہی، بلکہ اب پھانسی کا تختہ سامنے لٹکا ہوا نظر آرہا ہے، فرعون کہہ رہا ہے میں اس پر چڑھادوں گا، ہاتھ پاؤں کاٹ دوں گا، لیکن اس سب کے باوجود ان کی زبان سے نکلتا ہے:

﴿قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ﴾ (۲)

اے فرعون! خوب سمجھ لو کہ ہم تمہیں اور تمہارے مال و دولت کو تمہاری سلطنت کو اس معجزے پر ترجیح نہیں دیں گے جو اللہ نے ہمیں کھلی آنکھوں سے دکھادیا۔ جو تجھے کرنا ہو کر گزر۔ کیوں؟ اس واسطے کہ جو کچھ فیصلہ تو کرے گا وہ اسی دنیوی زندگی کا فیصلہ ہوگا، تو ہمارے ہاتھ کاٹے یا پاؤں کاٹے، سولی پر چڑھائے، یا پھانسی چڑھائے، یہ دنیا کا فیصلہ ہوگا، اور ہم نے جو منظر دیکھا ہے وہ آخرت کا منظر ہے، وہ ابدی زندگی کا منظر ہے۔ دیکھئے! ایک لمحے پہلے تو اُجرت مانگ رہے تھے کہ پیسے لاؤ اور اب ایک لمحے کے بعد یہ حالت ہوگئی کہ سولی پر چڑھنے کے لئے تیار ہوگئے، یہ کایا کس نے پلٹی؟ یہ ایمان کے ساتھ جب صحبت نصیب ہوئی، اس نے یہ کایا پلٹ دی۔

صحبت کا فائدہ

بہرحال، ایمان کے ساتھ، اعتقاد کے ساتھ جب صحبت ہوتی ہے تو وہ دلوں کے اندر یہ جذبے پیدا کیا کرتی ہے، پھر دنیا طلبی مٹتی ہے، آخرت کی فکر غالب آجاتی ہے اور جب یہ غالب آجائے تو اس وقت انسان انسان بنتا ہے۔ جب تک اس کے دل و دماغ پر دنیا مسلط ہے وہ انسان نہیں، درندہ ہے۔ اس واسطے کہ وہ تو چاہتا ہے کہ دنیا کے اندر مجھے خوشحالی مل جائے، خواہ کسی کی گردن پھلانگ کر ہو،

(۱) طٰہٰ: ۷۱ (۲) طٰہٰ: ۷۲

کسی کی لاش پر کھڑے ہو کر ہو، اور کسی کی گردن کاٹ کر ہو، لیکن مجھے کسی طریقہ سے دنیا کا فائدہ حاصل ہو جائے، وہ درندہ بن جاتا ہے۔ انسان بننے کا راستہ سوائے اس کے نہیں کہ آدمی مرنے کے بعد کی بات کو سوچے۔ آخرت کی بات کو سوچے اور یہ صرف اور صرف آخرت کی فکر رکھنے والوں کی صحبت سے نصیب ہوتی ہے۔

درحقیقت اس دین کو حاصل کرنے کا اور اپنی زندگیوں میں اس کو رچانے کا واحد راستہ یہ ہے کہ اللہ والوں کی صحبت اُٹھائی جائے۔ اللہ والا اسی کو کہتے ہیں جو آخرت کی فکر رکھتا ہو۔ اس کی صحبت میں آدمی بیٹھے گا تو اس کو آخرت کی فکر حاصل ہوگی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی رحمت سے اپنے فضل وکرم سے ہمارے دلوں میں یہ جذبہ پیدا فرمائے تو ساری مشکلات حل ہو جائیں۔

آج کی دنیا کا حال

آج ہمارے اُوپر مسائل ومشکلات کا طوفان چاروں طرف مسلط ہے۔ اس کو حل کرنے کے لئے محکمے ہیں پولیس ہے، عدالتیں ہیں، لیکن سرکاری دفتروں میں رشوت بہت لی جاتی ہے۔ اچھا بھائی اس کا یہ علاج کیا جائے کہ محکمہ انسدادِ رشوت ستانی بناؤ۔ چنانچہ اب محکمہ انسدادِ رشوت ستانی بن گیا۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا کہ رشوت پہلے پانچ روپے ہوتی تھی، اب دس روپے ہوگئی۔ اور رشوت میں اب دو حصے لگ گئے۔ ایک حصہ سرکاری افسر کا، اور ایک محکمہ انسدادِ رشوت ستانی کے افسر کا بھی حصہ لگ گیا۔ اب انسدادِ رشوت ستانی کے اُوپر ایک اور نگران بٹھا دو، اس نگران پر ایک اور نگران بٹھا دو اور چلتے چلے جاؤ، رشوت کا ریٹ بڑھتا چلا جائے گا لیکن رشوت نہیں بند ہوگی۔ کیوں؟ اس واسطے کہ جس کو بھی بٹھا رہے ہو، اس کے سامنے بس یہ دنیا چکر لگا رہی ہے، اس کے سامنے صرف یہ ہے کہ کسی طرح دوسرے کے بنگلے سے میرا اچھا بنگلہ بن جائے۔ دوسرے کی کار سے میری کار اچھی ہو جائے۔ دوسروں کے کپڑوں سے میرے کپڑے اچھے ہو جائیں۔ اس کے دل ودماغ پر ہر وقت یہ بھوت چھایا ہوا ہے۔ اب چاہے کتنے محکمے بٹھاتے چلے جاؤ، عدالتیں لگاتے چلے جاؤ، قانون بناتے چلے جاؤ، قانون بھی دو دو روپے میں بکتا ہے۔ میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ اگر خدا کا خوف نہیں، اگر آخرت کی فکر نہیں، اللہ کے سامنے جوابدہی کے احساس نہیں، تو پھر ہزار قانون بنالو، ہزار محکمے بٹھا دو، ہزار پولیس والے بٹھا دو، لیکن خدا کے خوف کے بغیر سب بیکار۔

یہ امریکہ دنیا کے اندر سب سے مہذب ترین ملک کہلانے والا، بچہ بچہ تعلیم یافتہ، سو فیصد تعلیم، دولت کی ریل پیل، سائنس وٹیکنالوجی اور دنیا بھر کے تمام علوم وفنون کا مرکز، پولیس ہر وقت چوکس اور فعال، کوئی رشوت نہیں کھاتا، پولیس والے کو رشوت دے کر باز نہیں رکھا جاسکتا، پولیس تین منٹ کے

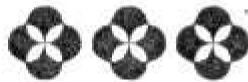
نوٹس پر پہنچ جاتی ہے، لیکن وہاں کا یہ حال ہے کہ مجھے نصیحت کرنے والوں نے یہ نصیحت کی کہ برائے کرم جب آپ اپنے ہوٹل سے باہر نکلیں تو بہتر یہ ہے کہ گھڑی ہاتھ پر نہ باندھیں اور آپ کی جیب کے اندر پیسے بھی نہ ہوں، تھوڑے بہت جو ضرورت کے ہوں رکھ لیجئے۔ کیونکہ خطرہ ہے کہ کسی وقت بھی کوئی آدمی گھڑی چھین کر لے جائے گا، کوئی آدمی آپ کی جیب سے پیسے نکال کر لے جائے گا، اور اس کی خاطر آپ کا خون تک کر دے گا۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے، اور قانون بیٹھا تماشہ دیکھ رہا ہے۔ پولیس تین منٹ کے نوٹس پر پہنچنے والی بے بس ہے۔ محکمے، عدالتیں سب اپنی جگہ پر کھڑی ہوئی ہیں، ایک طرف چاند پر جھنڈے گاڑ رہا ہے، اور امریکہ کا صدر یہ بیان دے رہا ہے کہ آج ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ جرائم پر کیسے قابو پائیں؟ وہ جو اقبال مرحوم نے کہا تھا کہ۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

دنیا یہ منظر دیکھ رہی ہے اور دیکھتی رہے گی، اور جب تک سرکارِ دو عالم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے قدموں پر سر نہیں رکھے گی، اور جب تک آپ کی رہنمائی میں آخرت کی فکر دل و دماغ پر مسلط نہیں ہوگی، اس وقت تک یہ منظر نظر آتے رہیں گے۔ ہزار قانون بناتے رہو، ہزار محکمے بٹھاتے رہو، تمہارے مسائل کا حل کبھی نہیں نکلے گا۔ مسائل کے حل کا راستہ یہ ہے کہ اللہ والوں کی صحبت اختیار کریں، ان کے پاس بیٹھیں، ان کی بات سنیں، آخرت کے حالات معلوم کریں۔

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمیں اس کی حقیقت سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آخرت کی فکر ہمارے دلوں کے اُوپر غالب فرمائے اور دنیا طلبی کی دوڑ جس کے اندر ہم مبتلا ہو گئے ہیں، اللہ تعالیٰ اس سے ہمیں بچائے اور اہل اللہ کی صحبت نصیب فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.



مرنے سے پہلے موت کی تیاری کیجئے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

اَمَّا بَعْدُ!

قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا وَحَاسِبُوْا قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا)) (۱)

یہ ایک حدیث ہے جس کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ مرنے سے پہلے مرو، اور قیامت کے روز جو حساب و کتاب ہونا ہے اس سے پہلے اپنا حساب اور اپنا جائزہ لو۔

موت یقینی چیز ہے

موت ضرور آنے والی ہے۔ اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ اور موت کے مسئلہ میں آج تک کسی کا اختلاف نہیں ہوا اور نہ کسی نے اس کے آنے کا انکار کیا۔ انکار کرنے والوں نے نعوذ باللہ خدا کا انکار کر دیا کہ ہم اللہ کو نہیں مانتے، رسولوں کا انکار کر دیا، مگر موت کا انکار نہیں کر سکے۔ ہر شخص یہ بات مانتا ہے کہ جو شخص اس دنیا میں آیا ہے، وہ ایک نہ ایک دن ضرور موت کے منہ میں جائے گا۔ اور اس بات پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ موت کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ابھی موت آجائے۔ ایک منٹ کے بعد آجائے۔ ایک گھنٹہ کے بعد آجائے۔ ایک دن کے بعد آجائے۔ ایک ہفتہ کے بعد آجائے۔ ایک ماہ بعد آجائے۔ یا ایک سال کے بعد آجائے۔ کچھ پتہ نہیں۔ آج سائنس کی تحقیقات کہاں سے کہاں بامِ عروج تک پہنچ گئیں۔ لیکن سائنس یہ نہیں بتا سکتی کہ کونسا انسان کب مرے گا۔

موت سے پہلے مرنے کا مطلب

لہٰذا یہ یقینی بات ہے کہ موت ضرور آئے گی۔ اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ موت کا وقت متعین

☆ اصلاحی خطبات (۷/۲۶۹-۲۹۰)، ۳۱ مئی ۱۹۹۶ء، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) کشف الخفاء، ۲/۴۰۲

نہیں ۔ اب اگر انسان غفلت کی حالت میں دنیا سے چلا جائے تو وہاں پہنچ کر خدا جانے کیا حالات پیش آئیں ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہاں پہنچ کر اللہ کے غضب اور اس کے عذاب کا سامنا کرنا پڑے ۔ اس لئے حضور اقدس ﷺ فرما رہے ہیں کہ اس حقیقی موت کے آنے سے پہلے مرو ۔ کس طرح مرو؟ موت سے پہلے مرنے کا کیا مطلب؟ علماء کرام نے اس کے دو مطلب بیان فرمائے ہیں ۔ ایک مطلب یہ ہے کہ حقیقی موت کے آنے سے پہلے تم اپنی وہ نفسانی خواہشات جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے معارض اور مقابل ہیں اور تمہارے دل میں گناہ کرنے کے اور ناجائز کام کرنے کے اور اللہ تعالیٰ کی معصیت اور نافرمانی کرنے کے جو داعیے اور تقاضے دل میں پیدا ہوتے رہتے ہیں، ان کو کچل دو اور فنا کردو اور ماردو ۔

ایک دن مرنا ہے، آخر موت ہے

دوسرا مطلب علماء نے یہ بتایا کہ مرنے سے پہلے اپنے مرنے کا دھیان کرلو ۔ کبھی کبھی یہ سوچا کرو کہ ایک دن مجھے اس دنیا سے جانا ہے ۔ اور اس دنیا سے خالی ہاتھ جاؤں گا ۔ نہ پیسے ساتھ جائیں گے، نہ اولاد ساتھ جائے گی، نہ کوٹھی بنگلے ساتھ جائیں گے، نہ دوست احباب ساتھ جائیں گے، بلکہ اکیلا خالی ہاتھ جاؤں گا، اس کو ذرا سوچا کرو ۔ واقعہ یہ ہے کہ اس دنیا میں ہم سے جو ظلم، نافرمانیاں اور جرائم اور گناہ ہوتے ہیں، ان کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ انسان نے اپنی موت کو بھلا دیا ہے ۔ جب تک جسم میں صحت اور قوت ہے، اور یہ ہاتھ پاؤں چل رہے ہیں، اس وقت تک انسان یہ سوچتا ہے کہ "ہم چوں ما دیگرے نیست" یعنی ہم سے بڑا کوئی نہیں ۔ اور زمین و آسمان کے قلابے ملاتا ہے ۔ اس وقت تکبر بھی کرتا ہے، شیخی بھگارتا ہے، دوسروں پر ظلم بھی کرتا ہے، دوسروں کے حقوق پر ڈاکے بھی ڈالتا ہے، صحت اور جوانی کی حالت میں یہ سب کام کرتا رہتا ہے، اور یہ دھیان اور خیال بھی نہیں آتا کہ ایک دن مجھے بھی اس دنیا سے جانا ہے ۔ اپنے ہاتھوں سے اپنے پیاروں کو مٹی دے کر آتا ہے، اپنے پیاروں کا جنازہ اُٹھاتا ہے، لیکن اس کے باوجود یہ سوچتا ہے کہ موت کا واقعہ اس کے ساتھ پیش آیا ہے، میرے ساتھ تو پیش نہیں آیا ۔ اس طرح غفلت کے عالم میں زندگی گزارتا ہے، اور موت کی تیاری نہیں کرتا ۔

دو عظیم نعمتیں اور ان سے غفلت

ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے کتنا خوبصورت جملہ ارشاد فرمایا:

((نِعْمَتَانِ مَغْبُوْنٌ فِيْهِمَا كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ الصِّحَّةُ وَالْفَرَاغُ)) (۱)

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقائق، باب لا عیش الا عیش الآخرة، رقم: ۵۹۳۳، سنن الترمذی، کتاب الزهد عن رسول الله صلی الله علیه وسلم، باب الصحة (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

''اللہ تعالیٰ کی دو نعمتیں ایسی ہیں جس کی طرف سے بہت سے انسان دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں، ایک صحت کی نعمت اور ایک فراغت کی نعمت''

یعنی جب تک ''صحت'' کی نعمت حاصل ہے اس وقت تک اس دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں کہ یہ صحت کی نعمت ہمیشہ باقی رہے گی۔ اور صحت کی حالت میں اچھے اور نیک کاموں کو ٹلاتے رہتے ہیں کہ چلو یہ کام کل کرلیں گے، کل نہیں تو پرسوں کرلیں گے، لیکن ایک زمانہ ایسا آتا ہے کہ صحت کا وقت گزر جاتا ہے۔

دوسری نعمت ہے ''فراغت'' یعنی اس وقت اچھے کام کرنے کی فرصت ہے، وقت ملتا ہے، لیکن انسان اچھے کام کو یہ سوچ کر ٹال دیتا ہے کہ ابھی تو وقت ہے، بعد میں کرلیں گے۔ ابھی تو جوانی ہے، اور وہ اس جوانی کے عالم میں بڑے بڑے پہاڑ ڈھوسکتا ہے، بڑے سے بڑے مشقت کے کام انجام دے سکتا ہے، اگر چاہے تو جوانی کے عالم میں خوب عبادت کرسکتا ہے، ریاضتیں اور مجاہدات کرسکتا ہے، خدمت خلق کرسکتا ہے، اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے اپنے نامۂ اعمال میں نیکیوں کا ڈھیر لگا سکتا ہے۔ لیکن دماغ میں یہ بات بیٹھی ہے کہ ابھی تو میں جوان ہوں، ذرا زندگی کا مزہ لے لوں، عبادت کرنے اور نیک کام کرنے کے لئے بہت عمر پڑی ہے، بعد میں کرلوں گا۔ اس طرح وہ نیک کاموں کو ٹالتا رہتا ہے، یہاں تک کہ جوانی ڈھل جاتی ہے، اور اس کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ یہاں تک کہ صحت خراب ہوجاتی ہے، اور اس کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اب جوانی کے جانے کے بعد عبادت اور نیک کام کرنا بھی چاہتا ہے تو جسم میں طاقت اور قوت نہیں ہے۔ یا فرصت نہیں ہے، اس لئے کہ اب مصروفیت اتنی ہوگئی ہے کہ وقت نہیں ملتا۔

یہ سب باتیں اس لئے پیدا ہوئیں کہ انسان موت سے غافل ہے۔ موت کا دھیان نہیں۔ اگر روزانہ صبح وشام موت کو یاد کرتا کہ ایک دن مجھے مرنا ہے اور مرنے سے پہلے مجھے یہ کام کرنا ہے تو پھر موت کی یاد اور اس کا دھیان انسان کو گناہوں سے بچاتا ہے، اور نیکی کے راستے پر چلاتا ہے۔ اسی لئے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ ارشاد فرمارہے ہیں کہ مرنے سے پہلے مرو۔

حضرت بہلول رحمۃ اللہ علیہ کا نصیحت آموز واقعہ

ایک بزرگ گزرے ہیں حضرت بہلول مجذوب رحمۃ اللہ علیہ۔ یہ مجذوب قسم کے بزرگ تھے۔ بادشاہ ہارون رشید کا زمانہ تھا۔ ہارون رشید ان مجذوب سے ہنسی مذاق کرتا رہتا تھا۔ اگرچہ مجذوب تھے لیکن

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) والفراغ نعمتان مغبون فيهما كثير من الناس، ٢٢٢٦، سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، باب الحكمة، رقم: ٤١٦٠، مسند أحمد، رقم: ٣٠٣٨

بڑی حکیمانہ باتیں کیا کرتے تھے۔ ہارون رشید نے اپنے دربانوں سے کہہ دیا تھا کہ جب یہ مجذوب میرے پاس ملاقات کے لئے آنا چاہیں تو ان کو آنے دیا جائے۔ ان کو روکا نہ جائے۔ چنانچہ جب ان کا دل چاہتا دربار میں پہنچ جاتے۔

ایک دن یہ دربار میں آئے تو اس وقت ہارون رشید کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی۔ ہارون رشید نے ان مجذوب کو چھیڑتے ہوئے کہا کہ بہلول صاحب! آپ سے میری ایک گزارش ہے۔

بہلول نے پوچھا: کیا ہے؟

ہارون رشید نے کہا کہ میں آپ کو یہ چھڑی بطور امانت کے دیتا ہوں۔ اور دنیا کے اندر آپ کو اپنے سے زیادہ کوئی بیوقوف آدمی ملے، اس کو یہ چھڑی میری طرف سے ہدیہ میں دے دینا۔

بہلول نے کہا: بہت اچھا! یہ کہہ کر چھڑی رکھ لی۔

بادشاہ نے تو بطور مذاق کے چھیڑ چھاڑ کی تھی۔ اور بتانا یہ مقصود تھا کہ دنیا میں تم سب سے زیادہ بیوقوف ہو۔ تم سے زیادہ بیوقوف کوئی نہیں ہے۔ بہر حال، بہلول وہ چھڑی لے کر چلے گئے۔

اس واقعہ کو کئی سال گزر گئے۔ ایک روز بہلول کو پتہ چلا کہ ہارون رشید بہت سخت بیمار ہیں، اور بستر سے لگے ہوئے ہیں، علاج ہو رہا ہے، لیکن کوئی فائدہ نہیں ہو رہا ہے۔ یہ بہلول مجذوب بادشاہ کی عیادت کے لئے پہنچ گئے۔ اور پوچھا کہ امیر المؤمنین! کیا حال ہے؟

بادشاہ نے جواب دیا کہ حال کیا پوچھتے ہو، سفر در پیش ہے۔

بہلول نے پوچھا: کہاں کا سفر در پیش ہے؟

بادشاہ نے جواب دیا کہ آخرت کا سفر در پیش ہے، دنیا سے اب جا رہا ہوں۔

بہلول نے سوال کیا: کتنے دن میں واپس آئیں گے؟

ہارون نے کہا: بھائی یہ آخرت کا سفر ہے، اس سے کوئی واپس نہیں آیا کرتا۔

بہلول نے کہا: اچھا آپ واپس نہیں آئیں گے تو آپ نے سفر کے راحت اور آرام کے انتظامات کے لئے کتنے لشکر اور فوجی آگے بھیجے ہیں؟ بادشاہ نے جواب میں کہا: تم پھر بیوقوفی کی باتیں کر رہے ہو۔ آخرت کے سفر میں کوئی ساتھ نہیں جایا کرتا۔ نہ باڈی گارڈ جاتا ہے، نہ لشکر، نہ فوج اور نہ سپاہی جاتا ہے۔ وہاں تو انسان تنہا ہی جاتا ہے۔ بہلول نے کہا کہ اتنا لمبا سفر کہ وہاں سے واپس بھی نہیں آنا ہے، لیکن آپ نے کوئی فوج اور لشکر نہیں بھیجا۔ حالانکہ اس سے پہلے آپ کے جتنے سفر ہوتے تھے، اس میں انتظامات کے لئے آگے سفر کا سامان اور لشکر جایا کرتا تھا۔ اس سفر میں کیوں نہیں بھیجا؟

بادشاہ نے کہا کہ نہیں، یہ سفر ایسا ہے کہ اس سفر میں کوئی لاؤ لشکر اور فوج نہیں بھیجی جاتی۔

بہلول نے کہا: بادشاہ سلامت! آپ کی ایک امانت بہت عرصے سے میرے پاس رکھی ہے،

وہ ایک چھڑی ہے، آپ نے فرمایا تھا کہ مجھ سے زیادہ کوئی بیوقوف تمہیں ملے تو اس کو دے دینا۔ میں نے بہت تلاش کیا، لیکن مجھے اپنے سے زیادہ بیوقوف آپ کے علاوہ کوئی نہیں ملا، اس لئے کہ میں یہ دیکھا کرتا تھا کہ اگر آپ کا چھوٹا سا بھی سفر ہوتا تھا تو مہینوں پہلے سے اس کی تیاری ہوا کرتی تھی، کھانے پینے کا سامان، خیمے، لاؤلشکر، باڈی گارڈ سب پہلے سے بھیجا جاتا تھا۔ اور اب یہ اتنا لمبا سفر جہاں سے واپس بھی نہیں آنا ہے، اس کے لئے کوئی تیاری نہیں ہے۔ آپ سے زیادہ دنیا میں مجھے کوئی بیوقوف نہیں ملا۔ لہٰذا آپ کی یہ امانت واپس کرتا ہوں۔

یہ سن کر ہارون رشید رو پڑا، اور کہا: بہلول! تم نے سچی بات کی۔ ساری عمر ہم تم کو بیوقوف سمجھتے رہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حکمت کی بات تم نے ہی کہی۔ واقعۃً ہم نے اپنی عمر ضائع کر دی۔ اور اس آخرت کے سفر کی کوئی تیاری نہیں کی۔

عقل مند کون؟

درحقیقت حضرت بہلول نے جو بات کی وہ حدیث ہی کی بات ہے، حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ)) (۱)

اس حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے بتا دیا کہ عقلمند کون ہوتا ہے؟ آج کی دنیا میں عقلمند اس شخص کو کہا جاتا ہے جو مال کمانا خوب جانتا ہو۔ دولت کمانا اور پیسے سے پیسے بنانا خوب جانتا ہو، دنیا کو بیوقوف بنانا خوب جانتا ہو۔ لیکن اس حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ عقلمند انسان وہ ہے جو اپنے نفس کو قابو کرے اور نفس کی ہر خواہش کے پیچھے نہ چلے، بلکہ اس نفس کو اللہ کی مرضی کے تابع بنائے، اور مرنے کے بعد کے لئے تیاری کرے، ایسا شخص عقلمند ہے۔ اگر یہ کام نہیں کرتا تو وہ بیوقوف ہے کہ ساری عمر فضولیات میں گنوادی۔ جس جگہ ہمیشہ رہنا ہے وہاں کی کچھ تیاری نہ کی۔

ہم سب بیوقوف ہیں

جو بات بہلول نے ہارون رشید کے لئے کہی، اگر غور کرو گے تو یہ بات ہم میں سے ہر شخص پر صادق آرہی ہے۔ اس لئے کہ ہم میں سے ہر شخص کو دنیا میں رہنے کے لئے ہر وقت یہ فکر سوار رہتی ہے

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب صفة القيامة والرقائق والورع عن رسول الله صلی الله عليه وسلم، باب منه، رقم: ۳۳۸۳، سنن ابن ماجه، کتاب الزهد، باب ذكر الموت والاستعداد له، رقم: ۴۲۵۰، مسند أحمد، حديث شداد بن اوس، رقم: ۱۶۵۰۱

کہ مکان کہاں بناؤں؟ کس طرح کا بناؤں؟ اس میں کیا کیا راحت و آرام کی اشیاء جمع کروں؟ اگر دنیا میں کہیں سفر پر جاتے ہیں تو کئی دن پہلے سے بکنگ کراتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں سیٹ نہ ملے۔ کئی دن پہلے سے اس سفر کی تیاری شروع ہو جاتی ہے۔ جس جگہ پہنچنا ہے وہاں پر پہلے سے اطلاع دی جاتی ہے، ہوٹل کی بکنگ کرائی جاتی ہے، پہلے سے یہ سب کام کیے جاتے ہیں۔ اور سفر صرف تین دن کا ہے۔ لیکن جس جگہ ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہے، جہاں کی زندگی کی کوئی انتہا نہیں ہے، اس کے لئے یہ فکر نہیں کہ وہاں کا مکان کیسے بناؤں؟ وہاں کے لئے کس طرح بکنگ کراؤں؟

حضورِ اقدس ﷺ فرما رہے ہیں کہ عقلمند شخص وہ ہے جو مرنے کے بعد کے لئے تیاری کرے۔ ورنہ وہ بیوقوف ہے، چاہے وہ کتنا ہی بڑا مالدار اور سرمایہ دار کیوں نہ بن جائے۔ اور آخرت کی تیاری کا راستہ یہ ہے کہ موت سے پہلے موت کا دھیان کرو کہ ایک دن مجھے اس دنیا سے جانا ہے۔

موت اور آخرت کا تصور کرنے کا طریقہ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ دن میں کوئی وقت تنہائی کا نکالو، پھر اس وقت میں ذرا سا اس بات کا تصور کیا کرو کہ میرا آخری وقت آ گیا ہے، فرشتہ روح قبض کرنے کے لئے پہنچ گیا، اس نے میری روح قبض کر لی، میرے عزیز و اقارب نے میرے غسل اور کفن دفن کا انتظام شروع کر دیا۔ بالآخر مجھے غسل دے کر کفن پہنا کر اُٹھا کر قبرستان لے گئے۔ نمازِ جنازہ پڑھ کر مجھے ایک قبر میں رکھا، پھر اس قبر کو بند کر دیا، اور اُوپر سے منوں مٹی ڈال کر وہاں سے رخصت ہو گئے۔ اب میں اندھیری قبر میں تنہا ہوں، اتنے میں سوال و جواب کے لئے فرشتے آ گئے، وہ مجھ سے سوال و جواب کر رہے ہیں۔

اس کے بعد آخرت کا تصور کرو کہ مجھے دوبارہ قبر سے اُٹھایا گیا، اب میدانِ حشر قائم ہے، تمام انسان میدانِ حشر کے اندر جمع ہیں، وہاں شدید گرمی لگ رہی ہے، پسینہ بہہ رہا ہے، سورج بالکل قریب ہے۔ ہر شخص پریشانی کے عالم میں ہے، اور لوگ جا کر انبیاء علیہم السلام سے سفارش کرا رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے درخواست کریں کہ حساب و کتاب شروع ہو۔ پھر اسی طرح حساب و کتاب، پل صراط اور جنت اور جہنم کا تصور کرے۔ روزانہ فجر کی نماز کے بعد تلاوت، مناجات مقبول اور اپنے ذکر و اذکار سے فارغ ہونے کے بعد تھوڑا سا تصور کر لیا کرو کہ یہ وقت آنے والا ہے، اور کچھ پتہ نہیں کب آ جائے۔ کیا پتہ آج ہی آ جائے۔

یہ تصور کرنے کے بعد دعا کرو کہ یا اللہ! میں دنیا کے کاروبار اور کام کاج کے لئے نکل رہا ہوں، کہیں ایسا نہ ہو کہ ایسا کام کر گزروں جو میری آخرت کے اعتبار سے میرے لئے ہلاکت کا باعث

ہو۔ روزانہ یہ تصور کرلیا کرو۔ جب ایک مرتبہ موت کا دھیان اور تصور دل میں بیٹھ جائے گا تو انشاء اللہ اپنی اصلاح کرنے کی طرف توجہ اور فکر ہو جائے گی۔

حضرت عبدالرحمٰن بن ابی نعم رحمۃ اللہ علیہ

ایک بہت بڑے بزرگ اور محدث گزرے ہیں، حضرت عبدالرحمٰن بن ابی نعم رحمۃ اللہ علیہ، ان کے زمانے میں ایک شخص کے دل میں یہ خیال آیا کہ میں مختلف محدثین، علماء اور فقہاء اور بزرگانِ دین سے یہ سوال کروں کہ اگر آپ کو یہ پتہ چل جائے کہ کل آپ کی موت آنے والی ہے، اور آپ کی زندگی کا صرف ایک دن باقی ہے تو آپ وہ ایک دن کس طرح گزاریں گے، اور کن کاموں میں یہ دن گزاریں گے؟ سوال کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اس سوال کے جواب میں یہ بڑے بڑے محدثین، علماء، بزرگانِ دین بہترین کاموں کا ذکر کریں گے، اور اس دن کو بہترین کاموں میں خرچ کریں گے، اس طرح مجھے بہترین کاموں کا پتہ چل جائے گا اور میں آئندہ اپنی زندگی میں وہ بہترین کام انجام دوں گا۔ اس خیال سے انہوں نے بہت سے بزرگوں سے یہ سوال کیا۔ اب اس سوال کے جواب میں کسی نے کچھ کہا، اور کسی نے کچھ کہا، لیکن وہ شخص جب حضرت عبدالرحمٰن بن ابی نعم رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا، اور یہ سوال کیا تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ میں وہی کام کروں گا جو روزانہ کرتا ہوں، اس لئے کہ میں نے پہلے دن سے اپنا نظام الاوقات اس خیال کو سامنے رکھ کر بنایا ہے کہ شاید یہ دن میری زندگی کا آخری دن ہو، اور آج مجھے موت آجائے۔ اس نظام الاوقات کے اندر اتنی گنجائش نہیں ہے کہ میں کسی اور عمل کا اضافہ کرسکوں۔ جو عمل روزانہ کرتا ہوں، آخری دن بھی وہی عمل کروں گا۔ یہ ہے اس حدیث کا مصداق:

"مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا"

انہوں نے موت کا دھیان اور اس کا استحضار کرکے اپنی زندگی کو اس طرح ڈھال لیا کہ ہر وقت مرنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔ جب آنا چاہے آجائے۔

اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا شوق

اسی کے بارے میں حدیث شریف میں فرمایا:

((مَنْ أَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰهِ أَحَبَّ اللّٰهُ لِقَاءَهُ)) (۱)

جو اللہ تعالیٰ سے ملنا پسند کرتا ہے، اور اس کو اللہ تعالیٰ سے ملنے کا شوق ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کو بھی

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب من احبّ لقاء الله، رقم: ۶۰۲۶، صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبة، رقم: ۴۸۴۴، سنن الترمذی، (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

اس سے ملنے کا شوق ہوتا ہے۔ ایسے لوگ تو ہر وقت موت کی انتظار میں بیٹھے ہیں، اور زبانِ حال سے یہ کہہ رہے ہیں:

غَدًا نَلْقَى الْاَحِبَّه مُحَمَّدًا وَ حِزْبَه

کل کو اپنے دوستوں سے یعنی محمد ﷺ اور آپ کے صحابہ سے ملاقات ہوگی۔ اسی موت کے دھیان کے نتیجے میں زندگی شریعت اور اتباعِ سنت کے اندر ڈھل جاتی ہے، اور ہر وقت موت کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ بہر حال، تھوڑا سا وقت نکال کر موت کا تصور کیا کرو کہ موت آنے والی ہے، اس کے لئے میں نے کیا تیاری کی ہے۔

آج ہی اپنا محاسبہ کرلو

اس حدیث کے دوسرے جملے میں ارشاد فرمایا:

((حَاسِبُوْا قَبْلَ أَنْ تُحَاسَبُوْا))

اپنا حساب لیا کرو قبل اس کے کہ تمہارا حساب لیا جائے۔ آخرت میں تمہارے ایک ایک عمل کا حساب لیا جائے گا۔

﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ﴾ (۱)

یعنی تم نے جو اچھا کام کیا ہوگا وہ بھی سامنے آجائے گا، اور جو برا کام کیا ہوگا وہ بھی سامنے آجائے گا۔ کسی نے خوب کہا ہے ؏

تم آج ہوا سمجھو جو روزِ جزا ہوگا

قیامت کے روز جو حساب لیا جائے گا تم اس سے پہلے ہی اپنا حساب لینا شروع کر دو، یعنی روزانہ رات کو حساب لو کہ آج جو میرا سارا دن گزرا، اس میں کونسا عمل ایسا ہے کہ اگر اس عمل کے بارے میں قیامت کے روز مجھ سے پوچھا گیا کہ یہ عمل کیوں کیا تھا تو اس کا کیا جواب دوں گا۔ روزانہ اس طرح کرلیا کرو۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) كتاب الجنائز عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، رقم: ٩٨٦، سنن النسائي، كتاب الجنائز، رقم: ١٨١٣، مسند أحمد، رقم: ٢١٦٣٨

(۱) الزلزال: ۷۔ ۸

صبح کے وقت نفس سے ”معاہدہ“

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اصلاح کا ایک عجیب وغریب طریقہ تجویز فرمایا ہے۔ اگر ہم لوگ اس طریقے پر عمل کرلیں تو وہ اصلاح کے لئے نسخۂ اکسیر ہے۔ اس سے بہتر کوئی نسخہ ملنا مشکل ہے۔ فرماتے ہیں کہ روزانہ چند کام کرلیا کرو۔ ایک یہ کہ جب تم صبح کو بیدار ہو تو اپنے نفس سے ایک معاہدہ کرلیا کرو کہ آج کے دن میں صبح سے لے کر رات کو سونے تک کوئی گناہ نہیں کروں گا، اور میرے ذمے جتنے فرائض و واجبات اور سنتیں ہیں، ان کو بجالاؤں گا، اور جو میرے ذمے حقوق اللہ اور حقوق العباد ہیں، ان کو پورے طریقے سے ادا کروں گا۔ اگر غلطی سے اس معاہدہ کے خلاف کوئی عمل ہوا تو اے نفس! اس عمل پر تجھے سزا دوں گا۔ یہ معاہدہ ایک کام ہوا۔ جس کا نام ہے ”مشارطہ“ یعنی آپس میں شرط لگانا۔

معاہدہ کے بعد دعا

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی اس پہلی بات پر تھوڑا اضافہ فرماتے ہوئے فرمایا کرتے کہ یہ معاہدہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے کہو کہ یا اللہ! میں نے یہ معاہدہ کرلیا ہے کہ آج کے دن گناہ نہیں کروں گا، اور فرائض و واجبات سب ادا کروں گا، شریعت کے مطابق چلوں گا، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی پابندی کروں گا۔ لیکن یا اللہ! آپ کی توفیق کے بغیر میں اس معاہدے پر قائم نہیں رہ سکتا، اس لئے جب میں نے یہ معاہدہ کرلیا ہے تو آپ میرے اس معاہدے کی لاج رکھ لیجئے، اور مجھے اس معاہدے پر ثابت قدم رہنے کی توفیق عطا فرمائیے، اور مجھے عہد شکنی سے بچا لیجئے، اور مجھے اس معاہدے پر پوری طرح عمل کرنے کی توفیق عطا فرما دیئے۔ یہ دعا کرلو۔

پورے دن اپنے اعمال کا ”مراقبہ“

دعا کرنے کے بعد زندگی کے کاروبار کے لئے نکل جاؤ۔ اگر ملازمت کرتے ہو تو ملازمت پر چلے جاؤ۔ اگر تجارت کرتے ہو تو تجارت کے لئے نکل جاؤ۔ اگر دکان پر بیٹھتے ہو تو وہاں چلے جاؤ۔ وہاں جاکر یہ کرو کہ ہر کام شروع کرنے سے پہلے ذرا سوچ لیا کرو کہ یہ کام میرے اس معاہدے کے خلاف تو نہیں ہے، یہ لفظ جو زبان سے نکال رہا ہوں، یہ اس معاہدے کے خلاف تو نہیں ہے؟ اگر خلاف نظر آئے تو اس سے بچنے کی کوشش کرو۔ اس کو ”مراقبہ“ کہا جاتا ہے، یہ دوسرا کام ہے۔

سونے سے پہلے ''محاسبہ''

تیسرا کام رات کو سونے سے پہلے کیا کرو۔ وہ ہے ''محاسبہ''، اپنے نفس سے کہو کہ تم نے صبح یہ معاہدہ کیا تھا کہ کوئی گناہ کا کام نہیں کروں گا، اور ہر کام شریعت کے مطابق کروں گا، تمام حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کروں گا۔ اب بتاؤ کہ تم نے کونسا کام اس معاہدے کے مطابق کیا، اور کونسا کام اس معاہدے کے خلاف کیا؟ اس طرح اپنے پورے دن کے تمام اعمال کا جائزہ لو۔ صبح جب میں گھر سے باہر نکلا تھا، تو فلاں آدمی سے کیا بات کہی تھی؟ جب میں ملازمت پر گیا تو وہاں اپنے فرائض میں نے کس طرح ادا کیے؟ تجارت میں نے کس طرح کی؟ حلال طریقے سے کی یا حرام طریقے سے کی؟ اور جتنے لوگوں سے ملاقات کی ان کے حقوق کس طرح ادا کیے؟ بیوی بچوں کے حقوق کس طرح ادا کیے؟ ان سب معاملات کا جائزہ لو، اس کا نام ہے ''محاسبہ''۔

پھر شکر ادا کرو

اس ''محاسبہ'' کے نتیجے میں اگر یہ بات سامنے آئے کہ تم نے صبح جو معاہدہ کیا تھا، اس میں کامیاب ہو گئے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ یا اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے اس معاہدے پر قائم رہنے کی توفیق دی، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ اس شکر کا نتیجہ وہ ہوگا جس کا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں وعدہ فرمایا ہے:

﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ﴾ (۱)

اگر تم نعمت پر شکر ادا کرو گے تو اللہ تعالیٰ وہ نعمت اور زیادہ دیں گے، لہٰذا جب تم نے اس معاہدے پر قائم رہنے کی نعمت پر شکر ادا کیا تو آئندہ اس نعمت میں اور اضافہ ہوگا، اور اس پر ثواب ملے گا۔

اور اگر اس ''محاسبہ'' کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئے کہ فلاں موقع پر اس معاہدے کی خلاف ورزی ہوگئی، فلاں موقع پر میں بھٹک گیا اور پھسل گیا اور اپنے اس عہد پر قائم نہ رہ سکا، تو اس وقت فوراً توبہ کرو، اور یہ کہو کہ یا اللہ! میں نے یہ معاہدہ تو کیا تھا، لیکن نفس و شیطان کے جال میں آکر میں اس معاہدے پر قائم نہیں رہ سکا، یا اللہ! میں آپ سے معافی مانگتا ہوں، اور توبہ کرتا ہوں، آپ مجھے معاف فرما دیجئے۔

(۱) ابراھیم: ۷

اپنے نفس پر سزا جاری کرو

توبہ کرنے کے ساتھ اپنے نفس کو کچھ سزا بھی دو، اور اپنے نفس سے کہو کہ تم نے اس معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے، لہٰذا تمہیں اب آٹھ رکعت نفل پڑھنی ہوں گی۔ یہ سزا صبح کو معاہدہ کرتے وقت ہی تجویز کرلو۔ لہٰذا رات کو اپنے نفس سے کہو کہ تم نے اپنی راحت اور آرام کی خاطر اور تھوڑی سی لذت حاصل کرنے کی خاطر مجھے عہد شکنی کے اندر مبتلا کیا، اس لئے اب تمہیں تھوڑی سزا ملنی چاہئے، لہٰذا تمہاری سزا یہ ہے کہ اب سونے سے پہلے آٹھ رکعت نفل ادا کرو۔ اس کے بعد سونے کے لئے بستر پر جاؤ۔ اس سے پہلے سونا بند۔

سزا مناسب اور معتدل ہو

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایسی سزا مقرر کرو جس میں نفس پر تھوڑی مشقت بھی ہو، نہ بہت زیادہ ہو کہ نفس بدک جائے، اور نہ اتنی کم ہو کہ نفس کو اس سے مشقت ہی نہ ہو۔ جیسے ہندوستان میں جب سرسید مرحوم نے علی گڑھ کالج قائم کیا، اس وقت طلبہ پر یہ لازم کردیا تھا کہ تمام طلبہ پنج وقتہ نمازیں مسجد میں باجماعت ادا کریں گے، اور جو طالب علم نماز سے غیر حاضر ہوگا اس کو جرمانہ ادا کرنا پڑے گا، اور ایک نماز کا جرمانہ شاید ایک آنہ مقرر کردیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو طلبہ صاحبِ ثروت تھے، وہ پورے مہینے کی تمام نمازوں کا جرمانہ اکٹھا پہلے ہی جمع کرادیا کرتے تھے کہ یہ جرمانہ ہم سے وصول کرلو، اور نماز کی چھٹی۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اِتنا کم اور معمولی جرمانہ بھی نہ ہو کہ آدمی اِکٹھا جمع کرادے، اور نہ اِتنا زیادہ ہو کہ آدمی بھاگ جائے، بلکہ درمیانہ اور معتدل جرمانہ مقرر کرنا چاہئے۔ مثلاً آٹھ رکعت نفل پڑھنے کی سزا مقرر کرنا ایک مناسب سزا ہے۔

کچھ ہمت کرنی پڑے گی

بہر حال، اگر نفس کی اصلاح کرنی ہے تو تھوڑے بہت ہاتھ پاؤں ہلانے پڑیں گے، کچھ نہ کچھ مشقت برداشت کرنی پڑے گی، کچھ نہ کچھ ہمت تو کرنی ہوگی، اور اس کے لئے عزم اور ارادہ کرنا ہوگا، ویسے ہی بیٹھے بیٹھے تو نفس کی اصلاح نہیں ہوجائے گی۔ لہٰذا یہ طے کرلو کہ جب کبھی نفس غلط راستے پر جائے گا تو اس وقت آٹھ رکعت نفل ضرور پڑھوں گا۔ جب نفس کو پتہ چلے گا کہ یہ آٹھ رکعت پڑھنے کی ایک نئی مصیبت کھڑی ہوگئی، تو آئندہ کل وہ نفس تمہیں گناہ سے بچانے کی کوشش کرے گا، تا کہ اس آٹھ رکعت نفل سے جان چھوٹ جائے۔ اس طرح وہ نفس آہستہ آہستہ انشاء اللہ سیدھے

راستے پر آجائے گا، اور پھر تمہیں نہیں بہکائے گا۔

یہ چار کام کرلو

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی نصیحت کا خلاصہ یہ ہے کہ چار کام کرلو:

(۱) صبح کے وقت مشارطہ یعنی معاہدہ۔

(۲) ہر عمل کے وقت مراقبہ۔

(۳) رات کو سونے سے پہلے محاسبہ۔

(۴) اگر نفس بہک جائے تو سونے سے پہلے معاقبہ یعنی اس کو سزا دینا۔

یہ عمل مسلسل کرنا ہوگا

ایک بات اور یاد رکھنی چاہئے کہ دو چار روز یہ عمل کرنے کے بعد یہ مت سمجھ لینا کہ بس اب ہم پہنچ گئے اور بزرگ بن گئے، بلکہ یہ عمل تو مسلسل کرنا ہوگا۔ اور اس میں یہ ہوگا کہ کسی دن تم غالب آجاؤ گے اور کسی دن شیطان غالب آجائے گا، لیکن ایسا نہ ہو کہ اس کے غالب آنے سے تم گھبرا جاؤ اور یہ عمل چھوڑ بیٹھو، اس لئے کہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مصلحت ہے۔ انشاء اللہ اس طرح گرتے پڑتے ایک دن منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤ گے۔ اور اگر یہ عمل کرنے کے بعد پہلے دن ہی منزلِ مقصود پر پہنچ جاؤ گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دماغ میں یہ خناس سوار ہوجائے گا کہ میں تو جنید اور شبلی بن گیا۔ اس لئے کبھی اس پر عمل کے ذریعہ کامیابی ہوگی اور کبھی ناکامی ہوگی۔ جس دن کامیابی ہوجائے تو اس پر اللہ کا شکر ادا کرو، اور جس دن ناکامی ہوجائے اس دن توبہ واستغفار کرو، اور اپنے نفس پر سزا جاری کرو، اور اپنے برے فعل پر ندامت اور شکستگی کا اظہار کرو۔ یہ ندامت اور شکستگی انسان کو کہاں سے کہاں پہنچادیتی ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا قصہ لکھا ہے کہ آپ روزانہ تہجد کی نماز کے لئے بیدار ہوا کرتے تھے۔ ایک دن آپ کی آنکھ لگ گئی اور تہجد قضا ہوگئی۔ سارا دن روتے روتے گزار دیا اور توبہ واستغفار کی کہ یا اللہ! آج میری تہجد کا ناغہ ہوگیا۔ اگلی رات جب سوئے تو تہجد کے وقت ایک شخص آیا اور آپ کو تہجد کے لئے بیدار کیا۔ آپ نے بیدار ہوکر دیکھا کہ یہ بیدار کرنے والا شخص کوئی اجنبی معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ اس نے کہا کہ میں ابلیس ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ

اگر تو ابلیس ہے تو تہجد کی نماز کے لئے اُٹھانے سے تجھے کیا غرض؟ وہ شیطان کہنے لگا: بس آپ اُٹھ جایئے، اور تہجد پڑھ لیجئے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم تو تہجد سے روکنے والے ہو، تم اُٹھانے والے کیسے بن گئے؟ شیطان نے جواب دیا کہ بات دراصل یہ ہے کہ گزشتہ رات میں نے آپ کو تہجد کے وقت سلادیا اور آپ کی تہجد کا ناغہ کرادیا، لیکن سارا دن آپ تہجد چھوٹنے پر روتے رہے، اور استغفار کرتے رہے، جس کے نتیجے میں آپ کا درجہ اتنا بلند ہوگیا کہ تہجد پڑھنے سے بھی اتنا بلند نہ ہوتا۔ اس سے اچھا تو یہ تھا کہ آپ تہجد ہی پڑھ لیتے۔ اس لئے آج میں خود آپ کو تہجد کے لئے اُٹھانے آیا ہوں تاکہ آپ کا درجہ مزید بلند نہ ہوجائے۔

ندامت اور توبہ کے ذریعہ درجات کی بلندی

بہر حال، اگر انسان کو اپنی گزشتہ غلطی پر صدقِ دل سے ندامت ہو، اور آئندہ اس کی طرف نہ لوٹنے کا عزم ہو تو اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اس بندے کے درجات بلند فرما کر اس کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی بندہ غلطی کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اور معافی مانگتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس بندے سے فرماتے ہیں کہ تجھ سے جو یہ غلطی ہوئی، اس غلطی نے تمہیں ہماری ستاری، ہماری غفاری اور ہماری رحمت کا مورد بنادیا، اور یہ غلطی بھی تمہارے حق میں فائدہ مند بن گئی۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب عیدالفطر کا دن آتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی عزت اور جلال کی قسم کھا کر فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ آج یہ لوگ یہاں جمع ہوکر فریضہ ادا کررہے ہیں اور مجھے پکار رہے ہیں۔ مجھ سے مغفرت طلب کررہے ہیں اور اپنے مقاصد مانگ رہے ہیں۔ میری عزت اور میرے جلال کی قسم، میں ضرور آج ان کی دعائیں قبول کروں گا۔ اور ان کی برائیوں اور گناہوں کو بھی حسنات اور نیکیوں میں تبدیل کردوں گا۔ (۱)

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ گناہ اور یہ برائیاں کس طرح نیکیوں میں تبدیل ہوجائیں گی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب کسی انسان سے غفلت اور نادانی سے ایک گناہ سرزد ہوگیا، اور اس کے بعد وہ ندامت اور افسوس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے کہ یا اللہ! غفلت اور نادانی سے یہ گناہ ہوگیا، معاف فرمادیجئے، تو اللہ تعالیٰ اس کی ندامت کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ گناہ معاف فرمادیتے ہیں، بلکہ اس کی بدولت اس کے درجات بھی بلند فرمادیتے ہیں۔ اور اس

---

(۱) شعب الایمان (۱۳۵/۳)، رقم:۳۱۱۷، مشکوۃ المصابیح، کتاب الصوم، باب لیلۃ القدر، رقم:۲۰۹۶

طرح وہ گناہ بھی درجات کی بلندی کا سبب بن جاتا ہے، اور اس کے حق میں خیر بن جاتا ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا:

﴿فَأُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ﴾(1)

''اللہ تعالیٰ ان کی سیئات کو حسنات میں تبدیل فرما دیتے ہیں''

ایسی تیسی مرے گناہوں کی

ہمارے ایک بزرگ گزرے ہیں حضرت بابا نجم احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مجازِ صحبت تھے، بہت اُونچے مقام کے بزرگ تھے۔ وہ شعر بھی کہا کرتے تھے۔ ان کا ایک شعر مجھے بہت پسند ہے، اور بار بار یاد آتا ہے، وہ یہ کہ۔

دولتیں مل گئیں ہیں آہوں کی
ایسی تیسی مرے گناہوں کی

یعنی جب اللہ تعالیٰ نے ہمیں گناہوں پر ندامت اور عجز و نیاز اور آہ و بکا عطا فرمادی، اور ہم دعا بھی کررہے ہیں کہ یا اللہ! میرے اس گناہ کو معاف فرمادیجئے، مجھ سے غلطی ہوگئی تو اب گناہ کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ یہ گناہ بھی اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز حکمت سے خالی پیدا نہیں کی۔ لہٰذا گناہ کے پیدا کرنے میں بھی حکمت اور مصلحت ہے، وہ یہ کہ گناہ ہوجانے کے بعد جب توبہ کروگے، اور ندامت کے ساتھ آہ و بکا کروگے اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا عزم کروگے تو اس توبہ کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ تمہیں کہاں سے کہاں پہنچادیں گے۔

نفس سے زندگی بھر کی لڑائی ہے

لہٰذا رات کو جب پورے دن کے اعمال کا محاسبہ کرتے وقت پتہ چلے کہ آج گناہ سرزد ہوگئے ہیں تو اب توبہ و استغفار کرو، اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو اور مایوس مت ہوجاؤ۔ اس لئے کہ یہ زندگی ایک جہاد اور لڑائی ہے، جس میں مرتے دم تک نفس اور شیطان سے لڑائی اور مقابلہ کرنا ہے، اور مقابلے کے اندر یہ تو ہوتا ہے کہ کبھی تم نے گرادیا، کبھی دوسرے نے گرادیا، لہٰذا اگر شیطان تمہیں گرادے تو اس وقت ہمت ہار کر پڑے مت رہنا، بلکہ دوبارہ نئے عزم اور ولولے کے ساتھ کھڑے ہوجاؤ، اور پھر شیطان کے مقابلے کے لئے تیار ہوجاؤ۔ اور یہ تمہارے ساتھ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اگر تم ہمت نہیں ہاروگے، بلکہ دوبارہ مقابلے کے لئے کھڑے ہوجاؤ گے، اور اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتے

(1) الفرقان: ۷۰

رہو گے تو ان شاء اللہ بالآخر فتح تمہاری ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے:

﴿وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ (۱)

انجام متقیوں کے ہاتھ میں ہے، فتح تمہاری ہوگی۔

تم قدم بڑھاؤ، اللہ تعالیٰ تھام لیں گے

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ (۲)

جن لوگوں نے ہمارے راستہ میں جہاد کیا، یعنی نفس و شیطان کے ساتھ تم نے اس طرح لڑائی کی کہ وہ شیطان تمہیں غلط راستے پر لے جارہا ہے، اور تم اس سے مقابلہ کر رہے ہو، اور کوشش کر کے غلط راستے سے بچ رہے ہو تو پھر ہمارا وعدہ ہے کہ ہم ضرور بالضرور مقابلہ کرنے اور کوشش کرنے والوں کو اپنے راستے کی ہدایت دیں گے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ میں اس آیت کا ترجمہ یہ کرتا ہوں کہ جو لوگ ہمارے راستے میں کوشش کرتے ہیں تو ہم ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے راستے پر لے چلتے ہیں۔

پھر ایک مثال کے ذریعہ اس آیت کو سمجھاتے ہوئے فرماتے کہ جب بچہ چلنے کے قابل ہو جاتا ہے تو اس وقت ماں باپ کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ بچہ چلے، چنانچہ اس کو چلنا سکھاتے ہیں اور اس کو تھوڑی دور کھڑا کر دیتے ہیں، اور پھر اس بچے کو اپنے پاس بلاتے ہیں کہ بیٹا ہمارے پاس آؤ۔ اگر بچہ وہیں کھڑا رہے اور قدم آگے نہ بڑھائے تو ماں باپ بھی دور کھڑے رہیں گے، اور اس کو گود میں نہیں اُٹھائیں گے۔ لیکن اگر بچے نے ایک قدم بڑھایا، اور دوسرے قدم پر وہ گرنے لگا تو اب ماں باپ اس کو گرنے نہیں دیتے، بلکہ آگے بڑھ کر اس کو تھام لیتے ہیں اور گود میں اُٹھا لیتے ہیں۔ اس لئے کہ بچے نے قدم بڑھا کر اپنی سی کوشش کر لی۔ اسی طرح جب انسان اللہ تعالیٰ کے راستے میں چلتا ہے تو کیا اللہ تعالیٰ اس کو بے یار و مددگار چھوڑ دیں گے، اور اس کو نہیں تھامیں گے؟ ایسا نہیں کریں گے۔ بلکہ اس آیت میں وعدہ ہے کہ جب تم چلنے کی کوشش کرو گے تو ہم آگے بڑھ کر تمہیں گود میں اُٹھا کر لے جائیں گے۔ اس لئے آگے قدم بڑھاؤ، ہمت کرو، کوشش کرو، مایوس ہو کر مت بیٹھ جاؤ۔

سوئے مایوسی مرو امید ھا است
سوئے تاریکی مرو خورشید ھا است

ان کے دربار میں مایوسی اور تاریکی کا گزر نہیں ہے۔ لہٰذا نفس و شیطان سے مقابلہ کرتے رہو،

---

(۱) القصص: ۸۳ (۲) العنکبوت: ۶۹

اگر غلطی ہو جائے تو پھر امید کا دامن مت چھوڑو، مایوس مت ہو جاؤ، بلکہ کوشش جاری رکھو، انشاء اللہ تم ایک دن ضرور کامیاب ہو جاؤ گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ تم اپنے حصے کا کام کرلو، اللہ تعالیٰ اپنے حصے کا کام ضرور کریں گے۔ یاد رکھو، تمہارے حصے میں جو کام ہیں اس میں نقص اور کمی ہو سکتی ہے، اللہ تعالیٰ کے حصے کے کام میں نقص اور کمی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا جب تم قدم بڑھاؤ گے تو تمہاری لئے راستے کھلیں گے انشاء اللہ۔ اسی کی طرف حضورِ اقدس ﷺ نے اس حدیث میں اشارہ فرمایا:

((مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا وَحَاسِبُوْا قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا))[1]

یعنی مرنے سے پہلے مرو۔ اور آخرت کے حساب سے پہلے اپنا محاسبہ کرلو۔

اللہ تعالیٰ کے سامنے کیا یہ جواب دو گے؟

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ محاسبہ کا ایک طریقہ یہ ہے کہ یہ تصور کرو کہ آج تم میدانِ حشر کے اندر کھڑے ہو۔ اور تمہارا حساب و کتاب ہو رہا ہے۔ نامۂ اعمال پیش ہو رہے ہیں۔ تمہارے نامۂ اعمال کے اندر جو تمہارے برے اعمال درج ہیں، وہ سب سامنے آرہے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ تم سے سوال کر رہے ہیں کہ تم نے یہ برے اعمال اور گناہ کیوں کیے تھے؟ کیا اس وقت تم اللہ تعالیٰ کو وہی جواب دو گے جو آج تم مولویوں کو دیتے ہو؟ آج جب تم سے کوئی مولوی یا مصلح یہ کہتا ہے کہ فلاں کام مت کرو، نگاہ کی حفاظت کرو، سود سے بچو، غیبت اور جھوٹ سے بچو، ٹی وی کے اندر جو فحاشی اور عریانی کے پروگرام آرہے ہیں، ان کو مت دیکھو، شادی بیاہ کی تقریبات میں بے پردگی سے بچو، تو ان باتوں کے جواب میں تم مولوی صاحب کو یہ جواب دیتے ہو کہ ہم کیا کریں۔ زمانہ ہی ایسا خراب ہے، ساری دنیا ترقی کر رہی ہے، چاند پر پہنچ گئی ہے، کیا ہم ان سے پیچھے رہ جائیں، اور دنیا سے کٹ کر بیٹھ جائیں۔ اور آج کے اس معاشرے میں یہ سب کام کیے بغیر آدمی کا گزارہ نہیں ہے۔ یہ وہ جواب ہے جو آج تم مولویوں کے سامنے دیتے ہو، کیا اللہ تعالیٰ کے سامنے بھی یہی جواب دو گے؟ کیا یہ جواب وہاں اللہ تعالیٰ کے سامنے کافی ہوگا؟ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر سوچ کر بتاؤ۔ اگر یہ جواب وہاں نہیں چلے گا تو پھر آج دنیا میں بھی یہ جواب کافی نہیں ہو سکتا۔

ہمت اور حوصلہ بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو

اور اگر تم اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ جواب دو گے کہ یا اللہ! ماحول اور معاشرے کی وجہ سے میں

(۱) کشف الخفاء، ۲/ ۴۰۲

گناہ کرنے پر مجبور تھا، تو اللہ تعالیٰ یہ سوال کریں گے کہ اچھا یہ بتاؤ کہ تم مجبور تھے یا میں مجبور تھا؟ تم یہ جواب دو گے کہ یا اللہ! میں ہی مجبور تھا، آپ مجبور نہیں تھے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ جب میں مجبور نہیں تھا تو تم نے مجھ سے اپنی اس مجبوری کو دور کرنے کی دعا کیوں نہیں کی؟ اور کیا میں تمہاری اس مجبوری کو دور کرنے پر قادر نہیں تھا؟ اگر میں قادر تھا تو مجھ سے مانگتے، اور یہ کہتے کہ یا اللہ! یہ مجبوری پیش آگئی ہے، یا تو آپ اس مجبوری کو دور فرما دیجئے، یا پھر مؤاخذہ مت فرمایئے گا، اور مجھے اس پر سزا مت دیجئے گا۔ بتایئے! کیا تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کے اس سوال کا جواب ہے؟ اگر جواب نہیں ہے تو پھر آج زندگی کے اندر یہ کام کرلو۔ وہ یہ کہ جن کاموں کے کرنے پر تم اپنے آپ کو مجبور پا رہے ہو، خواہ واقعۃً مجبور ہو، یا معاشرے کی وجہ سے مجبور ہو، اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے روزانہ دعا کرلو کہ یا اللہ! یہ مجبوری پیش آگئی ہے، اس کی وجہ سے میرے اندر اس سے بچنے کی ہمت نہیں ہو رہی ہے، آپ قادرِ مطلق ہیں، اس مجبوری کو بھی دور کر سکتے ہیں، اور اس بے ہمتی کو بھی دور کر سکتے ہیں۔ اس مجبوری کو دور کر دیجئے، اور اس گناہ سے بچنے کی ہمت اور حوصلہ عطا فرما دیجئے۔

ان کی نوازشوں میں تو کوئی کمی نہیں

بہر حال، اللہ تعالیٰ سے مانگو، یہ تجربہ ہے کہ جب کوئی بندہ اللہ تعالیٰ سے اس طرح مانگتا ہے تو اللہ تعالیٰ ضرور عطا فرما دیتے ہیں۔ اگر کوئی مانگے ہی نہیں تو اس کا کوئی علاج نہیں۔ ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ یہ شعر پڑھا کرتے تھے کہ۔

کوئی جو ناشناسِ ادا ہو تو کیا علاج
ان کی نوازشوں میں تو کوئی کمی نہیں

لہٰذا مانگنے والا ہی نہ ہو تو اس کا کوئی علاج نہیں۔ ان کا دامنِ رحمت کھلا ہے۔ بہر حال، آج ہم نے صبح و شام چار کام کرنے کا جو نسخہ پڑھا ہے اگر ہم اس پر کاربند ہو جائیں تو انشاء اللہ اس حدیث پر عمل کرنے والے بن جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی مغفرت فرمائے اور ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.



جزا و سزا کا تصور ☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

اسلام کی بنیاد جن عقائد پر ہے، ان میں توحید اور رسالت کے بعد اہم ترین عقیدہ آخرت کا عقیدہ ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو مرنے کے بعد ایک ایسی دائمی زندگی سے سابقہ پیش آئے گا جس میں اسے ان تمام کاموں کا حساب دینا ہوگا جو اس نے دنیا میں انجام دیئے، اسی دائمی زندگی کو آخرت کہا جاتا ہے اور قرآن کریم نے جابجا یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ آخرت میں انسان کو اپنے نیک اور اچھے کاموں پر انعام اور برے کاموں پر سزا دی جائے گی۔

﴿فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ خَیۡرًا یَّرَہٗ وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ﴾ (۱)

''پس جو شخص ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اسے (آخرت میں) دیکھ لے گا، اور جو شخص ذرہ برابر بدی کرے گا وہ اسے دیکھے گا''

آخرت کی یہ دائمی زندگی اگرچہ فی الحال ہمیں نظر نہیں آتی، لیکن آخرت کی جزا و سزا اور حقیقت ہماری اس دنیوی زندگی کا لازمی تقاضا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات کا یہ نظام کتنے مضبوط، مستحکم اور حکیمانہ اصولوں پر چل رہا ہے تو لازماً اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ کائنات خود بخود وجود میں نہیں آگئی بلکہ اسے کسی ایسے علیم و حکیم خالق نے پیدا کیا ہے جس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں، پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس دنیا میں ہر طرح کے لوگ آباد ہیں، ان میں شریف بھی ہیں شریر بھی، پرہیزگار بھی ہیں گناہگار بھی، ظالم بھی ہیں مظلوم بھی، لہٰذا اگر یہ دنیوی زندگی ہی سب کچھ ہو اور اس کے بعد کوئی زندگی آنے والی نہ ہو تو یہ سارا کارخانہ بیکار ہو کر رہ جاتا ہے، کیونکہ اس طرح نہ اچھے آدمیوں کو ان کی نیکی کا کوئی انعام مل سکتا ہے اور نہ گنہگاروں اور ظالموں کو ان کے ظلم اور زیادتی اور نافرمانی کا بدلہ دیا جاسکتا ہے، اور یہ بات خالقِ کائنات کی حکمت

☆ نشری تقریریں، ص: ۱۷۔۲۱، فرد کی اصلاح، ص: ۴۱۔۴۴

(۱) الزلزال: ۷۔۸

سے ممکن نہیں کہ وہ ظالموں اور مظلوموں اور نیکوکاروں اور بدکاروں کے ساتھ ایک ہی جیسا معاملہ کرے، لہٰذا یہ کائنات خود اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ مرنے سے انسان کی زندگی ہمیشہ کے لئے ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ مرنے کے بعد انسان اس عالم میں چلا جاتا ہے، جہاں اس کو اس کی دنیوی زندگی کی جزا یا سزا ملنی ہے۔

قرآن حکیم نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ:

﴿أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ﴾ (۱)

"تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تم کو بے فائدہ پیدا کیا ہے؟ اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے؟"

اس سے معلوم ہوا کہ آخرت اور جزاوسزا کا قیام ایک عقلی ضرورت ہے اور اس کے بغیر کائنات کا یہ پورا کارخانہ بیکار ہو کر رہ جاتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اَن دیکھے حقائق سے باخبر کرنے اور اپنے احکام کی تعلیم دینے کے لئے جتنے انبیاء علیہم السلام مبعوث فرمائے، عقیدۂ آخرت کی تعلیم نہایت اہتمام کے ساتھ دی ہے اور آخرت کے واقعات کی تفصیل بھی بیان فرمائی ہے، خود قرآن کریم کا کم وبیش ایک تہائی حصہ آخرت اور جزاوسزا ہی کے بیان پر مشتمل ہے۔

قرآن وسنت اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات میں عقیدۂ آخرت پر اس قدر اہمیت کے ساتھ اس لئے زور دیا گیا ہے کہ انسان کو انسان بنانے کے لئے جزاوسزا کے پختہ یقین سے زیادہ مؤثر کوئی چیز نہیں، جب تک انسان کے دل ودماغ میں یہ حقیقت پیوست نہ ہو کہ اسے اللہ کے سامنے اپنے ایک ایک قول وفعل کا جواب دینا ہے اس وقت تک وہ اپنی نفسانی خواہشات کا غلام بنا رہتا ہے اور اس کو گناہوں، بری عادتوں اور فاسد اخلاق سے نجات نصیب نہیں ہوتی۔

اگر آخرت کی جوابدہی انسان کے پیشِ نظر نہیں ہے دنیا کا سخت سے سخت قانون بھی اسے جرائم اور بداخلاقی کے ارتکاب سے نہیں روک سکتا، کیونکہ پولیس اور عدالت کا خوف زیادہ سے زیادہ دن کی روشنی اور شہر کے ہنگاموں میں اسے جرم سے باز رکھ سکتا ہے، لیکن رات کی تاریکی اور جنگل کی تنہائی میں بھی انسان کے دل پر پہرہ بٹھانے والی چیز اللہ کا خوف اور فکرِ آخرت کے سوا کچھ نہیں۔

سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیئس سال کی مختصر مدت میں جو حیرت انگیز انقلاب برپا فرمایا اس کا ایک راز یہ تھا کہ آپ نے اپنی شب وروز کی تعلیمات کے ذریعہ لوگوں کے دل میں آخرت کا تصور اس قوت کے ساتھ جاگزیں کردیا تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آخرت کے حساب وکتاب کو ہر وقت اس طرح پیشِ نظر رکھتے تھے جیسے وہ اسے کھلی آنکھوں دیکھ رہے ہوں۔

(۱) المؤمنون: ۱۱۵

چنانچہ آخرت کی یہ فکر ان سے ایسے ایسے مشکل کام بآسانی کرالیتی تھی جو سالہا سال کی تعلیم وتربیت کے بعد بھی انجام دینے مشکل معلوم ہوتے ہیں۔

مثلاً ایک شراب نوشی کی عادت ہی کو لے لیجئے، آج دنیا کی بیشتر مہذب اقوام اس بات پر متفق ہیں اور عقلی اور عملی طور پر اس بات کو تسلیم کرتی ہیں کہ شراب نوشی ایک بری عادت ہے جو انسان کی صحت کو بھی تباہ کرتی ہے، اور اخلاق کو بھی، چنانچہ اس موضوع پر بڑے بڑے گرانقدر مقالے لکھے جاتے رہتے ہیں، اور بڑی فاضلانہ تحقیقات منظرِ عام پر آتی رہتی ہیں، لیکن آج کی مہذب دنیا جسے اپنی عقل وخرد اور سائنٹفک ترقیات پر بڑا ناز ہے، اپنے تمام ناقابلِ تردید دلائل، مؤثر اعداد وشمار، نشر واشاعت کے ترقی یافتہ ذرائع اور ذہن بدلنے کے جدید ترین وسائل استعمال کرنے کے باوجود شراب کے عادی افراد سے شراب چھڑانے میں قطعی ناکام ہوچکی ہے، آج کی مہذب دنیا تعلیم وتربیت اور اخلاق وترغیب سے لے کر تعزیری قوانین تک شراب کا استعمال ختم کرانے کے لئے ہر تدبیر آزما چکی ہے، لیکن شراب نوشی کے اعداد وشمار روز بروز بڑھتے ہی چلے جارہے ہیں۔

اس کے برعکس عرب کے اس معاشرے کا تصور کیجئے جس میں سرکارِ دو عالم ﷺ کو مبعوث فرمایا گیا تھا۔

زمانۂ جاہلیت اور اسلام کے ابتدائی دور تک عربوں کا حال یہ تھا کہ گھر گھر میں شراب پانی کی طرح پی جاتی تھی، اس سے عربوں کی والہانہ محبت کا یہ عالم تھا کہ عربی زبان میں شراب کے لئے کم وبیش ڈھائی سو الفاظ ملتے ہیں، اور شراب نوشی ان کے نزدیک عیب تو کیا ہوتی اسے سرمایۂ فخر وناز سمجھا جاتا تھا، لیکن جب قرآن کریم نے حرمتِ شراب کا اعلان فرمایا تو اس قوم نے یکلخت اپنے اس محبوب ترین مشروب کو اس طرح چھوڑ دیا کہ تاریخ میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حرمتِ شراب کی آیات نازل ہوئیں تو ایک مجلس میں شراب کا دور چل رہا تھا، جب میں نے ان کو یہ آیتیں سنائیں تو بعض لوگوں کے ہونٹ کے ساتھ پیالہ لگا ہوا تھا اور چند گھونٹ منہ میں تھے، انہوں نے آیات سننے کے بعد اتنا بھی گوارا نہ کیا کہ جو گھونٹ منہ میں ہے حلق سے اُتارلیں، بلکہ کلّی کرکے پیالہ بہادیا۔(۱)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ایک مجلس میں شراب کا ساقی بنا ہوا تھا، اچانک منادی کی آواز سنائی دی کہ شراب حرام کردی گئی، تو پوری محفل نے شراب کو بہادیا، اور مٹکے توڑ ڈالے، اور مدینہ کی گلیوں میں شراب پانی کی طرح بہنے لگی۔(۲)

---

(۱) تفسیر ابن کثیر، سورۃ المائدۃ، رقم الآیۃ: ۹۰(۱۳۲/۲)

(۲) تفسیر ابن کثیر، سورۃ المائدۃ، رقم الآیۃ: ۹۰(۱۳۰/۲)

عادات واخلاق کی یہ حیرت انگیز کایا پلٹ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی محبت اور خشیت اور اس کے جزاوسزا کے عقیدے کی بناء پر ہوئی، جو سرکارِ دو عالم ﷺ نے صحابہ کرام کی رگ وپے میں پیوست فرمادیا تھا۔ اسی عقیدے کا نتیجہ تھا کہ اول تو عہدِ رسالت میں جرائم کی شرح گھٹتے گھٹتے صفر تک پہنچ گئی، اور اگر بشری تقاضے کی بناء پر کسی سے کوئی جرم سرزد ہوا بھی تو اسے گرفتار کرنے کے لئے کسی پولیس کی ضرورت بھی پیش نہیں آئی، بلکہ خود آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوکر اور اصرار کر کے اپنے اُوپر سزا جاری کروائی، کیونکہ یہ حقیقت ان کے دل میں پیوست تھی کہ دنیا کی سزا آخرت کے عذاب کے مقابلے میں کہیں زیادہ آسان اور قابلِ برداشت ہے، آج بھی اگر کوئی چیز دنیا کو جرائم، بداخلاقی، بدامنی اور دھوکہ فریب سے نجات دلاسکتی ہے تو وہ صرف اور صرف اللہ کا خوف، فکرِ آخرت اور جزاوسزا کی تیاری کا دھیان ہے، لیکن اس کے لئے ان عقائد کا محض زبانی اقرار کافی نہیں بلکہ ان کو ہر وقت مستحضر رکھنے کی ضرورت ہے۔

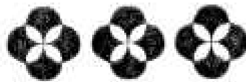
جس کا طریقہ یہ ہے کہ قرآن وحدیث میں آخرت کی جو تفصیلات بیان فرمائی گئی ہیں انہیں بار بار پڑھا جائے، اور زندگی کی بے شمار مصروفیات میں سے کچھ وقت یہ سوچنے کے لئے نکالا جائے کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ چنانچہ سرکارِ دو عالم ﷺ کا ارشاد ہے:

((أَكْثِرُوْا ذِكْرَ هَا ذِمِ اللَّذَّاتِ الْمَوْتِ))[1]

"لذتوں کو ختم کرنے والی چیز یعنی موت کو کثرت سے یاد رکھا کرو"

اللہ تعالیٰ ہم سب کو سرورِ دو عالم ﷺ کے ان ارشادات پر عمل کرنے کی توفیقِ کامل عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.



---

(۱) سنن الترمذی، کتاب صفة القيامة والرقائق والورع عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب منه، رقم: ۲۳۸٤

جنت کے حسین مناظر ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.
﴿وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِىْ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ لَكُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ كَثِيْرَةٌ مِّنْهَا تَاْكُلُوْنَ﴾(۱)

آخرت کے حالات جاننے کا راستہ

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! مرنے کے بعد کے حالات جاننے کا انسان کے پاس کوئی راستہ نہیں ہے، کوئی علم کوئی فن کوئی معلومات ایسی نہیں ہیں جو انسان کو مرنے کے بعد کے حالات سے باخبر کر سکے۔ جو شخص اس دنیا سے وہاں چلا جاتا ہے اس کو وہاں کے حالات کی خبر ہوتی ہے، لیکن ہمیں پھر اس جانے والے کی خبر نہیں رہتی۔

ایک بزرگ کا عجیب قصہ

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ ایک بزرگ کا قصہ سنایا کرتے تھے کہ ایک بزرگ تھے، ان کے مریدین نے ایک مرتبہ ان بزرگ سے کہا کہ حضرت! جو شخص بھی مرنے کے بعد اس دنیا سے جاتا ہے وہ ایسا جاتا ہے کہ پلٹ کر خبر نہیں لیتا، نہ تو یہ بتاتا ہے کہ کہاں پہنچا اور نہ یہ بتاتا ہے کہ اس کے ساتھ کیا معاملہ ہوا اور نہ یہ بتاتا ہے کہ اس نے کیا مناظر دیکھے، کوئی ایسی تدبیر بتایئے کہ ہمیں بھی وہاں کی کوئی خبر مل جائے۔ ان بزرگ نے فرمایا: ایسا کرو کہ جب میرا انتقال ہو جائے اور مجھے قبر میں دفن کرو تو قبر کے اندر میرے پاس تم ایک کاغذ اور قلم رکھ دینا۔ مجھے اگر

☆ اصلاحی خطبات (۹/۲۳۱-۲۵۳)، ۱۷ نومبر ۱۹۹۵ء، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) الزخرف: ۷۲-۷۳

موقع ملا تو میں لکھ کر تمہیں وہاں کی خبر بتلادوں گا کہ وہاں کیا واقعات پیش آئے ۔ لوگ بہت خوش ہوئے کہ چلو کوئی بتانے والا ملا۔

جب ان بزرگ کا انتقال ہوا تو ان کی وصیت کے مطابق ان کو دفن کرتے وقت ان کے ساتھ ایک کاغذ اور قلم بھی رکھ دیا۔ ان بزرگ نے یہ بھی وصیت کی تھی کہ دوسرے دن قبر پر آ کر وہ کاغذ اُٹھالینا، اس پر تمہیں لکھا ہوا ملے گا۔ چنانچہ اگلے دن لوگ ان کی قبر پر پہنچے تو دیکھا کہ ایک پرچہ ان کی قبر پر لکھا ہوا پڑا ہے۔ اس پرچے کو دیکھ کر لوگ بہت خوش ہوئے کہ آج ہمیں اس دنیا کی خبر مل جائے گی، لیکن جب پرچہ اُٹھا کر پڑھا تو اس پر یہ لکھا ہوا تھا کہ:

''یہاں کے حالات دیکھنے والے ہیں، بتانے والے نہیں''

واللہ اعلم، یہ واقعہ کیسا ہے؟ سچا یا جھوٹا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں تو ہے کہ ایسا کر دیتے۔ اس لئے یہ واقعہ سچا بھی ہوسکتا ہے اور جھوٹا اور من گھڑت بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ وہاں کے حالات بتانے کے نہیں ہیں، دیکھنے کے ہیں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے وہاں کے حالات کو ایسا راز کے اندر رکھا ہے کہ کسی پر بھی ذرا سا ظاہر نہیں ہوتا۔ بس قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اور حضور اقدس ﷺ نے احادیث میں جتنی باتیں بتادیں اس سے زیادہ کسی کو وہاں کے حالات کے بارے میں معلوم ہونے کا کوئی راستہ نہیں۔ قرآن و حدیث کے ذریعہ جو حالات ہم تک پہنچے ہیں، ان کو یہاں پر تھوڑا سا بیان کرنا مقصود ہے۔

ادنیٰ جنتی کی جنت کا حال

چنانچہ حضرت مغیرۃ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ اے پروردگار! اہلِ جنت میں سب سے کم درجہ کس کا ہوگا اور سب سے ادنیٰ آدمی جنت میں کون ہوگا؟ جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ جب سارے جنتی جنت میں چلے جائیں گے اور جہنم والے جہنم میں چلے جائیں گے، ایک آدمی جنت میں جانے سے رہ گیا ہوگا اور جنت کے آس پاس کے علاقے میں بیٹھا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس سے فرمائیں گے کہ جب تم دنیا میں تھے اس وقت تم نے بڑے بڑے بادشاہوں کا ذکر سنا ہوگا، ان بادشاہوں میں سے اپنی مرضی سے چار بادشاہوں کا انتخاب کر کے میرے سامنے بیان کرو، اور پھر ان بادشاہوں کی سلطنتوں کے جتنے حصے تھے، ان میں سے جتنے حصوں کا تم نام بیان کر سکتے ہو بیان کرو، چنانچہ وہ شخص کہے گا کہ یا اللہ! میں نے فلاں فلاں بادشاہ کا ذکر سنا تھا، ان کی سلطنت بڑی عظیم تھی، اس کو بڑی نعمتیں ملی ہوئی تھیں، میرا دل چاہتا ہے کہ مجھے بھی ویسی ہی سلطنت مل جائے۔ اس طرح وہ ایک ایک کر کے چار مختلف بادشاہوں کی

سلطنت کا نام لے گا۔ اللہ تعالیٰ اس سے فرمائیں گے کہ تم نے ان کی سلطنتوں کے اور ان کے علاقوں کے نام تو بتادیئے لیکن ان بادشاہوں کو جو لذتیں حاصل تھیں اور ان کے بارے میں تم نے سنا ہو گا کہ فلاں بادشاہ ایسے عیش و آرام میں ہے، ان لذتوں میں سے جو لذت تم حاصل کرنا چاہتے ہو، ان کا ذکر کرو۔ چنانچہ وہ شخص ان لذتوں کا ذکر کرے گا کہ میں نے سنا تھا کہ فلاں بادشاہ کو یہ نعمت حاصل تھی، فلاں بادشاہ کو یہ لذت حاصل تھی، یہ لذتیں مجھے بھی مل جائیں۔

پھر اللہ تعالیٰ اس سے سوال کریں گے کہ جن بادشاہوں کا تم نے نام لیا ہے اور ان کی جن سلطنتوں کو تم نے گنوایا ہے اور ان کی جن نعمتوں اور لذتوں کا تم نے ذکر کیا ہے اگر وہ تمہیں مل جائیں تو تم راضی ہو جاؤ گے؟ وہ بندہ عرض کرے گا کہ یا اللہ! اس سے بڑی اور کیا نعمت ہو سکتی ہے، میں تو ضرور راضی ہو جاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اچھا تم نے جتنی سلطنتوں کا نام لیا اور ان کی جن نعمتوں اور لذتوں کا تم نے نام لیا اس سے دس گنا زیادہ تمہیں عطا کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمائیں گے کہ جنت کا سب سے کم تر آدمی جس کو سب سے ادنیٰ درجہ کی جنت ملے گی وہ یہ شخص ہو گا۔ موسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے کہ یا اللہ! جب ادنیٰ آدمی کا یہ حال ہے تو جو آپ کے پسندیدہ بندے ہوں گے جن کو اعلیٰ ترین درجات عطا کیے گئے ہوں گے، ان کا کیا حال ہو گا؟ جواب میں اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اے موسیٰ! جو میرے پسندیدہ بندے ہوں گے ان کے اکرام کی چیزیں تو میں نے اپنے ہاتھ سے بنا کر ان کو خزانوں میں مہر لگا کر محفوظ کر کے رکھ دی ہیں اور ان میں وہ چیزیں ہیں کہ:

((مَا لَمْ تَرَ عَيْنٌ وَلَمْ يَسْمَعْ أُذُنٌ وَلَمْ يَخْطُرْ عَلٰى قَلْبِ أَحَدٍ مِنَ الْخَلْقِ))

یعنی وہ نعمتیں ایسی ہیں کہ آج تک کسی آنکھ نے نہیں دیکھا اور آج تک کسی کان نے ان کا تذکرہ نہیں سنا، اور آج تک کسی انسان کے دل پر ان کا خیال بھی نہیں گزرا، ایسی نعمتیں میں نے تیار کر کے رکھی ہوئی ہیں۔ [1]

ایک اور ادنیٰ جنتی کی جنت

ایک اور حدیث میں خود حضور نبی اکرم ﷺ نے ایک شخص کا حال بیان فرمایا کہ سب سے آخر میں جو شخص جنت میں داخل ہو گا وہ ایسا شخص ہو گا جو اپنے اعمالِ بد کی پاداش میں جہنم میں ڈال دیا جائے گا، کیونکہ اگر آدمی مؤمن ہی کیوں نہ ہو، لیکن اگر اعمال خراب کیے ہیں تو پہلے اس کو ان اعمال کی سزا بھگتنی پڑے گی، اس لئے اس کو پہلے جہنم میں ڈال دیا جائے گا، اب وہ شخص جہنم میں جھلس رہا ہو گا تو اس

(۱) صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب أدنى أهل الجنة منزلة فيها، رقم: ۲۷۶، سنن الترمذي، كتاب تفسير القرآن عن رسول الله، رقم: ۳۱۲۲

وقت وہ اللہ تعالیٰ سے کہے گا کہ یا اللہ! اس جہنم کی تپش اور اس کی گرمی نے تو مجھے جھلسا دیا ہے، آپ کی بڑی مہربانی ہوگی کہ آپ مجھے تھوڑی دیر کے لئے جہنم سے نکال کر اُوپر کنارے پر بٹھا دیں تا کہ میں تھوڑی دیر کے لئے جلنے سے بچ جاؤں۔

اللہ تعالیٰ اس سے فرمائیں گے کہ اگر ہم تمہیں وہاں بٹھا دیں گے تو تم کہو گے کہ مجھے اور آگے پہنچا دو۔ وہ بندہ کہے گا کہ یا اللہ! میں وعدہ کرتا ہوں کہ بس ایک مرتبہ یہاں سے نکال کر اُوپر بٹھا دیں، پھر آگے جانے کے لئے نہیں کہوں گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اچھا ہم تمہاری بات مان لیتے ہیں۔ چنانچہ اس کو جہنم سے نکال کر اُوپر بٹھا دیا جائے گا۔ جب وہاں تھوڑی دیر تک بیٹھے گا اور کچھ اس کے ہوش وحواس ٹھکانے پر آئیں گے تو تھوڑی دیر کے بعد کہے گا کہ یا اللہ! آپ نے مجھے یہاں بٹھا دیا اور جہنم سے نکال تو دیا لیکن ابھی جہنم کی لپٹ یہاں تک آرہی ہے، تھوڑی دیر کے لئے اور دور کر دیں کہ یہ لپٹ بھی نہ آئے۔

اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تم نے ابھی وعدہ کیا تھا کہ آگے جانے کے لئے نہیں کہوں گا، اب تو وعدہ خلافی کر رہا ہے؟ وہ کہے گا: یا اللہ! مجھے تھوڑا اور آگے بڑھا دیں تو پھر میں کچھ نہیں کہوں گا اور کچھ نہیں مانگوں گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اس کو تھوڑا سا اور دور کر دیں گے۔ اور اب اس کو اس جگہ سے جنت نظر آنے لگے گی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد کہے گا کہ یا اللہ! آپ نے مجھے جہنم سے تو نکال دیا اور اب مجھے یہ جنت نظر آرہی ہے، آپ تھوڑی اجازت دیدیں کہ میں اس جنت کا تھوڑا سا نظارہ کرلوں اور اس کے دروازے کے پاس جا کر دیکھ آؤں کہ یہ جنت کیسی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تو پھر وعدہ خلافی کر رہا ہے۔ وہ شخص کہے گا کہ یا اللہ! جب آپ نے اپنے کرم سے یہاں تک پہنچا دیا تو ایک جھلک مجھے جنت کی بھی دکھا دیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ جب تمہیں ایک نظر جنت کی دکھاؤں گا تو کہے گا کہ مجھے ذرا اندر بھی داخل کر دیں۔ وہ شخص کہے گا: نہیں یا اللہ! مجھے صرف جنت کی ایک جھلک دکھا دیں، اس کے بعد پھر کچھ نہیں کہوں گا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ اس کو جنت کی ایک جھلک دکھا دیں گے۔ لیکن جنت کی ایک جھلک دیکھنے کے بعد وہ اللہ تعالیٰ سے کہے گا: یا اللہ! آپ ارحم الراحمین ہیں؟ (سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والے ہیں) جب آپ نے مجھے جنت کے دروازے تک پہنچا دیا تو اب اے اللہ! اپنے فضل سے مجھے اندر بھی داخل فرما دیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ دیکھ ہم تو تجھ سے پہلے ہی کہہ رہے تھے کہ تو وعدہ خلافی کرے گا، لیکن چل، جب ہم نے تجھے اپنی رحمت سے یہاں تک پہنچا دیا تو اب ہم تجھے اس میں داخل بھی کر دیتے ہیں اور جنت میں تجھے اتنا بڑا رقبہ دیتے ہیں جتنا پوری زمین کا رقبہ ہے۔ وہ شخص کہے گا: یا اللہ! آپ ارحم الراحمین ہیں اور میرے ساتھ مذاق کرتے ہیں؟ میں کہاں اور جنت کا اتنا بڑا

رقبہ کہاں؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میں مذاق نہیں کرتا ہوں، تمہیں واقعی جنت کا اتنا بڑا رقبہ عطا کیا جاتا ہے۔(۱)

حدیث مسلسل بالضحک

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے یہ حدیث ہنستے ہوئے بیان فرمائی، اور پھر جن صحابی نے یہ حدیث سنی تھی انہوں نے یہ حدیث اپنے شاگردوں کے سامنے ہنستے ہوئے بیان فرمائی، پھر انہوں نے اپنے شاگردوں کو ہنستے ہوئے بیان فرمائی، یہاں تک کہ حضورِ اقدس ﷺ کے وقت سے لے کر آج تک جب بھی یہ حدیث بیان کی جاتی ہے تو بیان کرنے والا بھی ہنستا ہے اور سننے والے بھی ہنستے ہیں، اسی وجہ سے یہ حدیث "مسلسل بالضحک" کہلاتی ہے۔

پورے کرۂ زمین کے برابر جنت

بہرحال، یہ وہ شخص ہوگا جو سب سے آخر میں جنت میں داخل کیا جائے گا۔ اب آپ اندازہ کریں کہ سب سے آخر میں جنت میں داخل ہونے والے کے بارے میں یہ کہا جارہا ہے کہ جتنا پورا کرۂ زمین ہے، اتنا حصہ جنت میں عطا کیا جائے گا تو پھر اُوپر کے درجات والوں کا کیا حال ہوگا اور ان کو جنت میں کتنا بڑا مقام دیا جائے گا۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہم اس دنیا کی چاردیوری میں بیٹھے ہوئے ہیں، ہمیں اس عالَم کی ہوا بھی نہیں لگی، اس وجہ سے اس عالَم کی وسعتوں کا کوئی اندازہ کر ہی نہیں سکتے، اسی لئے ہمیں اس پر تعجب ہوتا ہے کہ ایک آدمی کو پورے کرۂ ارض کے برابر جگہ کیسے ملے گی؟ اور اگر مل بھی جائے گی تو وہ اتنی بڑی زمین کو لے کر کیا کرے گا؟ یہ اشکال بھی اس لئے ہورہا ہے کہ اس عالَم کی ہمیں ہوا بھی نہیں لگی۔

عالَمِ آخرت کی مثال

اس عالَمِ آخرت کے مقابلے میں ہماری مثال ایسی ہے جیسے ماں کے پیٹ میں بچہ، اس بچہ کو اس دنیا کی ہوا نہیں لگی ہوتی، اس لئے وہ بچہ اس دنیا کی وسعتوں کا اندازہ نہیں کرسکتا، وہ بچہ ماں کے پیٹ ہی کو سب کچھ سمجھتا ہے لیکن جب وہ بچہ دنیا میں آتا ہے تو اس وقت اس کو پتہ چلتا ہے کہ ماں کا پیٹ تو اس دنیا کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو آخرت کا عالَم اپنی رضا کے ساتھ

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب صفة الجنة والنار، رقم: ۲۰۸۶، صحیح مسلم، کتاب الایمان، رقم: ۲۷۲، سنن الترمذی، کتاب صفة جهنم عن رسول الله، رقم: ۲۰۲۰

دکھا دے تو پتہ چلے کہ وہ عالَمِ آخرت کیا چیز ہے اور اس کے اندر کتنی وسعت ہے۔ اور وہ عالَم مؤمنوں کے لئے تیار کیا گیا ہے۔

یہ جنت تمہارے لئے ہے

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ الحمد للہ، جنت مؤمنوں کے لئے تیار کی گئی ہے، صاحبِ ایمان کے لئے تیار کی گئی ہے، اگر تم اللہ جل جلالہ پر ایمان رکھتے ہو تو یقین کرو کہ وہ تمہارے لئے ہی تیار کی گئی ہے، ہاں البتہ اس جنت تک پہنچنے کے لئے اور اس کے راستوں کی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے تھوڑا سا کام کرنا ہے، بس وہ کام کرلو تو انشاء اللہ وہ جنت تمہاری ہے اور تمہارے لئے تیار کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو جنت عطاء فرمائے۔ آمین۔

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ اور آخرت کا دھیان

ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت سعید بن مسیّب رحمۃ اللہ علیہ جو بڑے درجے کے تابعین میں سے ہیں اور بڑے اولیاء اللہ میں سے ہیں، حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں اپنے استاد حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کے ساتھ جمعہ کے دن کسی بازار میں چلا گیا، ان کو کوئی چیز خریدنی تھی، چنانچہ بازار جا کر وہ چیز خرید لی۔ جب بازار سے واپس لوٹنے لگے تو حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ نے مجھ سے فرمایا: اے سعید! میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور تمہیں دونوں کو جنت کے بازار میں جمع کرے۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان دیکھئے کہ وہ ہر آن اور ہر لمحے آخرت کی کوئی نہ کوئی بات ادنیٰ سی مناسبت سے نکال کر اس کے دھیان کو اور اس کے ذکر کو تازہ کرتے رہتے تھے، تاکہ دنیا کی مشغولیات انسان کو اس طرح اپنے اندر مشغول نہ کردیں کہ انسان آخرت کو بھول جائے۔ لہٰذا دنیا کا کام کررہے ہیں، بازار میں خریداری کررہے ہیں اور خریداری کے دوران شاگرد کے سامنے یہ دعا کردی۔

جنت کے اندر بازار

حضرت سعید بن مسیّب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا جنت میں بھی بازار ہوں گے؟ اس لئے کہ ہم نے یہ سنا ہے کہ جنت میں ہر چیز مفت ملے گی اور بازار میں خرید و فروخت ہوتی ہے۔ جواب میں حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہاں پر بھی بازار ہوں گے،

میں نے حضورِ اقدس ﷺ سے سنا ہے کہ ہر جمعہ کے دن جنت میں اہلِ جنت کے لئے بازار لگا کرے گا۔ پھر اس کی تفصیل حضورِ اقدس ﷺ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ جب اہلِ جنت جنت میں چلے جائیں گے اور سب لوگ اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ جائیں گے، اور خوب عیش و آرام سے زندگی گزار رہے ہوں گے اور وہاں ان کو اتنی نعمتیں دی جائیں گی کہ وہاں سے کہیں اور جانے کا تصور بھی نہیں کریں گے، تو اچانک یہ اعلان ہوگا کہ تمام اہلِ جنت کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اپنے اپنے ٹھکانوں سے باہر آجائیں اور ایک بازار کی طرف چلیں، چنانچہ اہلِ جنت اپنے اپنے ٹھکانوں سے باہر نکلیں گے اور بازار کی طرف چل پڑیں گے۔ وہاں جا کر ایک ایسا بازار دیکھیں گے جس میں ایسی عجیب و غریب اشیاء نظر آئیں گی جو اہلِ جنت نے اس سے پہلے کبھی دیکھی نہیں ہوں گی، اور ان اشیاء سے دکانیں سجی ہوں گی، لیکن خرید و فروخت نہیں ہوگی بلکہ یہ اعلان ہوگا کہ جس اہلِ جنت کو جو چیز پسند ہو وہ دکان سے اُٹھا لے اور لے جائے۔ چنانچہ اہلِ جنت ایک طرف سے دوسری طرف بازار میں دکانوں کے اندر عجیب و غریب اشیاء کا نظارہ کرتے ہوئے جائیں گے اور ایک سے ایک نعمت ان کو نظر آئے گی، اور جس اہلِ جنت کو جو چیز پسند آئے گی وہ اس کو اُٹھا کر لے جائے گا۔[1]

جنت میں اللہ تعالیٰ کا دربار

جب بازار کی خریداری ختم ہو جائے گی تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اعلان ہوگا کہ اب سب لوگوں کا اللہ تعالیٰ کے دربار میں ایک اجتماع ہوگا، اور یہ کہا جائے گا کہ آج وہ دن ہے کہ جب دنیا میں تم رہتے تھے تو وہاں جمعہ کا دن آیا کرتا تھا تو تم لوگ جمعہ کی نماز کے لئے اپنے گھروں سے نکل کر ایک جگہ جمع ہوا کرتے تھے، تو آج جمعہ کے اجتماع کا بدل جنت کے اس اجتماع کی صورت میں عطا فرما رہے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کا دربار لگا ہوا ہے، وہاں پر حاضر ہونے کی دعوت دی جاتی ہے، چنانچہ تمام اہلِ جنت اللہ تعالیٰ کے اس دربار میں پہنچیں گے۔ اس دربار میں ہر شخص کے لئے پہلے سے کرسیاں لگی ہوں گی، کسی کی کرسی جواہر سے بنی ہوگی، کسی کی کرسی سونے سے بنی ہوگی، کسی کی کرسی موتیوں سے بنی ہوگی اور کسی کی کرسی چاندی سے بنی ہوئی ہوگی، اس طرح حسبِ درجات کرسیاں ہوں گی۔ جو شخص جتنا اعلیٰ درجے کا ہوگا اس کی کرسی اتنی شاندار ہوگی، ان پر اہلِ جنت کو بٹھایا جائے گا۔ اور ہر شخص اپنی کرسی کو اتنا اچھا سمجھے گا کہ اس کو یہ حسرت نہیں ہوگی کہ کاش مجھے ویسی کرسی مل جاتی جیسے فلاں شخص کی کرسی ہے، کیونکہ اس جنت کے عالم میں غم اور حسرت کا کوئی تصور نہیں ہے، اس لئے اس کو عمدہ کی خواہش ہی نہیں ہوگی۔

---

(۱) الترغیب والترهیب (٤/ ٤٩)، وصف الفردوس، ص: ٦٠

اور جنت میں جو سب سے کم رتبے کے لوگ ہوں گے ان کے لئے کرسیوں کے اردگرد مشک وعنبر کے ٹیلے ہوں گے، ان ٹیلوں پر ان کی نشستیں مقرر ہوں گی، اس پر ان کو بٹھا دیا جائے گا۔ جب سب اہلِ جنت اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ جائیں گے تو اس کے بعد دربارِ خداوندی کا آغاز اس طرح ہوگا کہ حضرت اسرافیل علیہ السلام (جنہوں نے قیامت کا صور پھونکا تھا) سے اللہ تعالیٰ ایسے لحن میں اپنا کلام اور نغمہ سنوائیں گے کہ ساری دنیا کے لحن اور موسیقیاں اس کے سامنے ہیچ اور کمتر ہوں گے۔

مشک وزعفران کی بارش

نغمہ اور کلام سنوانے کے بعد آسمان پر بادل چھا جائیں گے جیسے گھٹا آجاتی ہے اور ایسا محسوس ہوگا کہ اب بارش ہونے والی ہے، لوگ ان بادلوں کی طرف دیکھ رہے ہوں گے، اتنے میں تمام اہلِ دربار کے اُوپر مشک اور زعفران کا چھڑکاؤ ان بادلوں سے کیا جائے گا اور اس کے نتیجے میں خوشبو سے پورا دربار مہک جائے گا، اور وہ خوشبو ایسی ہوگی کہ اس سے پہلے نہ کسی نے سونگھی ہوگی اور نہ اس کا تصور کیا ہوگا۔

پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک ہوا چلے گی اور اس ہوا کے چلنے کے نتیجے میں ہر انسان کو ایسی فرحت اور نشاط حاصل ہوگا کہ اس کی وجہ سے اس کا حسن و جمال دوبالا ہو جائے گا، اس کی صورت اور اس کا سراپا پہلے سے کہیں زیادہ حسین اور خوبصورت ہو جائے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنت کا مشروب تمام حاضرین کو پلایا جائے گا، وہ مشروب ایسا ہوگا کہ دنیا کے کسی مشروب سے اس کو تشبیہ نہیں دی جاسکتی۔

جنت کی سب سے عظیم نعمت ''اللہ کا دیدار''

اس کے بعد اللہ تعالیٰ پوچھیں گے کہ اے جنت والو! یہ بتاؤ کہ دنیا میں جو ہم نے تم سے وعدے کیے تھے کہ تمہارے اعمالِ صالحہ اور ایمان کے بدلے میں ہم تمہیں فلاں فلاں نعمتیں دیں گے، کیا وہ ساری نعمتیں تمہیں مل گئیں یا کچھ نعمتیں باقی ہیں؟ تو سارے اہلِ جنت بیک زبان ہو کر عرض کریں گے کہ یا اللہ! ان سے بڑی نعمت اور کیا ہوگی جو آپ نے ہمیں عطا فرمادی ہیں، آپ نے تو سارے وعدے پورے فرمادیئے، ہمارے تمام اعمال کا بدلہ ہم کو مل گیا، ساری نعمتیں ہم کو عطا فرمادیں، اب اس کے بعد ہمیں کسی نعمت کی خواہش نظر نہیں آتی، ساری راحتیں حاصل ہوگئیں، ساری لذتیں حاصل ہوگئیں، اب اور کیا نعمت باقی ہے؟ لیکن روایت میں آتا ہے کہ اس وقت بھی علماء کام آئیں گے، چنانچہ لوگ علماء کی طرف رجوع کریں گے کہ آپ بتائیں کہ کونسی نعمت ایسی ہے جو ابھی باقی رہ گئی

ہے اور ہمیں نہیں ملی ہے۔ چنانچہ علماء بتائیں گے کہ ایک نعمت باقی ہے وہ اللہ تعالیٰ سے مانگو، وہ ہے اللہ تعالیٰ کا دیدار۔ چنانچہ تمام اہلِ جنت بیک زبان ہو کر عرض کریں گے کہ یا اللہ! ایک عظیم نعمت تو ابھی باقی ہے، وہ ہے آپ کا دیدار۔ اس وقت اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہاں تمہاری یہ نعمت باقی ہے، اب تمہیں اس نعمت سے سرفراز کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا اور اللہ تعالیٰ اپنا جلوہ تمام اہلِ جنت کو دکھائیں گے، اور اس جلوہ کو دیکھنے کے بعد ہر اہلِ جنت یہ محسوس کرے گا کہ ساری نعمتیں جو اس سے پہلے دی گئی تھیں وہ اس عظیم نعمت کے آگے ہیچ در ہیچ ہیں، اس سے بڑی نعمت کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ دیدار کی نعمت سے سرفراز ہونے کے بعد اس دربار کا اختتام ہوگا اور پھر تمام اہلِ جنت اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف واپس چلے جائیں گے۔ (۱)

حسن و جمال میں اضافہ

جب وہ اہلِ جنت اپنے ٹھکانوں پر واپس پہنچیں گے تو ان کی بیویاں اور حوریں ان سے کہیں گی کہ آج کیا بات ہوئی کہ تمہارا حسن و جمال پہلے سے کہیں زیادہ ہو چکا ہے، آج تو تم بہت حسین و جمیل بن کر لوٹے ہو۔ جواب میں اہلِ جنت اپنی بیویوں سے کہیں گے کہ ہم تمہیں جس حالت میں چھوڑ کر گئے تھے، تم اس سے کہیں زیادہ حسین و جمیل اور خوبصورت نظر آ رہی ہو۔ حدیث شریف میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ یہ دونوں کے حسن و جمال میں اضافہ اس خوشگوار ہوا کی بدولت ہوگا جو اللہ تعالیٰ نے چلائی تھی۔ (۲)

بہر حال، یہ جنت میں جمعہ کے دن کے اجتماع اور دربارِ خداوندی کی ایک چھوٹی سی منظر کشی ہے جو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں کو عطا فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو بھی اس کا کچھ حصہ عطا فرمادے۔ آمین۔

جنت کی نعمتوں کا تصور نہیں ہو سکتا

لیکن جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ کوئی بھی لفظ اور کوئی بھی تعبیر اور کوئی بھی منظر کشی جنت کے حالات کا صحیح منظر نہیں کھینچ سکتی۔ اس لئے کہ ایک حدیث قدسی میں خود اللہ جل شانہٗ نے فرمایا:

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب صفة الجنة والنار، رقم: ٦٠٦٧، صحیح مسلم، کتاب الجنة وصفة نعیمها وأهلها، باب احلال الرضوان علی اهل الجنة، رقم: ٥٠٥٧

(۲) حاوی الارواح، ص: ٤١٣

((أَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِيْنَ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ، وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ، وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ))

"یعنی میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے وہ چیزیں تیار کر رکھی ہیں جو آج تک کسی آنکھ نے دیکھی نہیں، کسی کان نے سنی نہیں اور کسی دل میں اس کا خیال بھی نہیں گزرا"(۱)

اس لئے علماء کرام نے فرمایا کہ جنت کی نعمتوں کے نام تو دنیا کی نعمتوں جیسے ہیں، مثلاً وہاں پر طرح طرح کے پھل ہوں گے، انار ہوں گے، کھجور ہوگی، لیکن ان کی حقیقت ایسی ہوگی کہ آج ہم دنیا میں اس کا تصور نہیں کر سکتے کہ وہ کیسی کھجور ہوگی، کیسا انار ہوگا اور کیسے انگور ہوں گے، ان کی حقیقت کچھ اور ہوگی۔

روایت میں آتا ہے کہ جنت میں محلاّت ہوں گے۔ اب ہم یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا میں جیسے محلاّت ہوتے ہیں ایسے محلاّت ہوں گے، لیکن حقیقت میں یہاں بیٹھ کر ان محلاّت کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ اسی طرح روایات میں آتا ہے کہ شراب اور دودھ اور شہد کی نہریں ہوں گی۔ اب ہم یہ تصور کرتے ہیں کہ دنیا کے دودھ اور شہد کی طرح ہوں گے، جس کی وجہ سے اس کی قدر و منزلت ہمارے دل میں پیدا نہیں ہوتی۔ حالانکہ وہاں کے شہد، شراب اور دودھ کا ہم یہاں پر بیٹھ کر تصور ہی نہیں کر سکتے۔

جنت میں خوف اور غم نہیں ہوگا

جنت کی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت جو دنیا کے اندر ہمارے لئے ناقابلِ تصور ہے اور وہ دنیا میں کسی انسان کے تصور میں آ ہی نہیں سکتی، وہ یہ ہے کہ وہاں نہ خوف ہوگا اور نہ حزن اور غم ہوگا، وہاں نہ ماضی کا غم ہوگا نہ مستقبل کا اندیشہ ہوگا۔ یہ وہ نعمت ہے جو دنیا میں کبھی کسی کو میسر آ ہی نہیں سکتی، اس لئے کہ یہ عالَم دنیا اللہ تعالیٰ نے ایسا بنایا ہے کہ یہاں کوئی خوشی کامل نہیں، کوئی لذت کامل نہیں۔ پھر ہر خوشی کے ساتھ کوئی نہ کوئی غم ضرور لگا ہوا ہے، ہر لذت کے ساتھ کوئی نہ کوئی تلخی ضرور لگی ہوئی ہے، مثلاً آپ کھانا کھا رہے ہیں، کھانا بڑا لذیذ ہے، کھانے میں بڑا مزہ آ رہا ہے، لیکن یہ اندیشہ لگا ہوا ہے کہ اگر زیادہ کھا لیا تو بدہضمی ہو جائے گی۔ یا مثلاً آپ کوئی مشروب پی رہے ہیں، بڑا اچھا لگ رہا ہے، لیکن ساتھ یہ اندیشہ لگا ہوا ہے کہ اگر زیادہ پی لیا تو کہیں پھندا نہ لگ جائے، کسی نہ کسی تکلیف کا، کسی نہ

(۱) صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، باب ما جاء فی صفة الجنة وأنها مخلوقة، رقم: ۳۰۰۵
صحیح مسلم، کتاب الجنة وصفة نعیمها وأهلها، رقم: ۵۰۵۰، سنن الترمذی، کتاب تفسیر القرآن عن رسول الله، باب ومن سورة السجدة، رقم: ۳۱۲۱

کسی رنج کا، کسی نہ کسی غم کا اندیشہ ضرور لگا ہوا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے جنت کے عالَم کو ہر اندیشہ، ہر غم، ہر تکلیف سے خالی بنایا ہے، وہاں کوئی اندیشہ نہیں ہوگا، کوئی غم نہیں ہوگا، وہاں پر نہ ماضی کا غم ہوگا، اور نہ مستقبل کا اندیشہ ہوگا، وہاں کسی خواہش کے پورے نہ ہونے کی حسرت نہیں ہوگی بلکہ جو خواہش ہوگی وہ پوری ہوگی۔

جنت کی نعمتوں کی دنیا میں جھلک

حدیث شریف میں آتا ہے کہ اہلِ جنت کی ہر خواہش کو پورا کیا جائے گا، مثلاً یہ خواہش پیدا ہوئی کہ فلاں انار کا رس پیوں۔ اب یہ نہیں ہوگا کہ تمہیں انار توڑ کر اس کا جوس نکالنا پڑے گا بلکہ انار کا جوس خود تمہارے سامنے حاضر کر دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس جنت کی نعمتوں کی تھوڑی تھوڑی جھلکیاں دنیا کے اندر بھی دکھائی ہیں، پہلے جب جنت کی نعمتوں کا تذکرہ کیا جاتا تھا تو لوگ ان کو بہت عجیب نا قابلِ یقین سمجھتے تھے کہ یہ طلسماتی باتیں ہیں اور ان باتوں پر یقین کرنے میں لوگوں کو تامل ہوتا تھا۔ لیکن آج اللہ تعالیٰ نے دکھادیا کہ جب انسان نے اپنی محدود سے محدود عقل کے بل بوتے پر اور تجربے کے بل بوتے پر ایسے کام کر دکھائے کہ اگر سو سال پہلے ان کاموں کے بارے میں لوگوں کو بتا دیا جاتا تو لوگ پاگل اور دیوانہ کہتے۔ مثلاً سو سال تو دور کی بات ہے، اگر آج سے صرف بیس سال پہلے یہ کہا جاتا کہ ایک ایسا آلہ ایجاد ہونے والا ہے جو ایک منٹ میں تمہارے خط کو امریکہ اور دنیا کے کونے کونے میں پہنچا دے گا تو خبر دینے والے کو پاگل کہا جاتا کہ پاکستان کہاں اور امریکہ کہاں، اگر ہوائی جہاز سے بھی جائے تب بھی کم از کم بیس بائیس گھنٹے لگیں گے، ایک منٹ میں خط کیسے پہنچ جائے گا؟ اللہ تعالیٰ نے فیکس مشین اور ٹیلکس مشین کی ایجاد کے ذریعے دکھادیا، یہاں فیکس مشین میں خط ڈالا اور وہاں اس کی کاپی اسی وقت نکل آئی۔ اس محدود عقل کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ایسے ایسے آلات ایجاد کرنے کی توفیق عطا فرمادی۔ جب یہ محدود انسان اپنی محدود عقل کے بل بوتے پر ایسے ایسے کام کرنے پر قدرت رکھتا ہے تو کیا اللہ تعالیٰ اپنی قدرتِ کاملہ سے اور اپنی رحمتِ کاملہ سے اپنے بندوں کے لئے ایسے اسباب مہیا نہیں فرما سکتے کہ ادھر اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی اور ادھر وہ خواہش پوری ہو جائے؟

یہ جنت متقین کے لئے ہے

بات دراصل یہ ہے کہ جب تک انسان کے سامنے حقائق نہیں آتے، اس وقت تک وہ اعلیٰ درجے کی چیزوں کو نا قابلِ یقین تصور کرتا ہے، لیکن حضرات انبیاء علیہم السلام، جن کو اللہ تعالیٰ نے وہ علم عطا

فرمایا جو دنیا کے کسی بھی انسان کو عطا نہیں کیا گیا، انہوں نے ہمیں جنت اور اس کی نعمتوں کے بارے میں یقینی خبریں دی ہیں کہ اس سے زیادہ یقینی خبریں اور کوئی نہیں ہوسکتیں۔ لہٰذا یہ ساری خبریں سچی ہیں اور ہزار درجہ سچی ہیں، اور جنت حق ہے، اس کی نعمتیں حق ہیں، اسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَسَارِعُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ (۱)

''اپنے رب کی مغفرت کی طرف اور اس کی جنت کی طرف دوڑو جس کی وسعت آسمان اور زمین کے برابر ہے اور یہ جنت متقین کے لئے تیار کی گئی ہے جو اللہ سے ڈرنے والے ہوں''

تقویٰ اختیار کرنے والے ہوں اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرنے والے ہوں۔

جنت کے گرد ''کانٹوں'' کی باڑ

بہرحال، یہ جنت جو عظیم الشان ہے اور جس کی نعمتیں عظیم الشان ہیں، لیکن اسی جنت کے بارے میں ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((حُفَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ)) (۲)

یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس جنت کو ایسی چیزوں سے گھیرا ہوا ہے جو ظاہری طور پر انسان کے نفس کو شاق ہوتی ہیں اور ناگوار ہوتی ہیں۔ جیسے ایک بہت عالیشان محل ہے لیکن اس محل کے اردگرد کانٹوں کی باڑ لگی ہوئی ہے، اس محل میں داخل ہونے کے لئے کانٹوں کی باڑ کو عبور کرنا ہی پڑے گا، اور جب تک کانٹوں کی اس باڑ کو پار نہیں کرو گے اس محل کی لذتیں اور نعمتیں حاصل نہیں ہوسکتیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس عالیشان جنت کے گرد ان چیزوں کی باڑ لگائی ہے جو انسان کے نفس کو شاق گزرتی ہیں۔ مثلاً فرائض و واجبات لازم کر دیئے کہ یہ فرائض انجام دو۔ اب آدمی کے نفس کو یہ بات شاق گزرتی ہے کہ اپنے سب کام چھوڑ کر مسجد جائے اور مسجد میں جا کر نماز ادا کرے۔ اسی طرح بہت سے کام جن کے کرنے کو انسان کا دل چاہتا ہے لیکن ان کو حرام اور گناہ قرار دیدیا گیا۔ مثلاً یہ حکم دے دیا گیا کہ اس نگاہ کی حفاظت کرو، یہ نگاہ غلط جگہ پر نہ پڑے، نامحرم پر نہ پڑے، اور یہ نگاہ غلط اور ناجائز

(۱) آل عمران: ۱۳۳

(۲) صحیح مسلم، کتاب الجنة وصفة نعيمها وأهلها، رقم: ۵۰۴۹، سنن الترمذی، کتاب صفة الجنة عن رسول الله، باب ما جاء صفت الجنة بالمكاره، رقم: ۲۴۸۲

پروگرام نہ دیکھے۔ ان سب کاموں سے رکنا انسان پر شاق گزرتا ہے، اب اس کا دل تو یہ چاہ رہا تھا کہ یہ کام کرے لیکن اس کو روک دیا گیا۔ یہی کانٹوں کی باڑ ہے جو جنت کے گرد لگی ہوئی ہے۔ یا مثلاً مجلس میں دوستوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں، کسی کا ذکر آگیا، اب دل چاہ رہا ہے کہ اس کی خوب غیبت کریں، لیکن یہ حکم دیدیا گیا کہ نہیں، غیبت مت کرو، اپنی زبان روک لو، یہ ہے کانٹوں کی باڑ۔ اگر جنت کو حاصل کرنا ہے تو کانٹوں کی اس باڑ کو عبور کرنا ہوگا، اس کے بغیر جنت کا حصول ممکن نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے۔

دوزخ کے گرد شہوات کی باڑ

اسی حدیث میں پہلا جملہ یہ ارشاد فرمایا:

((حُجِبَتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ))[1]

یعنی دوزخ کے گرد اللہ تعالیٰ نے شہوات کی باڑ لگادی ہے، دوزخ کو بڑی خوشنما چیزوں اور دلکش خواہشات نے گھیر رکھا ہے، دل ان کی طرف بھاگنے کو چاہتا ہے لیکن اسکے اندر آگ ہی آگ ہے۔

یہ کانٹوں کی باڑ بھی پھول بن جاتی ہے

بہر حال، اس جنت کے گرد کانٹوں کی باڑ لگی ہوئی ہے، لیکن یہ کانٹے بھی اللہ تعالیٰ نے ایسے بنائے ہیں کہ اگر کوئی شخص ہمت اور عزم کرلے کہ مجھے کانٹوں کی یہ باڑ عبور کرنی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے ان کانٹوں کو بھی پھول بنادیتے ہیں۔ یہ کانٹے اس وقت تک کانٹے ہیں جب تک ان کو دور دور سے دیکھو گے اور جب تک ان کا تصور کرتے رہو گے تو یہ کانٹے ہیں اور ان کا عبور کرنا مشکل نظر آئے گا، لیکن جب ایک مرتبہ ڈٹ کر اور ہمت کرکے ارادہ کرلیا کہ میں تو کانٹوں کی یہ باڑ عبور کرکے رہوں گا اور مجھے اس کانٹے کی باڑ کے پیچھے وہ باغ نظر آرہا ہے اور اس کی نعمتیں نظر آرہی ہیں اور مجھے اس کانٹوں کی باڑ کو پار کرکے اس باغ میں جانا ہے تو اللہ تعالیٰ ان کانٹوں کو بھی پھول بنادیتے ہیں اور اس کو گلزار بنادیتے ہیں۔

ایک صحابی کا جان دے دینا

ایک صحابی جہاد میں شریک ہیں، انہوں نے دیکھا کہ دشمن کا لشکر بڑی طاقت کے ساتھ

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب حجبت النار بالشهوات، رقم: ٦٠٠٦، سنن الترمذی، کتاب صفة الجنة عن رسول الله، رقم: ٢٤٨٣، سنن النسائی، کتاب الایمان والنذور، رقم: ٣٧٠٣

مسلمانوں پر حملہ آور ہو رہا ہے اور اب بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں ہے تو اس وقت بے ساختہ زبان پر جو کلمہ آیا وہ یہ تھا کہ:

غَدًا نَلْقَى الْاَحِبَّهْ مُحَمَّدًا وَّ صَحْبَهْ

یعنی وہ وقت آگیا کہ کل ہماری ملاقات اپنے محبوبوں سے اور دوستوں سے ہوگی یعنی محمد رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ سے اس عالمِ آخرت میں ملاقات ہوگی۔[1]

گویا کہ آگ اور خون کا جو کھیل ہو رہا تھا، جس میں لاشیں تڑپ رہی تھیں اور جان دینا جو سب سے زیادہ مشکل نظر آرہا تھا، لیکن وہ صحابی اس جان دینے کی تکلیف کو خوشی خوشی سہنے کے لئے تیار ہوگئے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب اللہ کے راستے میں لڑنے والا شہید ہوتا ہے اور اس کو موت آتی ہے تو اس کو موت آنے کی تکلیف اتنی بھی نہیں ہوتی جتنی چیونٹی کے کاٹنے کی تکلیف ہوتی ہے۔[2] یہ درحقیقت جنت تک پہنچنے کے لئے کانٹے کی باڑ حائل تھی جس کو عبور کرنا تھا لیکن جب عزم کرلیا کہ یہ جان تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہے اسی کو دینی ہے۔

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

جب یہ عزم کرلیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کانٹے کو پھول بنادیا، اگر بستر پر مرتے تو نہ جانے کس طرح ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتے، کیا کیا تکلیف اُٹھانی پڑتیں، لیکن ہم نے تمہارے لئے قتل ہونے کی تکلیف بھی ایسی بنادی جیسی چیونٹی کے کاٹنے کی تکلیف ہوتی ہے۔

دنیا والوں کے طعنوں کو قبول کرلو

بہرحال، یہ کانٹے بھی دور دور سے دیکھنے کے کانٹے ہیں، لیکن جب آدمی ایک مرتبہ عزم اور ہمت کرلے اور اس کی طرف چل پڑے تو اللہ تعالیٰ ان کانٹوں کو بھی اس کے لئے پھول بنادیتے ہیں۔ لہٰذا ہم لوگ جو سوچتے رہتے ہیں کہ اگر ہم نے دین کے فلاں حکم پر عمل کرلیا یا فلاں گناہ سے بچ گئے یا فلاں کام کرلیا تو اول نفس کو بڑی مشقت ہوگی، پھر دوسری طرف معاشرے کا خیال آتا ہے کہ لوگ کیا کہیں گے کہ یہ تو بالکل مولوی ہوگیا، یہ تو پرانے وقت کا آدمی ہوگیا، یہ تو زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے کو تیار نہیں، اس قسم کے طعنے ملنے کا خیال آتا ہے، یاد رکھو! یہ سب کانٹے ہیں اور جنت تک پہنچنے کے لئے راستے میں جو کانٹوں کی باڑ لگی ہوئی ہے یہ بھی انہی میں سے ہیں۔ جب تم ایک مرتبہ ان کانٹوں کو

(۱) سیر اعلام النبلاء (۱/ ۳۵۹) اسد الغابۃ (۱/ ۲۰۹)

(۲) سنن الترمذی، کتاب فضائل الجہاد عن رسول اللہ، باب ما جاء فی فضل المرابط، رقم: ۱۵۹۱

خندہ پیشانی سے قبول کرلو گے اور ان سے یہ کہہ دو گے کہ ہاں! ہم مولوی ہیں اور بیک ورڈ ہیں، لیکن ہم ایسے بیک ورڈ ہیں جو محمد رسول اللہ ﷺ کی سنت کی طرف دیکھنے والے ہیں۔ جب تم ایک مرتبہ یہ عزم کرلو گے تو یقین رکھو کہ یہ سب کانٹے تمہارے لئے پھول بن جائیں گے۔

عزت دین پر چلنے والوں کی ہوتی ہے

اللہ تعالیٰ اس دنیا کے اندر دکھا دیتے ہیں کہ ان طعنہ دینے والے اور الزام عائد کرنے والوں کی زبانیں رک جاتی ہیں اور بالآخر اللہ تعالیٰ عزت انہی لوگوں کو عطا فرماتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے آگے سر جھکاتے ہیں۔ عزت انہی کی ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ کے تابع فرمان ہوں۔ عہدِ رسالت میں منافقین بھی مسلمانوں سے یہ کہا کرتے تھے کہ ہم تو عزت والے ہیں، اور مسلمان ذلیل ہیں، اور جب مدینہ منورہ جائیں گے تو عزت والے ذلیل لوگوں کو باہر نکال دیں گے یعنی مسلمانوں کو۔ چنانچہ یہ منافقین مسلمانوں کو ذلیل ہونے کا طعنہ دیا کرتے تھے، ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (۱)

''یعنی عزت تو اللہ کے لئے ہے اور اللہ کے رسول کے لئے ہے اور مؤمنین کے لئے ہے، لیکن منافقین نہیں جانتے، ان کو حقیقتِ حال کا پتہ نہیں''

پھر عبادتوں میں لذت آئے گی

تو جنت کے اردگرد کانٹے ضرور ہیں لیکن یہ آزمائش کے کانٹے ہیں، جب تم اس کے قریب جاؤ گے تو اللہ تعالیٰ انہی کانٹوں کو پھول بنا دیں گے اور پھر یہی عبادتیں جو تم پر شاق گزر رہی تھیں، انہی عبادتوں میں وہ لذت حاصل ہوگی کہ دنیا کے بڑے سے بڑے لذیذ کام میں حاصل نہیں ہوتی، چنانچہ حضورِ اقدس ﷺ فرمایا کرتے تھے:

((قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلَاةِ)) (۲)

''میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے''

یعنی یہ نماز ویسے تو عبادت ہے لیکن اس میں اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسی لذت عطا فرمائی ہے کہ دنیا کی ساری لذتیں اس کے آگے ہیچ ہیں۔

---

(۱) المنافقون: ۸

(۲) سنن النسائي، كتاب عشرة النساء، باب حب النساء، رقم: ۳۸۷۸، مسند أحمد، مسند المكثرين من الصحابة، رقم: ۵۳۶۳

گناہ چھوڑنے کی تکلیف

اسی طرح گناہ چھوڑنے میں بیشک مشقت معلوم ہوتی ہے، دل پر آرے چل جاتے ہیں، لیکن دل پر آرے چلنے کے باوجود آدمی اللہ کے لئے یہ گناہ چھوڑ دے اور یہ کہے کہ میں اپنی ان خواہشات کو اللہ کے آگے قربان کر رہا ہوں تو ابتداء میں ضرور مشقت ہوتی ہے لیکن بالآخر پھر ان خواہشات کو کچلنے ہی میں مزہ آتا ہے۔ جب بندہ یہ تصور کرتا ہے کہ میں یہ خواہشات اپنے مالک کے لئے کچل رہا ہوں، اپنے خالق کے لئے کچل رہا ہوں تو پھر اس کو اسی میں لذت حاصل ہوتی ہے۔

ماں بچے کی تکلیف کیوں برداشت کرتی ہے؟

دیکھئے! ایک ماں ہے اور اس کا چھوٹا سا بچہ ہے، سردی کی رات ہے اور ماں اپنے بچے کے ساتھ لحاف میں لیٹی ہے، اتنے میں بچے نے پیشاب پاخانہ کر دیا، اب وہ ماں اس گرم اور نرم لحاف اور بستر کو چھوڑ کر اس بچے کے کپڑے بدل رہی ہے، اس کا بستر اور کپڑے ٹھنڈے پانی سے دھو رہی ہے، اب اس وقت میں اپنی نیند خراب کر کے ٹھنڈے پانی سے یہ کام کرنا کتنا مشکل کام ہے، لیکن وہ ماں یہ سب کام کرتی ہے اور اس کو اس کام میں مشقت بھی ہوتی ہے، لیکن جب وہ یہ تصور کرتی ہے کہ میں یہ کام اپنے بچے کے لئے کر رہی ہوں، اپنے جگر کے ٹکڑے کے لئے کر رہی ہوں تو اس مشقت ہی میں اس کو لطف اور مزہ آنے لگتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس خاتون سے کہے کہ تجھے بڑی مشقت اُٹھانی پڑتی ہے، راتوں کو اُٹھنا پڑتا ہے، سردی کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے، اگر تیرا یہ بچہ تجھ سے چھن جائے تو تیری یہ مشقتیں اور تکلیفیں دور ہو جائیں، تو خاتون یہ کہے گی کہ اس مشقت سے ہزار گنا مشقت اور تکالیف برداشت کرنے کو تیار ہوں لیکن میرا بچہ مجھ سے نہ چھن جائے۔ کیوں ایسا کہے گی؟ اس لئے کہ اس خاتون کو اس بچہ سے محبت ہے اور اس کی محبت کی خاطر سخت سے سخت کام کرنے کو نہ صرف تیار ہے بلکہ اس کو اسی مشقت اور تکلیف میں مزہ آتا ہے۔ بالکل اسی طرح جب ایک بندے کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہو جاتی ہے، تو پھر اللہ کی راہ میں اپنے نفس کی خواہشات کو کچلنے میں وہ لذت حاصل ہوتی ہے جو خواہشات کے پورا کرنے میں حاصل نہیں ہوتی۔

جنت اور عالمِ آخرت کا مراقبہ کریں

بہر حال، جنت کی یہ نعمتیں جو حضورِ اقدس ﷺ نے بیان فرمائیں اور سارا قرآن کریم ان نعمتوں کے تذکرے سے بھرا ہوا ہے، یہ اس لئے بیان کی گئی ہیں تاکہ انسان ان کو حاصل کرنے کی

کوشش کرے اور کانٹوں کی اس باڑ کو عبور کرے جو اس جنت کے اردگرد لگی ہوئی ہے۔ اس کے لئے بزگوں نے یہ طریقہ بتایا ہے کہ اس دنیا میں رہ کر انسان جنت کی ان نعمتوں کا کبھی کبھی تصور اور دھیان کیا کرے۔

چنانچہ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مواعظ میں فرماتے ہیں کہ "ہر مسلمان کو چاہئے کہ روزانہ تھوڑی دیر بیٹھ کر عالمِ آخرت کا تصور کیا کرے اور خاص طور پر جنت کی نعمتوں کا تصور کیا کرے، اور یہ مراقبہ کرے کہ میں دنیا سے جارہا ہوں، قبر میں رکھ دیا گیا ہوں، لوگ مجھے دفن کر کے رخصت ہو گئے ہیں، پھر عالمِ برزخ میں پہنچ گیا، پھر عالمِ آخرت شروع ہو گیا، یہاں حساب کتاب ہو رہا ہے، میزان لگی ہوئی ہے، پل صراط لگا ہوا ہے، ایک طرف جنت ہے، دوسری طرف جہنم ہے، اور پھر جنت کے اندر یہ نعمتیں ہیں اور جہنم کے اندر اس اس طرح کے عذاب ہیں۔ اس طرح تھوڑی دیر بیٹھ کر ان تمام چیزوں کا تصور اور دھیان کیا کرے" اس لئے کہ ہم صبح سے شام تک دنیا کی زندگی میں مصروف رہنے کی وجہ سے اس عالمِ آخرت سے غافل ہو گئے ہیں۔ الحمد للہ ہم سب کا یہ عقیدہ ہے اور اس پر یقین ہے کہ اس دنیا سے ایک دن جانا ہے، اور آخرت آنے والی ہے، لیکن تنہا عقیدہ اور یقین کافی نہیں بلکہ اس کا استحضار بھی ضروری ہے اور اس کا دھیان بھی ضروری ہے، یہ دھیان اور استحضار ہی انسان کو اطاعت پر آمادہ کرتا ہے اور معصیت اور گناہ سے روکتا ہے۔ اس وجہ سے تھوڑا وقت نکال کر آخرت کا دھیان اور مراقبہ کرو، اس دھیان اور مراقبہ کے نتیجے میں انشاء اللہ آخرت کا استحضار پیدا ہوگا۔

دنیا کے کاموں کے اندر آخرت کا دھیان اور استحضار تمہیں اللہ کی اطاعت پر آمادہ کرے گا اور معصیت اور گناہ سے بچنے میں مدد دے گا۔ جنت کی ان نعمتوں کے بیان کرنے کا یہی مقصود ہے جو قرآن وحدیث میں بھری ہوئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اور اپنے فضل وکرم سے ہم سب کو جنت کی نعمتوں کا استحضار عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.



خواب، اسلام کی نظر میں ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

"عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: ((لَمْ یَبْقَ مِنَ النُّبُوَّةِ اِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ)) قَالُوْا: وَمَا الْمُبَشِّرَاتُ؟ قَالَ ((اَلرُّؤْیَا الصَّالِحَةُ))" (۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"نبوت منقطع ہوگئی اور سوائے مبشرات کے نبوت کا کوئی حصہ باقی نہیں رہا"

صحابہ رضی اللہ عنہم نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! مبشرات کیا ہیں؟ (مبشرات کے معنی ہیں خوشخبری دینے والی چیزیں) جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "سچے خواب"

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبشرات ہوتے ہیں اور یہ نبوت کا ایک حصہ ہے۔

ایک اور حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مؤمن کا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے۔ (۲)

سچے خواب نبوت کا حصہ ہیں

مطلب اس کا یہ ہے کہ جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا وقت آیا، تو ابتداء میں چھ ماہ تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نہیں آئی۔ بلکہ چھ ماہ تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سچے خواب آتے رہے۔ حدیث میں آتا ہے

☆ اصلاحی خطبات (۵/۸۹-۱۰۲)، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) صحیح البخاری، کتاب التعبیر، باب المبشرات، رقم: ٦٤٧٥، مسند أحمد، رقم: ٢٢٦٧٩، مؤطا مالك، كتاب الجامع، باب ماجاء فی الرؤیا، رقم: ١٥٠٦

(۲) صحیح البخاری، کتاب التعبیر، باب الرؤیا الصالحة جزء من ستة وأربعین جزءا من النبوة، رقم: ٦٤٧٢، صحیح مسلم، کتاب الرؤیا، رقم: ٤٢٠١، سنن الترمذی، کتاب الرؤیا عن رسول الله صلی الله علیه وسلم، ٢١٩٧، سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، رقم: ٤٣٦٤

کہ جب حضور ﷺ کوئی خواب دیکھتے، تو جو واقعہ آپ نے خواب میں دیکھا ہوتا بعینہ وہی واقعہ بیداری میں پیش آجاتا اور آپ ﷺ کا وہ خواب سچا ہو جاتا اور صبح کے اُجالے کی طرح اس خواب کا سچا ہونا لوگوں کے سامنے واضح ہو جاتا۔ اس طرح چھ ماہ تک آپ ﷺ کو سچے خواب آتے رہے۔ اس کے بعد پھر وحی کا سلسلہ شروع ہوا۔ (۱) اور نبوت ملنے کے بعد تیئس سال تک آپ ﷺ دنیا میں تشریف فرما رہے، ان تیئس سالوں میں سے چھ ماہ کا عرصہ صرف سچے خوابوں کا زمانہ تھا۔ اب تیئس کو دو سے ضرب دیں گے تو چھیالیس بن جائیں گے، اس لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ سچے خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہیں۔ گویا کہ حضورِ اقدس ﷺ کے نبوت کے زمانے کو چھیالیس حصوں میں تقسیم کیا جائے تو اس میں سے ایک حصے میں آپ ﷺ کو سچے خواب ہی آتے رہے، وحی نہیں آئی۔ اسی لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ مؤمن کا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے، اور اشارہ اس طرف کر دیا کہ یہ سلسلہ میرے بعد بھی جاری رہے گا اور مؤمنوں کو سچے خواب دکھائے جائیں گے، اور ان کے ذریعہ بشارتیں دی جائیں گی، اور ایک حدیث میں یہ بھی فرمایا کہ قیامت کے قریب آخری زمانے میں مسلمانوں کو بیشتر خواب سچے آئیں گے۔ (۲)

اس سے معلوم ہوا کہ خواب بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے، اور آدمی کو اس کے ذریعے بشارتیں ملتی ہیں، لہٰذا اگر خواب کے ذریعہ کوئی بشارت ملے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے۔

خواب کے بارے میں دو رائیں

لیکن ہمارے یہاں خواب کے معاملے میں بڑی افراط و تفریط پائی جاتی ہے۔ بعض لوگ تو وہ ہیں جو سچے خوابوں کے قائل ہی نہیں، نہ خواب کے قائل، نہ خواب کی تعبیر کے قائل ہیں۔ یہ خیال غلط ہے۔ اس لئے کہ ابھی آپ نے سنا کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ سچے خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہیں، اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ سچے خواب مبشرات ہیں' اور دوسری طرف بعض لوگ وہ ہیں جو خوابوں ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں، اور خواب ہی کو مدارِ نجات اور مدارِ فضیلت سمجھتے ہیں۔ اگر کسی نے اچھا خواب دیکھ لیا تو بس، اس کے معتقد ہو گئے، اور اگر کسی نے اپنے بارے میں اچھا خواب دیکھ لیا تو وہ اپنا ہی معتقد ہو گیا کہ میں اب پہنچا ہوا بزرگ ہو گیا ہوں' یہ خواب تو سونے کی حالت میں ہوتا ہے۔ لیکن بعض اوقات اللہ تعالیٰ بیداری کی حالت میں کچھ چیزیں دکھاتے ہیں، جس کو ''کشف'' کہتے ہیں۔ چنانچہ اگر کسی کو کشف ہو گیا تو لوگ اسی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے کہ یہ بہت بڑا بزرگ آدمی ہے۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب بدء الوحی، باب بدء الوحی، رقم: ۳

(۲) صحیح البخاری، کتاب التعبیر، باب القید فی المنام، رقم: ٦٤٩٩

اب چاہے بیداری کے اندر اس کے حالات سنت کے مطابق نہ بھی ہوں۔ خوب سمجھ لیجئے کہ انسان کی فضیلت کا اصل معیار خواب اور کشف نہیں، بلکہ اصل معیار یہ ہے کہ اس کی بیداری کی زندگی سنت کے مطابق ہے یا نہیں؟ بیداری کی حالت میں وہ گناہوں سے پرہیز کر رہا ہے یا نہیں؟ بیداری کی حالت میں وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کر رہا ہے یا نہیں؟ اگر اطاعت نہیں کر رہا ہے تو پھر اس کو ہزار خواب نظر آئے ہوں، ہزار کشف ہوئے ہوں، ہزار کرامتیں اس کے ہاتھ پر صادر ہوئی ہوں، وہ معیارِ فضیلت نہیں۔ آج کل اس معاملے میں بڑی سخت گمراہی پھیلی ہوئی ہے۔ پیری مریدی کے ساتھ اس کو لازم سمجھ لیا گیا ہے۔ ہر وقت لوگ خوابوں اور کشف و کرامات ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔

خواب کی حیثیت

حضرت محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ جو بڑے درجے کے تابعین میں سے ہیں، اور خواب کی تعبیر میں امام ہیں، پوری اُمتِ محمدیہ میں ان سے بڑا عالم خواب کی صحیح تعبیر دینے والا شاید کوئی اور پیدا نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو خواب کی تعبیر دینے میں ایک خاص ملکہ عطا فرمایا تھا۔ ان کے بڑے عجیب و غریب واقعات مشہور ہیں۔ لیکن ان کا ایک اتنا پیارا چھوٹا جملہ ہے، جو یاد رکھنے کے قابل ہے، وہ جملہ خواب کی حقیقت واضح کرتا ہے، فرمایا:

((اَلرُّؤْیَا تَسُرُّ وَلَا تَغُرُّ))

یعنی خواب ایک ایسی چیز ہے جس سے انسان خوش ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اچھا خواب دکھایا، لیکن خواب کسی انسان کو دھوکے میں نہ ڈالے، اور وہ یہ نہ سمجھے کہ میں بہت پہنچا ہوا ہو گیا، اور اس کے نتیجے میں بیداری کے اعمال سے غافل ہو جائے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور تعبیرِ خواب

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے بہت سے لوگ خواب کی تعبیر پوچھتے کہ میں نے یہ خواب دیکھا، میں نے یہ خواب دیکھا، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ عام طور پر جواب میں یہ شعر پڑھتے کہ۔

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم
ہمہ آفتاب گفتند، ہمہ آفتاب گویم

یعنی نہ تو میں رات ہوں اور نہ رات کو پوجنے والا ہوں کہ خواب کی باتیں کروں، اللہ تعالیٰ نے تو مجھے آفتاب سے نسبت عطا فرمائی ہے، یعنی آفتابِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم سے، اس لئے میں تو اسی کی بات کہتا ہوں، بہر حال خواب کتنے ہی اچھے آجائیں، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، وہ مبشرات ہیں، ہو سکتا

ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی وقت اس کی برکت عطا فرمادے، لیکن محض خواب کی وجہ سے بزرگی اور فضیلت کا فیصلہ نہیں کرنا چاہئے۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مبشرات

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں بیسیوں افراد نے خواب دیکھے۔ مثلاً خواب میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی، اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی شکل میں دیکھا' یہ اور اس قسم کے دوسرے خواب بیشمار افراد نے دیکھے، چنانچہ جب لوگ اس قسم کے خواب لکھ کر بھیجتے تو حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس کو اپنے پاس محفوظ رکھ لیتے، اور ایک رجسٹر جس پر یہی عنوان تھا ''مبشرات'' یعنی خوشخبری دینے والے خواب، اس رجسٹر میں نقل کرادیتے تھے، لیکن اس رجسٹر کے پہلے صفحے پر اپنے قلم سے یہ نوٹ لکھا تھا:

> ''اس رجسٹر میں ان خوابوں کو نقل کررہا ہوں جو اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں نے میرے بارے میں دیکھے ہیں۔ اس غرض سے نقل کررہا ہوں کہ بہر حال، یہ مبشرات ہیں، فال نیک ہیں، اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے میری اصلاح فرمادے۔ لیکن میں سب پڑھنے والوں کو متنبہ کررہا ہوں کہ آگے جو خواب ذکر کیے جارہے ہیں، یہ ہرگز مدارِ فضیلت نہیں، اور ان کی بنیاد پر میرے بارے میں فیصلہ نہ کیا جائے، بلکہ اصل مدار بیداری کے افعال واقوال ہیں، لہٰذا اس کی وجہ سے آدمی دھوکے میں نہ پڑے''

یہ آپ نے اس لئے لکھ دیا کہ کوئی پڑھ کے دھوکہ نہ کھائے۔ بس یہ حقیقت ہے خواب کی۔ بس جب انسان اچھا خواب دیکھے تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے۔ اور دعا کرے کہ اللہ تعالیٰ اس کو میرے حق میں باعثِ برکت بنادے۔ لیکن اس کی وجہ سے دھوکے میں مبتلا نہ ہو، نہ دوسرے کے بارے میں، اور نہ اپنے بارے میں، بس، خواب کی حقیقت اتنی ہی ہے' اسی خواب سے متعلق دو تین احادیث اور ہیں، جن کے بارے میں اکثر وبیشتر لوگوں کو معلومات نہیں ہیں، جس کی وجہ سے غلط فہمی میں پڑے رہتے ہیں، اس لئے ان احادیث کو بھی پڑھ لینا مناسب اور ضروری ہے۔

شیطان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں نہیں آسکتا

''عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ:
((مَنْ رَآنِیْ فِی الْمَنَامِ فَقَدْ رَآنِیْ لَا یَتَمَثَّلُ الشَّیْطَانُ بِیْ)) (۱)

(۱) صحیح البخاری، کتاب العلم، باب اثم من کذب علی النبی (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضورِاقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے مجھے خواب میں دیکھا، (یعنی جس نے خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی) تو اس نے مجھ ہی کو دیکھا۔ کیونکہ شیطان میری صورت میں نہیں آسکتا۔

اگر کسی شخص کو اللہ تعالیٰ خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی سعادت عطا فرمادے تو یہ بڑی عظیم سعادت ہے، اور اس کی خوش نصیبی کا کیا ٹھکانہ ہے۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس معروف حلیے کے مطابق دیکھے جو احادیث کے ذریعہ ثابت ہے تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو دیکھتا ہے، شیطان یہ دھوکہ نہیں دے سکتا کہ معاذ اللہ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت مبارک میں آجائے۔ یہ حضورِاقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں اپنی زیارت کی خصوصیت بیان فرمادی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت عظیم سعادت

الحمدللہ، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے بہت سے لوگوں کو یہ سعادت عطا فرمادیتے ہیں، اور انہیں خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوجاتی ہے۔ یہ بڑی عظیم نعمت اور عظیم سعادت ہے۔ لیکن اس معاملے میں ہمارے بزرگوں کے ذوق مختلف رہے ہیں۔ ایک ذوق تو یہ ہے کہ اس سعادت کے حصول کی کوشش کی جاتی ہے، اور ایسے عمل کیے جاتے ہیں جس سے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوجائے اور بزرگوں نے ایسے خاص خاص عمل لکھے ہیں۔ مثلاً یہ کہ جمعہ کی شب میں اتنی مرتبہ درود شریف پڑھنے کے بعد فلاں عمل کرکے سوئے تو سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہونے کی توقع اور اُمید ہوتی ہے، اس قسم کے بہت سے اعمال مشہور ہیں۔ بعض حضرات کا ذوق اور مذاق یہ ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس ذوق کے پیشِ نظر خواب میں زیارت کی کوشش کرنا چاہے تو کرلے، اور اس سعادت سے سرفراز ہوجائے۔

زیارت کی اہلیت کہاں؟

لیکن دوسرے بعض حضرات کا ذوق کچھ اور ہے۔ مثلاً میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ کے پاس ایک صاحب آیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آکر کہنے لگے کہ طبیعت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا بہت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) صلى الله عليه وسلم، رقم: ١٠٧، صحيح مسلم، كتاب الرؤيا، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم: من رآني في المنام، رقم: ٤٢٠٦، سنن الترمذي، كتاب الرؤيا عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، رقم: ٢٢٠٦، سنن أبي داود، رقم: ٤٣٦٩

شوق ہورہا ہے۔ کوئی ایسا عمل بتادیجئے جس کے نتیجے میں یہ نعمت حاصل ہوجائے، اور سرکارِ دو عالم ﷺ کی زیارت خواب میں ہوجائے۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بھائی! تم بڑے حوصلے والے آدمی ہو کہ تم اس بات کی تمنا کرتے ہو کہ سرکارِ دو عالم ﷺ کی زیارت ہوجائے۔ ہمیں یہ حوصلہ نہیں ہوتا کہ یہ تمنا بھی کریں۔ اس لئے کہ ہم کہاں اور نبی کریم ﷺ کی زیارت کہاں؟ اس لئے کبھی اس قسم کے عمل سیکھنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اور نہ کبھی یہ سوچا کہ ایسے عمل سیکھے جائیں جن کی وجہ سے سرکارِ دو عالم ﷺ کی زیارت ہوجائے۔

اس لئے کہ اگر زیارت ہوجائے تو ہم اس کے آداب، اس کے حقوق، اس کے تقاضے کس طرح پورے کریں گے؟ اس لئے خود سے اس کے حصول کی کوشش نہیں کی، البتہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے خود ہی زیارت کرادیں تو یہ ان کا انعام ہے، اور جب خود کرائیں گے تو پھر اس کے آداب کی بھی توفیق بخشیں گے، لیکن خود سے ہمت نہیں ہوتی، البتہ جس طرح ایک مؤمن کے دل میں آرزو ہوتی ہے، اس طرح کی آرزو دل میں ہے۔ لیکن زیارت کی کوشش کرنا بڑی ہمت اور حوصلہ والوں کا کام ہے۔ مجھے تو حوصلہ ہوتا نہیں ہے۔

بہر حال اس سلسلے میں ذوق مختلف رہے ہیں۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور روضۂ اقدس کی زیارت

میں نے اپنے والد صاحب کا یہ واقعہ آپ کو پہلے بھی سنایا تھا کہ جب روضۂ اقدس پر حاضر ہوتے تو کبھی روضۂ اقدس کی جالی تک پہنچ ہی نہیں پاتے تھے، بلکہ ہمیشہ یہ دیکھا کہ جالی کے سامنے ایک ستون ہے، اس ستون سے لگ کر کھڑے ہوجاتے، اور جالی کا بالکل سامنا نہیں کرتے تھے۔ بلکہ وہاں اگر کوئی آدمی کھڑا ہوتا تو اس کے پیچھے جاکر کھڑے ہوجاتے۔

ایک دن خود ہی فرمانے لگے کہ ایک مرتبہ میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید تو بڑا شقی القلب آدمی ہے۔ یہ اللہ کے بندے ہیں، جو جالی کے قریب تک پہنچ جاتے ہیں، اور قرب حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور سرکارِ دو عالم ﷺ کا جتنا بھی قرب حاصل ہوجائے، وہ نعمت ہی نعمت ہے، لیکن میں کیا کروں کہ میرا قدم آگے بڑھتا ہی نہیں۔ شاید کچھ شقاوتِ قلب ہے۔ فرماتے ہیں کہ وہاں کھڑے کھڑے میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا۔ مگر اس کے بعد فوراً یہ محسوس ہوا جیسا کہ روضۂ اقدس سے یہ آواز آرہی ہے:

"جو شخص ہماری سنتوں پر عمل کرتا ہے، وہ ہم سے قریب ہے، خواہ ہزاروں میل دور

ہو، اور جو شخص ہماری سنتوں پر عمل نہیں کرتا، وہ ہم سے دور ہے، چاہے وہ ہماری جالیوں سے چمٹا ہوا ہو"

اصل مدار بیداری کے اعمال ہیں

بہر حال، اصل دولت ہے حضورِ اقدس ﷺ کی سنتوں کا اتباع، اللہ تعالیٰ اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین، بیداری کی حالت میں ان کی سنتوں کی توفیق ہو جائے، یہ ہے اصل نعمت، اصل دولت، اور حضور ﷺ کا اصل قرب یہی ہے، لیکن اگر سنتوں پر عمل نہیں اور روضۂ اقدس کی جالیوں سے چمٹا کھڑا ہے اور زیارت کی کوشش کر رہا ہے تو ہمارے خیال میں یہ بڑی جسارت ہے، اس لئے اصل فکر اس بات کی ہونی چاہئے کہ سنت کی اتباع ہو رہی ہے یا نہیں؟ حضورِ اقدس ﷺ کی سنتیں زندگی میں داخل ہو رہی ہیں یا نہیں؟ اس کی فکر کرو۔ خوابوں کے پیچھے بہت زیادہ پڑنا مطلوب اور مقصود نہیں، البتہ اگر حاصل ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، لیکن اس پر نجات کا مدار نہیں، کیونکہ غیر اختیاری معاملہ ہے

ہمارے طبقے میں ایک بڑی تعداد ہے جو خوابوں ہی کے پیچھے پڑی ہے۔ دن رات یہی فکر ہے کہ کوئی اچھا خواب آجائے۔ اسی کو منتہاءِ مقصود سمجھا ہوا ہے۔ حالانکہ یہ بات درست نہیں۔ اس لئے کہ پھر یہ ہوتا ہے کہ جب کبھی کوئی اچھا خواب اپنے بارے میں دیکھ لیا تو بس یہ سمجھا کہ اب میں کہیں سے کہیں پہنچ گیا ہوں۔ خوب سمجھ لیں کہ خواب اپنی ذات میں نہ تو کسی کا درجہ بلند کرتا ہے، اور نہ اجر و ثواب کا موجب ہوتا ہے، بلکہ اصل مدار بیداری کے اعمال پر ہے۔ یہ دیکھو کہ تم بیداری میں کیا عمل کر رہے ہو۔

اچھا خواب دھوکے میں نہ ڈالے

لہٰذا اگر کسی شخص نے خواب میں دیکھا کہ میں جنت میں پھر رہا ہوں، اور جنت کے باغات اور محلّات کی سیر کر رہا ہوں، تو یہ بڑی اچھی بشارت ہے، لیکن اس کی وجہ سے اس دھوکہ میں نہ آئے کہ میں تو جنتی ہو گیا، لہٰذا اب مجھے کسی عمل اور کوشش کی حاجت اور ضرورت نہیں، یہ خیال غلط ہے۔ بلکہ اگر کوئی شخص اچھا خواب دیکھنے کے بعد اعمال کے اندر اور زیادہ اتباع کا اہتمام کرنے لگتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ خواب اچھا اور سچا تھا اور بشارت والا تھا، اور اس سے اس نے غلط نتیجہ نہیں نکالا، لیکن اگر خدا نہ کرے یہ ہوا کہ خواب دیکھنے کے بعد اعمال چھوڑ بیٹھا، اور اعمال کی طرف سے غفلت ہو گئی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خواب نے اس کو دھوکے میں ڈال دیا۔

خواب میں حضور ﷺ کا کسی بات کا حکم دینا

یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ اگر خواب میں حضور ﷺ کی زیارت ہوگئی تو اس کا حکم یہ ہے کہ چونکہ حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ جو کوئی مجھے خواب میں دیکھتا ہے تو مجھے ہی دیکھتا ہے، اس لئے کہ شیطان میری صورت میں نہیں آسکتا، لہٰذا اگر خواب میں حضورِ اقدس ﷺ کی زیارت ہو، اور وہ کوئی ایسا کام کرنے کو کہیں جو شریعت کے دائرے میں ہے، مثلاً فرض ہے، یا واجب ہے، یا سنت ہے، یا مباح ہے، تو پھر اس کو اہتمام سے کرنا چاہئے، اس لئے جو کام شریعت کے دائرے میں ہے، اس کے کرنے کا جب آپ ﷺ حکم فرما رہے ہیں تو وہ خواب سچا ہوگا، اس کام کا کرنا ہی اس کے حق میں مفید ہے، اور اگر نہیں کرے گا تو بعض اوقات اس کے حق میں بے برکتی شدید ہو جاتی ہے۔

خواب حجتِ شرعی نہیں

لیکن اگر خواب میں حضورِ اقدس ﷺ ایسی بات کا حکم دیں جو شریعت کے دائرے میں نہیں ہے، مثلاً خواب میں حضور ﷺ کی زیارت ہوئی، اور ایسا محسوس ہوا کہ آپ ﷺ نے ایک ایسی بات کا حکم فرمایا جو شریعت کے ظاہری احکام کے دائرے میں نہیں ہے، تو خوب سمجھ لیجئے کہ اس خواب کی وجہ سے وہ کام کرنا جائز نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ ہمارے دیکھے ہوئے خواب کی بات کو اللہ تعالیٰ نے مسائلِ شریعت میں حجت نہیں بنایا، اور جو ارشادات حضور ﷺ سے قابلِ اعتماد واسطوں سے ہم تک پہنچے ہیں، وہ حجت ہیں۔ ان پر عمل کرنا ضروری ہے، خواب کی بات پر عمل کرنا ضروری نہیں، کیونکہ یہ بات تو صحیح ہے کہ شیطان حضور ﷺ کی صورت مبارکہ میں نہیں آسکتا، لیکن بسا اوقات خواب دیکھنے والے کے ذاتی خیالات اس خواب کے ساتھ مل کر گڈمڈ ہو جاتے ہیں، اور اس کی وجہ سے اس کو غلط بات یاد رہ جاتی ہے، یا سمجھنے میں غلطی ہو جاتی ہے، اس لئے ہمارے خواب حجت نہیں۔

خواب کا ایک عجیب واقعہ

ایک قاضی تھے، لوگوں کے درمیان فیصلے کیا کرتے تھے، ایک مرتبہ ایک مقدمہ سامنے آیا، اور مقدمہ کے اندر گواہ پیش ہوئے، اور شریعت کے مطابق گواہوں کی جانچ پڑتال کا جو طریقہ ہے، وہ پورا کر لیا، اور آخر میں مدعی کے حق میں فیصلے کرنے کا دل میں ارادہ بھی ہوگیا، لیکن قاضی صاحب نے کہا کہ اس فیصلے کا اعلان کل کریں گے۔ یہ خیال ہوا کہ کل تک ذرا اور سوچ لوں گا، لیکن جب رات کو سوئے تو خواب میں حضور ﷺ کی زیارت ہوئی، اور جب صبح بیدار ہوئے تو ایسا یاد آیا کہ خواب میں

حضور ﷺ یہ فرمارہے تھے کہ جو تم فیصلہ کرنے کا ارادہ کررہے ہو، یہ فیصلہ غلط ہے۔ یہ فیصلہ یوں کرنا چاہئے، اب اُٹھ کر جو غور کیا تو جس طریقے سے فیصلہ کرنے کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا تھا، وہ کسی طرح شریعت کے دائرے میں فٹ نہیں ہوتا۔ اب بڑے پریشان ہوئے کہ ظاہری طور پر شریعت کا جو تقاضا ہے، اس کے لحاظ سے تو یہ فیصلہ اس طرح ہونا چاہئے، لیکن دوسری طرف خواب میں حضور ﷺ فرمارہے ہیں کہ یوں فیصلہ کرو، اب معاملہ بڑا سنگین ہوگیا اور یہ جو مقدمہ کی ذمہ داری ہوتی ہے، یہ بڑی سنگین ذمہ داری ہے۔ جن لوگوں پر گزرتی ہے، وہی اس کو جانتے ہیں، راتوں کی نیندیں حرام ہوجاتی ہیں۔

چنانچہ قاضی صاحب نے خلیفۂ وقت سے جاکر بتایا کہ اس طرح سے یہ مقدمہ پیش آگیا، اور حضور ﷺ نے خواب میں اس طرح فیصلہ کرنے کو فرمایا۔ آپ علماء کو جمع فرمائیں، تاکہ اس کے بارے میں ان سے مشورہ ہوجائے۔ چنانچہ سارے شہر کے علماء جمع ہوئے، اور ان کے سامنے یہ مسئلہ رکھا گیا کہ اس طرح سے مقدمہ درپیش ہے۔ ظاہری طور پر شریعت کا تقاضا یہ ہے، لیکن دوسری طرف خواب میں حضور ﷺ نے یہ فرمایا ہے۔ اب کیا کیا جائے؟ علماء نے فرمایا کہ واقعۃً یہ معاملہ بڑا سنگین ہے۔ حضور ﷺ کی زیارت ہوئی، اور شیطان آپ کی صورت مبارکہ میں آ نہیں سکتا، لہٰذا حضور ﷺ کے فرمان پر عمل کرنا چاہئے، لیکن اس زمانے کے ایک بزرگ جو اپنی صدی کے مجدد کہلاتے تھے، حضرت شیخ عزالدین ابن عبدالسلام رحمۃ اللہ علیہ، وہ بھی مجلس میں حاضر تھے، وہ کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ میں پورے جزم اور وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ شریعت کے قاعدے کے مطابق آپ جو فیصلہ کرنے جارہے ہیں، وہی فیصلہ کیجئے اور سارا گناہ ثواب میری گردن پر ہے۔ خواب کی بات پر فیصلہ کرنا جائز نہیں۔ اس لئے کہ خواب میں ہزاروں احتمالات ہوسکتے ہیں۔ خدا جانے اپنے دل کی کوئی بات اس میں آگئی ہو۔ اگرچہ حضور ﷺ کی صورت مبارکہ میں شیطان نہیں آسکتا، لیکن ہوسکتا ہے کہ بیداری کے بعد شیطان نے کوئی وسوسہ ڈال دیا ہو، کوئی غلط بات دل میں آگئی ہو۔ شریعت نے حضور ﷺ کے بیداری میں سُنے ہوئے ارشادات کے مقابلے میں ہمارے خواب کو حجت قرار نہیں دیا۔ اور حضور ﷺ کے جو ارشادات ہم تک سندِ متصل کے ساتھ پہنچے ہیں، وہی ہمارے لئے حجت ہیں۔ ہمیں انہی پر عمل کرنا ہے۔ آپ بھی اس پر عمل کیجئے، اور گناہ ثواب میری گردن پر ہے۔

خواب اور کشف وغیرہ سے شرعی حکم نہیں بدل سکتا

یہ اللہ کے بندے ہوتے ہیں، جو اس قوت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں، ورنہ یہ بات کہنا آسان کام نہیں تھا کہ ”گناہ ثواب میری گردن پر“، جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ اس دین کی صحیح تشریح کے لئے اور

اس دین کے تحفظ کے لئے بھیجتے ہیں، ان سے ایسی باتیں کرا دیتے ہیں۔ اگر ایک مرتبہ یہ اصول مان لیا جاتا کہ خواب سے بھی شریعت بدل سکتی ہے تو پھر شریعت کا کوئی ٹھکانہ نہ رہتا۔ ایک سے ایک خواب لوگ دیکھ لیتے اور آکر بیان کر دیتے۔

آج آپ دیکھیں کہ یہ جتنے جاہل پیر ہیں، جو بدعات میں مبتلا ہیں، وہ انہی خوابوں کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ کوئی خواب دیکھ لیا، یا کشف ہو گیا، الہام ہو گیا، اور اس کی بنیاد پر شریعت کے خلاف عمل کر لیا، خواب تو خواب ہے، اگر کسی کو کشف ہو جائے جو جاگتے اور بیداری کی حالت میں ہوتا ہے، اس میں آواز آتی ہے، اور وہ آواز کانوں کو سنائی دیتی ہے، لیکن اس کے باوجود کشف شریعت میں حجت نہیں۔ کوئی شخص کتنا ہی پہنچا ہوا عالم یا بزرگ ہو، اس نے اگر خواب دیکھ لیا، یا اس کو کوئی کشف یا الہام ہو گیا، وہ بھی شرعی احکام کے مقابلے میں حجت نہیں ہے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

حضرت مولانا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ جو رئیس الاولیاء ہیں، ایک مرتبہ رات کے وقت عبادت میں مشغول تھے۔ تہجد کا وقت ہے، شیخ عبدالقادر جیسا ولی اللہ عبادت کر رہا ہے، اس وقت ایک زبردست نور چمکا اور اس نور میں سے یہ آواز آئی کہ اے عبدالقادر! تو نے ہماری عبادت کا حق ادا کر دیا۔ اب تو اس مقام پر پہنچ گیا کہ آج کے بعد ہماری طرف سے تم پر کوئی عبادت فرض و واجب نہیں، نماز تیری معاف، تیرا روزہ معاف، تیرا حج اور تیری زکوٰۃ معاف۔ اب تو جس طرح چاہے، عمل کر، ہم نے تمہیں جنتی بنا دیا، شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے سنتے ہی فوراً جواب میں فرمایا کہ ''مردود، دور ہو جا۔ یہ نماز حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے تو معاف نہیں ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے تو معاف نہیں ہوئی، مجھ سے کیسے معاف ہو جائے گی؟ دور ہو جا'' یہ کہہ کر شیطان کو دور کر دیا، اس کے بعد ایک اور نور چمکا، جو پہلے نور سے بھی بڑا نور تھا، اس میں سے آواز آئی کہ ''عبدالقادر، تیرے علم نے آج تجھے بچا لیا۔ ورنہ یہ وہ داؤ ہے، جس سے میں نے بڑوں بڑوں کو ہلاک کر دیا ہے، اگر تیرے پاس علم نہ ہوتا تو ہلاک ہو چکا ہوتا''۔ حضرت شیخ نے فرمایا کہ ''مردود، دوبارہ بہکاتا ہے، میرے علم نے مجھے نہیں بچایا، میرے اللہ نے مجھے بچایا ہے''

عارفین فرماتے ہیں کہ یہ دوسرا داؤ پہلے داؤ سے زیادہ سنگین تھا۔ اس لئے کہ اس وقت شیطان نے ان کے اندر علم کا ناز پیدا کرنا چاہا تھا، کہ تمہارے علم اور تقویٰ نے تمہیں بچا لیا۔ لیکن آپ نے اس کو بھی رد کر دیا۔

خواب کے ذریعہ حدیث کی تردید جائز نہیں

بھائی! یہ راستہ بڑا خطرناک ہے، آجکل خاص طور پر جس طرح کا مذاق بنا ہوا ہے کہ لوگ خواب، کشف، کرامات اور الہامات کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ یہ دیکھے بغیر کہ شریعت کا تقاضا کیا ہے؟ اچھے خاصے دیندار اور پڑھے لکھے لوگوں نے یہ دعویٰ کرنا شروع کر دیا کہ مجھے یہ کشف ہوا ہے کہ فلاں حدیث صحیح نہیں ہے، اور صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی فلاں حدیث یہودیوں کی گھڑی ہوئی ہے، اور مجھے یہ بات کشف کے ذریعہ معلوم ہوئی ہے' اگر اس طریقے سے کشف ہونے لگے تو دین کی بنیادیں ہل جائیں۔ اللہ تعالیٰ ان علماء کو غریقِ رحمت کرے، جن کو در حقیقت اللہ تعالیٰ نے دین کا محافظ بنایا، یہ دین کے چوکیدار ہیں۔ لوگ ان پر ہزار لعنتیں، ملامتیں کریں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو دین کا محافظ اور نگہبان بنایا، تاکہ کوئی دین پر حملہ نہ کر سکے۔ اور دین میں تحریف نہ ہو۔ چنانچہ ان علماء نے صاف صاف کہہ دیا کہ چاہے خواب ہو، یا کشف ہو، یا کرامت ہو، ان میں سے کوئی چیز بھی دین میں حجت نہیں، وہ چیزیں حجت ہیں جو حضورِ اقدس ﷺ سے بیداری کے عالم میں ثابت ہیں۔ کبھی خواب، کشف اور الہام اور کرامت کے دھوکے میں مت آنا۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صحیح کشف تو دیوانوں، بلکہ کافروں کو بھی ہو جاتا ہے، اس لئے کبھی اس دھوکے میں مت آنا کہ نور نظر آ گیا، یا دل چلنے لگا، یا دل دھڑکنے لگا وغیرہ۔ اس لئے کہ یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ شریعت میں ان چیزوں پر فضیلت کا کوئی مدار نہیں۔

خواب دیکھنے والا کیا کرے؟

حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا ''اچھا خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، اور برا خواب شیطان کی طرف سے ہوتا ہے۔ لہٰذا جو شخص خواب میں کوئی ایسی چیز دیکھے جو ناگوار ہو، تو بائیں جانب تین مرتبہ تھتکار دے، اور "اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ" پڑھ لے، جس کروٹ پر خواب دیکھا تھا، اس کی جگہ دوسری کروٹ بدل لے، پھر یہ خواب انشاء اللہ اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا''(۱)

مثلاً بعض اوقات انسان کچھ ڈراؤنے خواب دیکھ لیتا ہے، یا کوئی برا واقعہ دیکھ لیتا ہے تو ایسے

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب التعبیر، باب الرؤیا الصالحة، رقم: ٦٤٧١، صحیح مسلم، کتاب الرؤیا، رقم: ٤١٩٥، سنن الترمذی، کتاب الرؤیا عن رسول الله صلی الله علیه وسلم، رقم: ٢٢٠٣، سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، رقم: ٤٣٦٧، سنن ابن ماجه، باب تعبیر الرؤیا، رقم: ٣٨٩٩

موقع کے لئے حضورِ اقدس ﷺ نے تلقین فرمادی کہ جیسے ہی آنکھ کھلے، فوراً یہ عمل کرے، اور اگر کوئی اچھا خواب دیکھے، مثلاً اپنے بارے میں کوئی دینی یا دنیوی ترقی دیکھی، تو اس صورت میں اپنے جاننے والے اور اپنے محبت کرنے والوں کے سامنے اس خواب کا تذکرہ کرے، دوسروں کو نہ بتائے، کیونکہ بعض اوقات ایک آدمی وہ خواب سن کر اس کی اُلٹی سیدھی تعبیر بیان کردیتا ہے، جس کی وجہ سے اس اچھے خواب کی تعبیر اس کے مطابق ہوجاتی ہے، اس لئے اپنے محبت کرنے والوں کو وہ خواب بتائے، اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے۔

خواب بیان کرنے والے کے لئے دعا کرنا

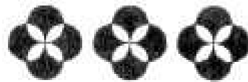
اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں نے خواب دیکھا ہے، اور پھر وہ اپنا خواب بیان کرنے لگے تو ایسے موقع پر حضورِ اقدس ﷺ کا معمول یہ تھا کہ جب کوئی شخص آکر بتاتا کہ میں نے یہ خواب دیکھا ہے تو حضورِ اقدس ﷺ یہ دعا پڑھتے:

((خَيْرًا تَلَقَّاهُ وَشَرًّا تَوَقَّاهُ، خَيْرٌ لَنَا وَشَرٌّ لِأَعْدَائِنَا))(۱)

"اللہ تعالیٰ اس خواب کی خیر تم کو عطا فرمائے، اور اس کے شر سے تمہاری حفاظت فرمائے اور خدا کرے کہ یہ خواب ہمارے لئے اچھا ہو، اور ہمارے دشمنوں کے لئے برا ہو"

اس دعا میں حضورِ اقدس ﷺ نے ساری باتیں جمع فرمادیں، آپ حضرات بھی اس کا معمول بنالیں کہ جب بھی کوئی شخص آکر اپنا خواب بیان کرے تو اس کے لئے یہ دعا کریں، اگر عربی میں یاد نہ ہو تو اُردو ہی میں کرلیں، یہ ہیں خواب کے آداب، اور خواب کی حیثیت، بس ان باتوں کو ذہن میں رکھنا چاہئے، لوگوں میں بہت سی فضولیات خواب کے بارے میں پھیلی ہوئی ہیں، ان سے اپنے آپ کو بچانا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے، اور دین پر صحیح طریقے سے عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.



(۱) المعجم الكبير للطبرانی، تفسير الأحلام

تبرکات
شریعت کی نظر میں ☆

بَابٌ: اَلْمَسَاجِدُ الَّتِیْ فِیْ طُرُقِ الْمَدِیْنَةِ

"حَدَّثَنَا مُوْسَی بْنُ عُقْبَةَ قَالَ: رَأَیْتُ سَالِمَ بْنَ عَبْدِاللّٰهِ یَتَحَرّٰی أَمَاکِنَ مِنَ الطَّرِیْقِ، فَیُصَلِّیْ فِیْهَا، وَیُحَدِّثُ أَنَّ أَبَاهُ کَانَ یُصَلِّیْ فِیْهَا، وَأَنَّهُ رَأَی النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یُصَلِّیْ فِیْ تِلْكَ الْاَمْکِنَةِ، وَحَدَّثَنِیْ نَافِعٌ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا أَنَّهُ کَانَ یُصَلِّیْ فِیْ تِلْكَ الْاَمْکِنَةِ، وَسَأَلْتُ سَالِمًا فَلَا أَعْلَمُهُ إِلَّا وَافَقَ نَافِعٌ فِی الْاَمْکِنَةِ کُلِّهَا إِلَّا أَنَّهُمَا اخْتَلَفَا فِیْ مَسْجِدٍ بِشَرَفِ الرَّوْحَاءِ"(۱)

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب ان مساجد کے بیان میں قائم کیا ہے جو مدینہ منورہ کے راستہ میں واقع ہیں اور ان مواضع کا بیان جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی تھی اور اس میں آگے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے طویل حدیث روایت کی ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان سفر کرتے تو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان مقامات پر نماز پڑھتے تھے جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سفر کے دوران نماز پڑھی تھی اور ان مواقع کو نہ صرف خود تلاش کر کے نماز پڑھتے تھے بلکہ لوگوں کو بتلاتے بھی تھے کہ دیکھو یہ جگہ ہے جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی تھی، یہاں تک کہ بعض روایات

☆ انعام الباری (۳/۲۲۹۔۲۳۹)

(۱) صحیح البخاری، کتاب الصلاة، باب المساجد التی علی طرق المدینة، رقم: ٤٦١، صحیح مسلم، کتاب الحج، باب استحباب استلام الرکنین الیمانیین فی الطواف دون، رقم: ٢٢٢٥، وسنن النسائی، کتاب مناسك الحج، باب التعریس بذی الحلیفة، رقم: ٢٦١٢، ومسند أحمد، مسند المکثرین من الصحابة، باب مسند عبدالله بن عمر بن الخطاب، رقم: ٤٢٣٠، وموطأ مالك، کتاب الحج، باب صلاة معرس والمحصب، رقم: ٨٠٤، وسنن الدارمی، کتاب المناسك، باب فی أی طریق یدخل مکة، رقم: ١٨٤٧

میں آتا ہے کہ ایک جگہ کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بتلایا کہ دیکھو یہاں حضور اکرم ﷺ نے پیشاب کیا تھا اور اسی تحری کے نتیجے میں انہوں نے لفظوں میں اپنے تمام شاگردوں کو ان تمام مواضع کی تفصیل بتا دی تھی کہ کونسی جگہ ہے جہاں حضور ﷺ نے نماز پڑھی تھی۔

اگرچہ تفصیل ایسی تھی کہ اس کی مدد سے آج کوئی آدمی وہاں نہیں پہنچ سکتا کیونکہ وہ تفصیل انہوں نے اپنے زمانہ کے اعتبار سے بتائی تھی کہ دیکھو فلاں جگہ پر فلاں درخت ہے، فلاں جگہ پر گھاٹی ہے، فلاں جگہ پر پہاڑ ہے، فلاں جگہ پر بستی ہے، ظاہر ہے کہ مرورِ زمانہ کی وجہ سے اب وہ نشانیاں مٹ گئی ہیں۔ یہاں تک کہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانہ میں یعنی آٹھویں صدی میں کہہ رہے ہیں کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے جو مقامات بیان فرمائے ہیں ان میں سے صرف دو باقی رہ گئے ہیں۔ ایک روحاء کا مقام اور ایک ذوالحلیفہ۔ باقی سارے مقامات اب دستیاب نہیں ہیں۔ اگرچہ بہت سی جگہیں اب تک ایسی ہیں جن کے نام اب تک وہی ہیں جو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان فرمائے تھے، لیکن جو تفصیل حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان فرمائی تھی کہ بائیں مڑو اور دائیں مڑو، وہ تفصیل اب نہیں رہی ہے۔ صرف روحاء ایک ایسی جگہ ہے جہاں سعودی حکومت کے ہاتھ نہیں پہنچے، اس واسطے وہ جگہ ایسی ہے کہ جہاں کوئی عمارت نہیں بنی تھی۔

چند سال پہلے میں گیا تھا تو وہاں وہ کنواں (بئر روحاء) اب بھی موجود ہے اور اس کے قریب جو ایک جگہ بتائی گئی ہے، واللہ اعلم وہ جگہ بھی محفوظ ہے۔ باقی جتنے مقامات بتائے ہیں یہاں تک کہ ذوالحلیفہ کی وہ جگہ جہاں حضور ﷺ نے نماز پڑھی تھی، اب وہاں بہت عالی شان، لمبی چوڑی مسجد بنا دی گئی ہے، اُس جگہ کو خاص طور پر محفوظ نہیں رکھا گیا ہے، وہ اس مسجد کے اندر آ گئی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ علماء نجد کا کہنا ہے کہ اس قسم کے مقامات کو خاص طور پر محفوظ رکھنا ناجائز ہے اور شرک آمیز ہونے کی وجہ سے منع ہے۔ چنانچہ انہوں نے مدینہ منورہ میں ایسی کوئی نشانی نہیں چھوڑی جسے نہ مٹایا ہو، حضور ﷺ کے جو آثار تھے ایک ایک کر کے سب مٹا دیئے اور چن چن کر ختم کر دیئے۔

لمحہ فکریہ

افسوسناک اور ستم ظریفی کا پہلو یہ ہے کہ مدینہ منورہ میں کعب بن اشرف کا قلعہ برقرار ہے اور اس پر بورڈ لگایا ہوا ہے کہ یہ آثارِ قدیمہ میں سے ہے، خبردار کوئی شخص اس کو نقصان نہ پہنچائے۔ تو کعب بن اشرف کا قلعہ تو محفوظ ہے، نہ صرف محفوظ بلکہ اس کی حفاظت کیلئے بورڈ لگایا ہوا ہے اور مدینہ منورہ کے جتنے آثار تھے ایک ایک کر کے، چن چن کر سب ختم کر دیئے ہیں۔ جس پر بس چلا اُسے اُٹھا کر ختم

کر دیا۔ وہاں کبھی ہم جایا کرتے تھے اور وہاں پر حاضری ہو جایا کرتی تھی۔ ایک آخری چیز باقی رہ گئی تھی اور وہ مسجد قباء کے برابر حضرت اسعد بن زرارۃ رضی اللہ عنہ کا وہ مکان تھا جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چودہ دن قیام فرمایا تھا۔ اب تین چار سال پہلے جب میں حاضر ہوا تو اس کو بھی ڈھا دیا گیا اور وہ بھی ختم کر دیا گیا۔

اس کی وجہ یہ کہتے ہیں کہ مآثر کو برقرار رکھنا اور مآثرِ انبیاء اور مآثرِ صلحاء سے تبرک حاصل کرنا "شعبة من شعب الشرك" یہ شرک ہے، لہٰذا اس کو ختم کرنا ضروری ہے۔

استدلال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور کے ایک واقعہ سے ہے جو سنن سعید بن منصور میں مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حج کے لئے تشریف لے گئے۔ دیکھا کہ لوگ حج کے بعد ایک درخت کی طرف کثرت سے جا رہے ہیں اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ وہ مسجد ہے جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی تھی، اس واسطے لوگ چاہتے ہیں کہ وہاں جا کر نماز پڑھیں۔ اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا کہ تم سے پہلی اُمتیں اس لئے ہلاک ہوئی تھیں کہ اُنہوں نے اپنے انبیاء کے مشاہد کو مساجد بنا دیا تھا اور ان کے اندر نماز پڑھنی شروع کر دی اور ثواب کی چیز بنا دیا اور پھر عمر رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا کہ اگر کسی کو نماز کا وقت ہے تو پڑھ لے اور اگر نہیں ہے تو چلا جائے۔ "من عرض له صلوة فليصل ومن لا فليمض"(۱)

تبرک بآثار الانبیاء علیہم السلام جائز ہے

کہتے ہیں کہ دیکھو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان جگہوں پر نماز پڑھنے سے منع کیا، اب یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام جگہوں پر نماز پڑھنے کا ذکر ہے۔ اسی سے سارے علماء یہ کہتے ہیں کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے مآثر سے تبرک جائز ہے جو فتح الباری میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی لکھا ہے۔

لیکن ابھی حال میں سعودی عرب میں وہاں کے علماء کی نگرانی میں یہ کام ہوا ہے کہ وہاں کے جدید نسخوں میں جہاں جہاں یہ بات لکھی ہوئی ہے وہاں پر ایک حاشیہ لکھ دیا جاتا ہے کہ "هذا خطاء وهذا فيه نظر"(۲)

اور (بعض مرتبہ یوں کہا جاتا ہے) "وهو أعلم بهذا الشان من ابنه رَضِيَ اللّٰهُ عَنهُما"

---

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: مصنف ابن أبي شيبة، رقم: ۷۵۵۰(۱۵۱/۲) مكتبة الرشد، الرياض سنة النشر ۱٤۰۹ھ، وعمدة القاری،(۵۵۹/۳) وفتح الباری(۵٦۹/۱)

(۲) من اراد فليراجع فی فتح الباری، ج:۱، ص:۵۲۲ و ۵٦۹، عربی عبارت کا ترجمہ یہ ہے کہ یہاں غلطی واقع ہوئی اور یہ مقام اشکال سے خالی نہیں۔

کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول کی زیادہ اقتدا کرنی چاہئے بنسبت ان کے بیٹے کے!

اور اگر کہیں ایسا ہو تو کہ ایک حدیث صحیح بخاری کی ہو لیکن ایک حدیث سعید بن منصور کی ہو تو پھر کہا جائے گا کہ صاحب بخاری کا سعید بن منصور کی روایت سے کیا مقابلہ۔ سعید بن منصور کی روایت کہاں اور بخاریؒ کی روایت کہاں! لیکن یہاں پر بخاری کی روایت جو ہے اس کی کوئی قیمت نہ رہی اور سعید بن منصور کی روایت کی بنیاد پر یہ کہہ دیا کہ ایسا کرنا شرک ہے۔

تبرک بآثار الانبیاء کا انکار غلو اور مکابرہ ہے

در حقیقت یہ بالکل غلو ہے اور دلائلِ شریعہ سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ احادیث میں آثار الانبیاء سے تبرک حاصل کرنے کے اتنے دلائل اور اتنے واقعات ہیں کہ ان کا انکار سوائے مکابرہ کے اور کچھ نہیں۔ ایک حدیث تو آپ یہ دیکھ رہے ہیں کہ کس کس طرح حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے جزری سے یہ بتایا کہ یہاں پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی تھی لہٰذا پڑھو، اور یہ واقعات آپ پیچھے پڑھ آئے ہو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم اطہر سے کوئی تھوک یا ریزش نہیں گرتی تھی، یہاں تک کہ لوگ اسے اپنے جسموں پر مل لیتے تھے، اب کہہ دو کہ یہ بھی شرک تھا؟

دلائل جوازِ تبرک

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم سے مس کی ہوئی چیز کو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اپنے جسم پر مل رہے ہیں یہ تبرک نہیں تو اور کیا تھا؟ پھر خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ریش مبارک کے بال صحابہ میں تقسیم کیے تو اس تقسیم کرنے کا مقصد کیا تھا؟ اگر تبرک بآثار الانبیاءؑ جائز نہیں ہوتا تو خود آپ علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کیوں تقسیم فرماتے، نیز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان تبرکات کا ایسا تحفظ فرمایا کہ وہ پانی جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کلی فرمائی تھی وہ تقسیم فرما رہے تھے۔ اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کا ذکر پیچھے گزرا ہے ان سے فرمایا کہ اپنی ماں کے واسطے کچھ بچا کے رکھنا۔(۱)

وہی اُم سلمہ رضی اللہ عنہا ہیں کہ انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک موئے مبارک ایک شیشی کے اندر محفوظ رکھا ہوا تھا اور اس میں پانی ڈالا ہوا تھا۔ بخاری شریف میں کتاب اللباس میں یہ روایت ہے، تو سارے شہر میں جب کوئی بیمار ہوتا تو وہ اپنے ایک پیالے میں پانی رکھ کر حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں بھیجتے اور ان سے درخواست کرتے کہ آپ اس موئے مبارک کو ہمارے پانی میں بھی ڈال دیجئے تو وہ پانی جو شیشی میں ہوتا جس میں موئے مبارک تھا وہ اس پیالے میں ڈال دیتیں اور وہ لے جا کر اس

(۱) صحیح البخاری، کتاب المغازی، غزوة الطائف فی شوال سنة ثمان، رقم: ٤٣٣٨

مریض کو استشفاء پلاتے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم باقاعدہ ان کے پاس بھیج رہے ہیں اور اُم سلمہ رضی اللہ عنہا یہ تبرک استشفاء کے لئے کرتی تھیں۔ (۱)

حضرت اُم سلیم رضی اللہ عنہا حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ ہیں۔ ان کی روایت بخاری، کتاب الاستئذان کے اندر آئے گی، وہ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ سوئے ہوئے تھے، گرمی کا موسم تھا تو آپ کے جسم اطہر سے پسینہ بہنے لگا تو میں جلدی سے ایک شیشی لے کر آئی اور جو پسینہ آپ کے جسم اطہر سے بہہ رہا تھا اس کو میں نے شیشی کے اندر جمع کر کے محفوظ کرلیا تو جتنی بہتر سے بہتر خوشبو کسی عطر میں ہوسکتی ہے وہ اس پسینہ مبارک میں تھی اور لوگ مجھ سے کہتے تھے کہ ہم اپنی حنوط کو اس کے ساتھ تھوڑا سا مس کرلیں اور لوگ لے جایا کرتے تھے۔ (۲)

مسلم شریف کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ جب آپ ﷺ بیدار ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ یہ کیا کررہی ہو؟ تو انہوں نے کہا کہ یارسول اللہ! "اتبرك بها" کہ یہ میں اپنے بچوں کے واسطے تبرک جمع کررہی ہوں، فقَالَ رسولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "اصبت" (۳)

او کما قالَ علیه الصلوٰة والسلام.

آپ نے اس کی تصویب فرمائی تو حضور اکرم ﷺ کی تقریر بھی ثابت ہوگئی، فما ذا بعد الحق الا الضلال.

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ جب حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ موئے مبارک تقسیم فرمارہے تھے اس وقت انہوں نے ان سے آنحضرت ﷺ کی پیشانی کے چند بال لے لیے تھے جو انہوں نے اپنی ٹوپی سے لگالیے تھے اور اس ٹوپی کو پہن کر جنگوں میں شریک ہوتے اور فتحیاب ہوتے۔ جنگِ یمامہ میں وہ ٹوپی گرگئی تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اس کو حاصل کرنے کے لئے اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر نہایت زوردار حملہ کیا۔ (۴)

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے آپ ﷺ نے فرمایا تھا جو کتاب الاشربۃ میں مذکور ہے کہ حضور اکرم ﷺ جب سقیفہ بنی ساعدہ میں تشریف فرما تھے تو آپ نے حضرت سہل بن سعد سے فرمایا کہ بھائی ذرا پانی پلاؤ، وہ ایک پیالہ لے کر آئے اور رسول کریم ﷺ کو پانی پلایا تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس پیالے کو اُٹھا کر محفوظ کردیا۔ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ نے اس کے بعد جب حدیث سنائی تو وہ کہتے ہیں

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب اللباس، باب ما یذکر فی الشیب، رقم: ۵۸۹۶، ۵۸۹۷

(۲) صحیح البخاری، کتاب الاستئذان، باب من زار قوما فقَالَ عندهم، رقم: ۶۳۸۱

(۳) صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب طیب عرق النبی صلی الله علیه وسلم والتبرك به، رقم: ۴۳۰۱

(۴) مستدرك الحاکم، رقم: ۵۳۰۵، المعجم الکبیر، رقم: ۳۷۱۴

کہ میں وہ پیالہ نکال کر لایا کہ دیکھو! یہ پیالہ ہے میں نے جس میں نبی کریم ﷺ کو پانی پلایا تھا تو سب نے کہا کہ ہم بھی اس میں پئیں گے تو ہر ایک نے اس میں پانی پیا اور اس پیالہ کو باقاعدہ اہتمام کے ساتھ صحابہ کرامؓ و تابعینؒ نے محفوظ رکھا۔ یہ سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے۔ (۱)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں (ان کی حدیث حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے "الاصابة في تمييز الصحابة" میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کے حالات میں صحیح ابن السکن کے حوالے سے نقل کی ہے) کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ایک پیالہ رکھا ہوا تھا جس میں حضور اکرم ﷺ نے پانی پیا تھا تو وہ ٹوٹنے لگا تو اس کو زنجیر سے باندھ کر یعنی اس میں ٹکے لگا کر اس کو محفوظ رکھا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم باقاعدہ اس کے ٹکے لگا لگا کر محفوظ رکھ رہے ہیں۔ (۲)

یہ ایک دو واقعے نہیں، بے شمار واقعات ہیں۔

حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ جن کو نبی کریم ﷺ نے اذان سکھائی تھی کہ ساری عمر اپنے بال نہیں منڈوائے اس واسطے کہ نبی کریم ﷺ کے دست مبارک نے اُن کو مس کیا تھا۔ (۳)

یہ عشق کی باتیں ہیں، یہ خشک مزاج لوگوں کی عقل میں نہیں آتیں، لیکن یہ ساری تفصیل احادیث کے اندر موجود ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو آپ دیکھ رہے ہیں، عمر بن شبہ نے اخبار مدینہ میں روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے سارے مدینہ منورہ میں اور اس کے ماحول میں جتنی مسجدیں تھیں جس میں نبی کریم ﷺ کا نماز پڑھنا ثابت ہے ایک ایک آدمی سے پوچھ کر تحقیق کر کے جہاں حضور ﷺ نے نماز پڑھی تھی اس کے اوپر پتھر لگوائے تھے کہ یہ مسجد ہے جس میں حضور اکرم ﷺ نے نماز پڑھی ہے۔ (۴)

یہ سب کام بے کار اور مشرکانہ تھے؟ اور کیا سب شرک کا ارتکاب کرتے تھے؟

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے منع کرنے کی وجہ

اب یہ بات کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے منع کیا تھا تو بھائی منع کرنے کے اسباب ہوتے

(۱) صحيح البخاری، كتاب الاشربة، باب شرب من قدح النبی صلى الله عليه وسلم وآنية، رقم: ١٢١٣، ٥٦٣٧

(۲) هكذا لفظ البخاری، فی كتاب الاشربة، باب الشرب من قدح النبی صلى الله عليه وسلم وآنية، رقم: ٥٦٣٨

(۳) المستدرك على الصحيحين(٣/٥٨٩) رقم: ٦١٨١، دارالنشر دارالمكتب العلمية، بيروت، ١٤١١هـ، ١٩٩٠ء.

(٤) انظر: فتح الباری(١/٥٧١) وعمدة القاری(٣/٥٦٨)

ہیں۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے منع اس لئے کیا تھا کہ اہلِ کتاب کے طریقے پر کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ ان اماکن ہی کو نافع اور ضار سمجھنے لگیں، یا ان کے اندر نماز پڑھنے کو واجب سمجھیں اور فرائض کو ترک کرکے اس کی طرف زیادہ متوجہ ہو جائیں، یہ بیشک منع ہے۔ (۱)

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نفس تبرک بالمآثر کے منکر نہیں تھے

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جہاں یہ بات ہے وہاں ایک اور بات بھی ہے جو کتاب المغازی میں مذکور ہے کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک نیزہ تھا جس سے ابوذات الکرش کو قتل کیا تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وہ نیزہ رہا اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اُٹھا کر اپنے پاس رکھا۔ جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا وصال ہوا تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ وہ نیزہ اپنے پاس لے گئے تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تمہارے پاس وہ نیزہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھا ہوا تھا تو انہوں نے کہا کہ جی ہاں، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے دے دو میں اپنے پاس رکھوں گا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہ نیزہ ساری عمر اپنے پاس رکھا اور جب ان کا وصال ہوا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وہ نیزہ مانگا۔

تو یہ نیزہ ہی تو تھا لیکن اس کی اتنی حفاظت اور اتنا تحفظ؟ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جیسا آدمی اس کی حفاظت کر رہا ہے تو وہ کیوں؟ عنزہ کا لفظ آتا ہے اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے وہ اُٹھا کر رکھا تو معلوم ہوا کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ بھی نفس تبرک بالمآثر کے منکر نہیں تھے۔ وہ وہی عنزہ اُٹھا کر کیوں رکھتے، دنیا میں اس نام کے ہزاروں عنزے تھے۔

ہمارے ہاں بھی ایک میزائل کا نام عنزہ رکھا ہوا ہے، یہ اسی کے نام پر رکھا ہوا ہے۔ تو درحقیقت وہ عنزہ چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہا تھا، اس وجہ سے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کو اپنے پاس رکھنے میں سعادت سمجھتے تھے۔ (۲)

شجرۂ بیعت رضوان کو کٹوانے کی وجہ

دوسرا واقعہ جو ان کا مشہور ہے وہ یہ کہ انہوں نے شجرۂ حدیبیہ (بیعتِ رضوان جس کے نیچے ہوئی) کو کٹوا دیا تھا۔ اس میں پہلی بات تو یہ ہے جو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی روایت سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ درحقیقت جس درخت کو لوگ شجرۂ رضوان سمجھ رہے تھے اس کے شجرۂ رضوان ہونے میں شک تھا، بخاری کی روایت مغازی میں ہے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ ''ہمیں تو پتہ نہیں ہے تم جانتے ہو تو

(۱) عمدۃ القاری (۳/ ۵۶۰-۵۶۸) (۲) صحیح البخاری، کتاب المغازی، رقم: ۳۹۹۸

بتاؤ'' مطلب یہ ہے کہ ہمیں تعیین کے ساتھ وہ درخت یاد نہیں ہے تمہیں معلوم ہو تو بتاؤ کہ کونسا درخت ہے؟ (۱)

اور لوگ تعیین کے ساتھ اس کو شجرۂ رضوان سمجھ رہے تھے، اس لئے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس کو کٹوا دیا۔ (۲)

اور دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اندیشہ ہوا کہ لوگ اس کو باقاعدہ عرس کی جگہ نہ بنالیں تو اس واسطے انہوں نے کٹوا دیا، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کسی بھی آثر کو باقی نہ رکھا جائے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو روایتیں میں نے پیش کی ہیں یہ اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ تبرک بآثار الانبیاء والصالحین جائز ہے اور ثابت ہے۔ (۳)

آثار انبیاء کے تبرکات کا مقصد

ان مشاہد اور تبرکات کا حاصل صرف اتنا ہے کہ آدمی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسبت رکھنے والی چیز کے ساتھ ایک محبت کا اظہار کرے اور اس سے تبرک حاصل کرے، لیکن اس کو معبود سمجھ لے، العیاذ باللہ، یا اس کی عبادت شروع کردے، یا اس کے ساتھ مس کو واجب سمجھ لے، یہ حدود سے تجاوز کرنا ہے۔ (۴)

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے محسوس کیا کہ کہیں ایسا نہ ہو بعد میں لوگ ایسا کرنے لگیں، لہٰذا انہوں نے منع کر دیا، لیکن منع کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تبرکات کی کوئی سرے سے حیثیت ہی نہیں۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے تو حجر اسود کو بھی کہہ دیا تھا کہ جانتا ہوں تو صرف پتھر ہی ہے، نہ تیرے اندر نفع پہنچانے کی طاقت ہے اور نہ تیرے اندر نقصان پہنچانے کی طاقت ہے لیکن میں تجھے اس لئے بوسہ دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ کو تجھے بوسہ دیتے دیکھا ہے۔ (۵)

---

(۱) صحيح البخاری، كتاب المغازی، باب غزوة الحديبية، رقم: ٤١٦٢، ٤١٦٣، ٤١٦٤، ٤١٦٥

(۲) مصنف ابن ابی شيبة(١٥٠/٢)، والطبقات الكبری(١٠٠/٢) وفتح الباری(٤٤٨/٧)وعمدة القاری(١٩١/١٢)

(۳) عمدة القاری(٥٣٦/٢)

(٤) عمدة القاری(١٩١/١٠)

(٥) سنن الترمذی، باب ما جاء فی تقبيل الحجر، رقم: ٨٦٠، وصحيح البخاری، كتاب الحج، باب ما ذكر فی الحجر الاسود، رقم: ١٥٩٧، و باب الرمل فی الحج والعمرة، رقم: ١٦٠٥ وباب تقبيل الحجر، رقم: ١٦١٠

ان کی نگاہ اس پر گئی کہ کہیں لوگ دوسری طرف غلو میں مبتلا نہ ہو جائیں، اس واسطے انہوں نے اس کو روکا، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ تبرکات کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔

تبرکات مٹاؤ والے مؤقف کی حقیقت

لہٰذا یہ جو مؤقف اختیار کیا ہے کہ تبرکات کو مٹاؤ یہ بالکل غلو ہے اور تشدد فی الدین ہے اور دلائل واضحہ کے خلاف اور مکابرہ ہے، ہاں یہ بات ضرور ہے کہ یہ تبرک تبرک ہی کی حد میں رہنا چاہئے، اس سے آگے بڑھ کر عبادت نہ سمجھا جائے کہ تبرک کو عبادت بنالیں اور آدمی اسی کو نافع وضار سمجھنے لگیں اور تعظیم ایسی کرنے لگیں کہ عبادت کے ساتھ مشابہ ہو جائے تو یہ باتیں منع ہیں اور غلو ہے اور بعض جگہ شرک کی حد تک پہنچ جاتی ہیں تو اس وجہ سے جہاں اس بات کا خطرہ ہو اور وہاں ممکن ہو تو اس جگہ لوگوں کو ایسا کرنے سے روک لیں، بس حد میں رہنے کا پابند بنایا جائے اور جہاں ممکن نہ ہو تو وہاں سد ذریعہ کے طور پر یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ بالکل رک جاؤ، یہ وہاں ہے جہاں لوگ حدود کے پابند نہیں رہیں گے، لیکن اس کو مطلق شرک قرار دینا اور آثار کو جان بوجھ کر مٹانا یہ بڑی زیادتی کی بات ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ کے آثار کو ایک ایک کر کے مٹایا جا رہا ہے۔

بھئی! تم نے روضۂ اقدس پر قابو پایا ہے کہ نہیں پایا، کہ روضۂ اقدس پر بھی لوگ شرک کرتے تھے، وہاں جا کر بدعات کرتے تھے، لیکن آدمی کھڑے کر دیئے، مجال ہے کہ کوئی آدمی ہاتھ باندھ کر بھی کھڑا ہو جائے، اس کی بھی اجازت نہیں دیتے کہ ہاتھ نیچے کر دو، وہاں پر پابندی لگائی ہوئی ہے لیکن تم نے غلو اور شرک کے اندیشہ سے بند نہیں کیا ہے تو جو کام وہاں کر رہے ہو دوسرے آثار پر بھی کر سکتے ہو، اس واسطے غلو اور بدعات کو روکو، لیکن آثار کو ضائع کرنا اور باقاعدہ ختم کرنا اور اس کو مشن بنالینا یہ اتنی افسوسناک بات ہے کہ کوئی حدِ احساس نہیں۔

چودہ صدیوں سے اُمت نے نبی کریم ﷺ کے ایک ایک آثار کو محفوظ رکھا، ایک ایک یادگار کو اپنے سینہ سے لگا کر رکھا کہ کوئی آدمی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، کوئی دوسری قوم اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی تھی، ''خوخۂ ابوبکر'' کو محفوظ رکھا، یہ نہیں کہ شرک کی وجہ سے، ارے عشق بھی کوئی چیز ہوتی ہے، محبت بھی ہوتی ہے، تعلق خاطر بھی ہوتی ہے۔ آدمی جب ان یادگاروں کو دیکھتا ہے تو ان واقعات کو یاد کرتا ہے اور نبی کریم ﷺ اور ان کی سیرت طیبہ کو یاد کرتا ہے، اس سے استحضار ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں اللہ تبارک وتعالیٰ رسول کریم ﷺ کی محبت میں اضافہ فرماتے ہیں۔

چودہ صدیوں تک جن چیزوں کو محفوظ رکھا گیا ان کو یک لخت اُٹھا کر ختم کر دیا، جب سے یہ برسرِ اقتدار آئے ایک ایک کر کے سب مٹا دیئے، یعنی رفتہ رفتہ کر کے، ایک دم سے سارے نہیں

مٹائے، سوچا کہ لوگ ہنگامہ نہ کردیں، اس لئے رفتہ رفتہ کرکے کبھی ایک مٹایا، کبھی دوسرا، اس طرح کرکے سب ختم کردیئے، کوئی باقی نہیں چھوڑا۔

مستند تبرکات

جہاں سرکارِ دوعالم ﷺ کے تبرکات محفوظ کیے گئے ہیں، یوں تو دنیا کے مختلف حصوں میں آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب تبرکات پائے جاتے ہیں، لیکن مشہور یہ ہے کہ استنبول میں محفوظ یہ تبرکات زیادہ مستند ہیں۔ ان میں سرکارِ دوعالم ﷺ کا جبہ مبارک، آپ ﷺ کی دو تلواریں، آپ ﷺ کا وہ جھنڈا جس کے بارے میں مشہور یہ ہے کہ وہ غزوۂ بدر میں استعمال کیا گیا تھا، موئے مبارک، دندانِ مبارک، مقوقس شاہِ مصر کے نام آپ ﷺ کا مکتوبِ گرامی اور آپ ﷺ کی مہر مبارک شامل ہیں۔

تاریخی واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تبرکات بنوعباس کے خلفاء کے پاس موجود تھے، چنانچہ یہ آخری عباسی خلیفہ المتوکل کے حصے میں بھی آئے تھے، وہ آخر میں مصر کے اندر مملوک سلاطین کے زیرِ سایہ زندگی بسر کررہا تھا، اقتدار و اختیار میں اس کا کوئی حصہ نہ تھا۔ دسویں صدی ہجری میں جب حجاز اور مصر کے علاقوں نے عثمانی سلطان سلیم اوّل کی سلطنت تسلیم کرلی اور اسے ''خادم الحرمین شریفین'' کا منصب عطا کیا گیا تو عباسی خلیفہ المتوکل نے ''خلافت'' کا منصب بھی سلطان سلیم کو سونپ دیا، اور مقاماتِ مقدسہ و حرمین شریفین کی کنجیاں اور یہ تبرکات بھی بطورِ سندِ خلافت اُن کے حوالے کردیئے۔ اسی کے بعد سے سلاطین عثمان کو ''خلیفہ'' اور ''امیر المؤمنین'' کا لقب مل گیا، اور پوری دنیائے اسلام نے اُن کی یہ حیثیت کسی اختلاف کے بغیر تسلیم کرلی۔

اس طرح سلطان سلیم دسویں صدی ہجری میں یہ تبرکات مصر سے استنبول لے کر آئے، اور یہ اہتمام کیا کہ ''توپ کاپے سرائے'' میں ان کو محفوظ رکھنے کے لئے ایک مستقل کمرہ تعمیر کیا۔ سلطان کی طرف سے ان تبرکات کی قدردانی اور ان سے عشق و محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب تک سلطان سلیم زندہ رہے استنبول میں مقیم رہنے کے دوران اس کمرے میں خود اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیتے اور اس کی صفائی کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اس کمرے میں انہوں نے حفاظِ قرآن کو مقرر کیا کہ چوبیس گھنٹے یہاں تلاوت کرتے رہیں۔ حفاظ کی باریاں مقرر تھیں۔ ایک جماعت کا وقت ختم ہونے سے پہلے دوسری جماعت آکر تلاوت شروع کردیتی تھی۔ اس طرح یہ سلسلہ بعد کے خلفاء نے بھی جاری رکھا۔ اس طرح دنیا میں شاید یہ واحد جگہ ہو جہاں چار سو سال تک تلاوتِ قرآن ہوتی رہی، اس دوران ایک لمحہ کے لئے بھی بند نہیں ہوئی۔ خلافت کے خاتمے کے بعد یعنی کمال اتاترک نے

یہ سلسلہ بند کردیا۔

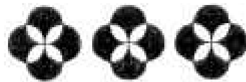
ان تبرکات کو انتہائی نفیس لکڑی کے صندوقوں میں رکھا گیا ہے، اور سال بھر میں صرف ایک بار رمضان کی ستائیسویں شب میں باہر نکال کر ان کی زیارت کرائی جاتی ہے، عام دن میں یہ تبرکات صندوقوں میں بند رہتے ہیں، بس صرف صندوق ہی دیکھے جاسکتے ہیں۔ بہرحال اُس ظرف کی زیارت بھی ایک نعمت عظمیٰ ہے جسے ان کی صحبت ومساس کا شرف حاصل ہو سعادت سے خالی نہیں ہے۔

درجۂ استناد کے لحاظ سے ان تبرکات کی جو بھی حیثیت ہو، لیکن ایک اُمتی کے لئے اس نسبت کی سچائی کا احتمال، اور صرف احتمال بھی کیا کم ہے!

اسی کمرے میں کچھ اور تبرکات بھی رکھے ہوئے ہیں جو شوکیسوں میں محفوظ ہیں، اور شفاف شیشوں کے واسطے سے ان کی زیارت کی جاسکتی ہے۔ ان میں ایک تلوار حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف منسوب ہے، چار تلواریں چاروں خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی طرف منسوب ہیں، ان کے علاوہ حضرت خالد بن ولید، حضرت جعفر طیار، حضرت عمار بن یاسر اور حضرت ابوالحسین رضی اللہ عنہم کی طرف منسوب تلواریں بھی رکھی ہوئی ہیں۔ ایک حصہ میں کعبہ شریف کے دروازے کا ایک ٹکڑا، کعبہ شریف کا قفل اور چابیاں، میزابِ رحمت کے دو ٹکڑے اور وہ تھیلا بھی محفوظ ہے جس میں کسی زمانے میں حجرِ اسود رکھا گیا تھا، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس کی مٹی بھی موجود ہے، لیکن محققین کا کہنا ہے کہ تلواروں کی نسبت مشکوک ہے۔ (۱)

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے وصیت فرمائی تھی کہ میرے پاس حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک بال رکھا ہوا ہے، جب میں مروں تو مرنے کے بعد وہ میرے منہ میں رکھ دینا اور اس کے ساتھ مجھے دفن کردینا، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا کہ دفن کے وقت ان کے منہ میں موئے مبارک رکھا ہوا تھا، یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ تبرک بآثار الانبیاء والصالحین جائز ہے اور ثابت ہے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.



(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "جہانِ دیدہ" ص: ۳۳۸

بیماری اور پریشانی ایک نعمت ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

اما بعد!

"فقد قَالَ النبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: ((أَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً اَلْاَنْبِیَاءُ ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَل)) (۱)

پریشان حال کے لئے بشارت

اس حدیث میں اس شخص کے لئے بشارت ہے جو مختلف پریشانیوں میں اور تکلیفوں میں مبتلا ہو اور ان پریشانیوں کے باوجود اس کا رابطہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہو اور وہ دعا کے ذریعہ اپنی اس تکلیف اور پریشانی کو دور کرنے کی فکر کر رہا ہو۔ ایسے شخص کے لئے اس حدیث میں بشارت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت میں اور اپنے فضل و کرم سے یہ تکلیف دی ہے اور اس تکلیف کا منشاء اللہ تعالیٰ کی ناراضگی نہیں ہے۔

پریشانیوں کی دو قسمیں

جب انسان کسی پریشانی میں ہو، یا کسی بیماری یا تکلیف میں ہو، یا افلاس اور تنگ دستی میں ہو، یا قرض کی پریشانی یا بیروزگاری کی پریشانی میں ہو، یا گھر کی طرف سے پریشانی ہو، اس قسم کی جتنی پریشانیاں جو انسان کو دنیا میں پیش آتی ہیں یہ دو قسم کی ہوتی ہیں۔ پہلی قسم کی پریشانیاں وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے قہر اور عذاب ہوتا ہے۔ گناہوں کی اصل سزا تو انسان کو آخرت میں ملنی ہے۔ لیکن بعض اوقات اللہ تعالیٰ انسان کو دنیا میں بھی عذاب کا مزہ چکھا دیتے ہیں۔ جیسے قرآن کریم میں ارشاد ہے:

☆ اصلاحی خطبات (۷/ ۱۰۷۔ ۱۲۸)، ۲۳ اگست ۱۹۹۶ء، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔

(۱) کنز العمال، رقم: ۶۷۸۳

﴿وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾ (۱)

'' آخرت میں جو بڑا عذاب آنے والا ہے ہم اس سے پہلے دنیا میں بھی تھوڑا سا عذاب چکھا دیتے ہیں تاکہ یہ لوگ اپنی بداعمالیوں سے باز آجائیں''

اور دوسری قسم کی تکالیف اور پریشانیوں وہ ہوتی ہیں جن کے ذریعہ بندے کے درجات بلند کرنے ہوتے ہیں۔ اور اس کے درجات کی بلندی اور اس کو اجر وثواب دینے کے لئے اس کو تکلیفیں دی جاتی ہیں۔

''تکالیف'' اللہ کا عذاب ہیں

لیکن دونوں قسم کی پریشانیوں اور تکالیف میں فرق کس طرح کریں گے کہ یہ پہلی قسم کی پریشانی ہے یا دوسری قسم کی پریشانی ہے؟ ان دونوں قسموں کی پریشانیوں اور تکالیف کی علامات الگ الگ ہیں۔ وہ یہ کہ اگر انسان ان تکالیف کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا چھوڑ دے اور اس تکلیف کے نتیجے میں وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کا شکوہ کرنے لگے، مثلاً یہ کہنے لگے کہ (نعوذ باللہ) اس تکلیف اور پریشانی کے لئے میں ہی رہ گیا تھا؟ میرے اُوپر یہ تکلیف کیوں آرہی ہے؟ یہ پریشانی مجھے کیوں دی جارہی ہے؟ وغیرہ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیئے ہوئے احکام چھوڑ دے، مثلاً پہلے نماز پڑھتا تھا اب تکلیف کی وجہ سے نماز پڑھنا چھوڑ دیا، یا پہلے ذکر واذکار کے معمولات کا پابند تھا، اب وہ معمولات چھوڑ دیئے اور اس تکلیف کو دور کرنے کے لئے دوسرے ظاہری اسباب تو اختیار کررہا ہے لیکن اللہ تعالیٰ سے توبہ واستغفار نہیں کرتا، دعا نہیں کرتا، یہ اس بات کی علامات ہیں کہ جو تکلیف اس پر آئی ہے یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس انسان پر قہر اور عذاب ہے اور سزا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مؤمن کو اس سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

''تکالیف'' اللہ کی رحمت بھی ہیں

اور اگر تکالیف آنے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کررہا ہے اور دعا کررہا ہے کہ یا اللہ! میں کمزور ہوں، اس تکلیف کو برداشت نہیں کرسکتا، یا اللہ! مجھے اس تکلیف سے اپنی رحمت سے نجات دے دیجئے، اور دل کے اندر اس تکلیف پر شکوہ نہیں ہے، وہ اس تکلیف کا احساس تو کررہا ہے، رو بھی رہا ہے، رنج اور غم کا اظہار بھی کررہا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر شکوہ نہیں کررہا ہے بلکہ اس تکلیف میں وہ پہلے سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کررہا ہے، پہلے سے زیادہ نمازیں پڑھ رہا ہے، پہلے

(۱) السجدة: ۲۱

سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگ رہا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ تکلیف اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور ترقی درجات ہے اور یہ تکالیف اس کے لئے اجر و ثواب کا باعث ہیں، اور یہ تکلیف بھی اس کے لئے رحمت ہے، اور یہ اس انسان کے ساتھ اللہ کی محبت کی دلیل اور علامت ہے۔

کوئی شخص پریشانی سے خالی نہیں

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب کسی کو دوسرے سے محبت ہوتی ہے تو محبت میں تو اس کو آرام پہنچایا جاتا ہے، راحت دی جاتی ہے، تو جب اللہ تعالیٰ کو اس بندے سے محبت ہے تو اس بندے کو آرام پہنچانا چاہئے، پھر اللہ تعالیٰ اس کو تکلیف کیوں دے رہے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں ہے جس کو کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی تکلیف نہ پہنچے، کوئی نہ کوئی صدمہ اور پریشانی نہ ہو، چاہے وہ بڑے سے بڑا نبی اور پیغمبر ہو، ولی اور صوفی ہو، یا بادشاہ ہو، یا سرمایہ دار ہو، ایسا نہیں ہوسکتا ہے کہ وہ دنیا میں تکلیف کے بغیر زندگی گزارے، اس لئے کہ یہ عالم یعنی دنیا اللہ تعالیٰ نے ایسی بنائی ہے کہ اس میں غم اور خوشی، راحت اور تکلیف سب ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ خالص خوشی اور راحت کا مقام دنیا نہیں ہے۔ بلکہ وہ عالم جنت ہے۔ جس کے بارے میں فرمایا:

﴿ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴾(۱)

''یعنی وہاں نہ کوئی خوف ہے اور نہ غم ہے''

اصل خوشی اور راحت کا مقام تو وہ ہے۔ دنیا تو اللہ تعالیٰ نے بنائی ہی ایسی ہے کہ اس میں کبھی خوشی ہوگی اور کبھی غم ہوگا، کبھی سردی ہوگی کبھی گرمی ہوگی، کبھی دھوپ ہوگی کبھی چھاؤں ہوگی۔ کبھی ایک حالت ہوگی کبھی دوسری حالت ہوگی۔ لہٰذا یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص اس دنیا میں بے غم ہوکر بیٹھ جائے۔

ایک نصیحت آموز قصہ

حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ نے اپنے مواعظ میں ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک شخص کی حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات ہوگئی۔ اس شخص نے حضرت خضر علیہ السلام سے کہا کہ حضرت! میرے لئے یہ دعا فرمادیں کہ مجھے زندگی میں کوئی غم اور تکلیف نہ آئے اور ساری زندگی بے غم گزر جائے۔

حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ دعا تو میں نہیں کرسکتا، اس لئے کہ اس دنیا میں غم اور تکلیف تو آئے گی، البتہ ایک کام کرسکتا ہوں وہ یہ کہ تم دنیا میں ایسا آدمی تلاش کرو جو تمہیں سب سے زیادہ بے غم یا کم غم والا نظر آئے۔ پھر مجھے اس شخص کا پتہ بتا دینا، میں اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کردوں گا کہ اللہ تعالیٰ

(۱) البقرۃ: ۳۸

تمہیں اس جیسا بنا دے۔

یہ شخص بہت خوش ہوا کہ چلو ایسا آدمی تو مل جائے گا جو بہت زیادہ آرام اور راحت میں ہوگا اور میں اس جیسا بننے کی دعا کرالوں گا۔ اب تلاش کرنے کے لئے نکلا، کبھی ایک آدمی کے بارے میں فیصلہ کرتا کہ اس جیسا بننے کی دعا کراؤں گا۔ پھر دوسرا آدمی اس سے زیادہ دولت مند نظر آتا تو پھر یہ فیصلہ بدل دیتا کہ نہیں، اس جیسا بننے کی دعا کراؤں گا۔ غرض کافی عرصہ تک تلاش کرنے کے بعد اس کو ایک جوہری اور زرگر نظر آیا جو سونا چاندی، جواہرات اور قیمتی پتھر کی تجارت کرتا تھا۔ بہت بڑی اور آراستہ اس کی دکان تھی، اس کا محل بڑا عالی شان تھا۔ بڑی قیمتی اور اعلیٰ قسم کی سواری تھی۔ نوکر چاکر خدمت میں لگے ہوئے تھے۔ اس کے بیٹے بڑے خوبصورت اور نوجوان تھے۔ ظاہری حالات دیکھ کر اس نے اندازہ لگایا کہ یہ شخص بڑے عیش و آرام میں ہے۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ اس جیسا بننے کی دعا کراؤں گا۔ جب واپس جانے لگا تو خیال آیا کہ اس شخص کی ظاہری حالت تو بہت اچھی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ اندر سے کسی بیماری یا پریشانی میں مبتلا ہو۔ جس کی وجہ سے میری موجودہ حالت بھی ختم ہو جائے۔ اس لئے اس جوہری سے جا کر پوچھنا چاہئے کہ وہ کس حالت میں ہے۔

چنانچہ یہ شخص اس جوہری کے پاس گیا اور اس سے جا کر کہا کہ تم بڑے عیش و آرام میں زندگی گزار رہے ہو۔ دولت کی ریل پیل ہے، نوکر چاکر لگے ہوئے ہیں۔ تو میں تم جیسا بننا چاہتا ہوں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اندرونی طور پر تمہیں کوئی پریشانی لاحق ہو اور کسی بیماری یا مصیبت کے اندر مبتلا ہو؟

وہ جوہری اس شخص کو تنہائی میں لے گیا اور اس سے کہا کہ تمہارا خیال یہ ہے کہ میں بڑے عیش و آرام میں ہوں، بڑا دولت مند ہوں، بڑے نوکر چاکر خدمت گزاری میں لگے ہوئے ہیں۔ لیکن اس دنیا میں مجھ سے زیادہ غم اور تکلیف میں کوئی شخص نہیں ہوگا۔ پھر اس نے اپنی بیوی کی اخلاقی حالت کا بڑا عبرت ناک قصہ سناتے ہوئے کہا کہ یہ خوبصورت اور جوان بیٹے جو تمہیں نظر آرہے ہیں یہ حقیقت میں میرے بیٹے نہیں ہیں۔ جس کی وجہ سے میرا کوئی لمحہ اذیت اور پریشانی سے خالی نہیں گزرتا اور اندر سے میرے دل میں غم اور صدمہ کی جو آگ سلگ رہی ہے تم اس سے واقف نہیں ہو۔ اس لئے میرا جیسا بننے کی ہرگز دعا مت کرانا۔ اب اس شخص کو پتہ چلا کہ جتنے لوگ مال و دولت اور عیش و آرام میں نظر آرہے ہیں وہ کسی نہ کسی مصیبت اور پریشانی میں گرفتار ہیں۔

جب دوبارہ حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے پوچھا کہ ہاں بتاؤ تم کس جیسا بننا چاہتے ہو؟ اس شخص نے جواب دیا کہ مجھے کوئی بھی شخص غم اور پریشانی سے خالی نظر نہیں آیا جس کے جیسا بننے کی دعا کراؤں۔

حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اس دنیا میں کوئی بھی شخص

تمہیں بے غم نظر نہیں آئے گا۔ البتہ میں تمہارے لئے یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں عافیت کی زندگی عطا فرمائے۔

ہر شخص کو دولت الگ الگ دی گئی ہے

اس دنیا میں کوئی بھی شخص صدمے، غم اور تکلیف سے خالی ہو ہی نہیں سکتا۔ البتہ کسی کو کم تکلیف ہے، کسی کو زیادہ ہے، کسی کو کوئی تکلیف، کسی کو کوئی تکلیف۔ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کا نظام ہی ایسا بنایا ہے کہ کسی کو کوئی دولت دے دی ہے اور کسی سے کوئی دولت لے لی ہے۔ کسی کو صحت کی دولت دے دی ہے لیکن روپیہ پیسہ کی دولت سے محروم ہے۔ کسی کو روپیہ پیسہ کی دولت حاصل ہے تو صحت کی دولت سے محروم ہے۔ کسی کے گھر کے حالات اچھے ہیں لیکن معاشی حالات خراب ہیں۔ کسی کے معاشی حالات اچھے ہیں لیکن گھر کی طرف سے پریشانی ہے۔ غرض ہر شخص کا اپنا الگ حال ہے۔ اور ہر شخص کسی نہ کسی تکلیف اور پریشانی میں گھرا ہوا ہے۔ لیکن اگر یہ پریشانی پہلی قسم سے ہے تو یہ اس کے لئے عذاب ہے اور اگر دوسری قسم سے ہے تو یہ اس کے لئے رحمت اور باعثِ اجر و ثواب ہے۔

محبوب بندے پر پریشانی کیوں؟

ایک حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

((اِذَا أَحَبَّ اللّٰهُ عَبْدًا صَبَّ عَلَيْهِ الْبَلَاءَ صَبًّا)) (۱)

یعنی جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت فرماتے ہیں تو اس پر مختلف قسم کی آزمائشیں اور تکالیف بھیجتے ہیں۔ وہ آزمائشیں اور تکالیف اس پر بارش کی طرح برستی ہیں۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ فرشتے پوچھتے ہیں کہ یا اللہ! یہ تو آپ کا محبوب بندہ ہے، نیک بندہ ہے، آپ سے محبت کرنے والا ہے، تو پھر اس بندے پر اتنی آزمائشیں اور تکالیف کیوں بھیجی جا رہی ہیں؟ جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس بندے کو اسی حال میں رہنے دو، اس لئے کہ مجھے یہ بات پسند ہے کہ میں اس کی دعا کی اور اس کی گریہ وزاری اور آہ و بکا کی آواز سنوں۔ یہ حدیث اگرچہ سند کے اعتبار سے کمزور ہے لیکن اس معنی کی متعدد احادیث آئی ہیں۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ میرے بندے کے پاس جاؤ اور اس کو آزمائش میں مبتلا کرو، اس لئے کہ میں اس کی آہ و بکا اور اس کی گریہ وزاری کی آواز سننا پسند کرتا ہوں۔ بات وہی ہے کہ دنیا میں تکالیف اور پریشانیاں تو آنی ہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ میرا محبوب بندہ ہے، میں اس کے لئے تکلیف کو دائمی راحت کا ذریعہ بنانا

(۱) کنز العمال، رقم: ۶۸۱۱، جامع الأحادیث، رقم: ۱۱۲۹، الجامع الکبیر للسیوطی، رقم: ۱۱۴۰

چاہتا ہوں اور تا کہ اس کا درجہ بلند ہو جائے۔ اور جب آخرت میں میرے پاس پہنچے تو گناہوں سے بالکل پاک و صاف ہو کر پہنچے، اس لئے اپنے محبوب اور اپنے پیاروں کو تکالیف اور پریشانیاں عطا فرماتے ہیں۔

صبر کرنے والوں پر انعامات

اس کائنات میں انبیاء علیہم السلام سے زیادہ محبوب تو اللہ تعالیٰ کا کوئی اور ہو نہیں سکتا لیکن ان کے بارے میں حدیث شریف میں ہے کہ:

((أَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً ٱلْأَنْبِيَاءُ ثُمَّ الْأَمْثَلُ فَالْأَمْثَلُ))(۱)

یعنی اس دنیا میں سب سے زیادہ آزمائشیں انبیاء علیہم السلام پر آتی ہیں۔ پھر اس کے بعد جو شخص انبیاء علیہم السلام سے جتنا زیادہ قریب ہوتا ہے اور جتنا تعلق رکھنے والا ہوتا ہے اس پر اتنی ہی آزمائشیں زیادہ آئیں گی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھئے! جن کا لقب ہے "خلیل اللہ" اللہ کا دوست۔ لیکن ان پر بڑی بڑی بلائیں اور بڑی بڑی مصیبتیں آئیں۔ چنانچہ آگ میں ان کو ڈالا گیا۔ بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم ان کو دیا گیا۔ بیوی بچے کو ایک بے آب و گیاہ وادی میں چھوڑنے کا حکم ان کو دیا گیا۔ غرض کہ یہ بڑی بڑی آزمائشیں اُن پر آئیں۔ یہ تکالیف کیوں دی گئیں؟ تا کہ ان کے درجات بلند کیے جائیں۔ چنانچہ جب تکالیف پر قیامت کے روز اللہ تعالیٰ لوگوں کو انعام عطا فرمائیں گے تو اس وقت معلوم ہوگا کہ ان تکلیفوں کی پَر کاہ کے برابر بھی حیثیت نہیں تھی اور وہ ان تکالیف کو بھول جائیں گے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ تکالیف پر صبر کرنے والوں کو آخرت میں انعام عطا فرمائیں گے تو دوسرے لوگ ان انعامات کو دیکھ کر یہ تمنا کریں گے کہ کاش ہماری کھالیں قینچیوں سے کاٹی گئی ہوتیں اور اس پر ہم صبر کرتے تو آج ہم بھی ان انعامات کے مستحق ہوتے۔(۲)

تکالیف کی بہترین مثال

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ ان تکالیف کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی کے جسم میں کوئی بیماری ہے جس کی وجہ سے ڈاکٹر نے آپریشن کرنا تجویز کیا۔ اب مریض کو معلوم ہے کہ آپریشن میں چیر پھاڑ ہوگی، تکلیف ہوگی، لیکن اس کے باوجود

(۱) کنز العمال، رقم: ٦٧٨٣

(۲) زاد المعاد، (١٧٣/٤)

ڈاکٹر سے درخواست کرتا ہے کہ میرا آپریشن جلدی کر دو، اور دوسروں سے سفارش بھی کرا رہا ہے اور ڈاکٹر کو بھاری فیس بھی دے رہا ہے گویا کہ اس مقصد کے لئے پیسے دے رہا ہے کہ میرے اُوپر نشتر چلاؤ۔ وہ یہ سب کچھ کیوں کر رہا ہے؟ اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ یہ آپریشن کی اور نشتر چلانے کی تکلیف معمولی اور عارضی ہے۔ چند روز کے بعد زخم ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن اس آپریشن کے بعد جو صحت کی نعمت ملنے والی ہے وہ اتنی عظیم ہے کہ اس کے مقابلے میں یہ تکلیف کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اور جو ڈاکٹر چیر پھاڑ کر رہا ہے اگرچہ بظاہر تکلیف دے رہا ہے لیکن اس مریض کے لئے اس وقت میں اس سے زیادہ مشفق اور محسن کوئی اور نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ڈاکٹر آپریشن کے ذریعہ اس کے لئے صحت کا سامان کر رہا ہے۔

بالکل اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو تکلیف دیتے ہیں تو حقیقت میں اس کا آپریشن ہو رہا ہے تاکہ اس کے ذریعہ ہم اس کو پاک و صاف کرلیں اور جب یہ بندہ ہمارے پاس آئے تو گناہوں سے پاک و صاف ہو کر اور دھل کر ہمارے پاس آئے۔

تکالیف کی ایک اور مثال

یا مثلاً تمہارا ایک محبوب ہے جس سے عرصہ دراز سے تمہاری ملاقات نہیں ہوئی اور اس سے ملنے کو دل چاہتا ہے۔ کسی موقع پر اچانک وہ محبوب تمہارے پاس آیا اور تمہیں پیچھے سے پکڑ کر زور سے دبانا شروع کر دیا۔ اور اتنی زور سے دبایا کہ پسلیوں میں درد ہونے لگا۔ اب یہ محبوب اس سے کہتا ہے کہ میں تمہارا فلاں محبوب ہوں، اگر میرے دبانے سے تمہیں تکلیف ہو رہی ہے تو چلو میں تمہیں چھوڑ کر کسی اور کو دبانا شروع کر دیتا ہوں تاکہ تمہاری یہ تکلیف دور ہو جائے۔ اگر یہ شخص اپنی محبت کے دعوے میں سچا ہے تو اس وقت یہی کہے گا کہ تم اس سے زیادہ زور سے دباؤ اور زیادہ تکلیف پہنچا دو۔ اس لئے کہ میں تو مدتوں سے تمہاری ملاقات کا طالب تھا اور یہ شعر پڑھے گا کہ ؎

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

دشمن کو یہ نصیب نہ ہو کہ وہ تیری تلوار سے ہلاک ہو جائیں۔ دوستوں کا سر سلامت ہے آپ اپنا خنجر اس پر آزمائیں۔

تکالیف پر ''انا للہ'' پڑھنے والے

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو تکالیف آتی ہیں حقیقت میں ان بندوں کے درجات کی

بلندی کے لئے آتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ﴾ (۱)

"یعنی ہم تمہیں ضرور بالضرور آزمائیں گے، کبھی خوف سے آزمائیں گے، کبھی بھوک سے، کبھی تمہارے مالوں میں کمی ہو جائے گی، کبھی تمہارے اعزہ اور اقرباء میں اور ملنے جلنے والوں میں کمی ہو جائے گی، کبھی تمہارے پھلوں میں کمی ہو جائے گی۔ پھر آگے فرمایا کہ ان لوگوں کو خوشخبری سنا دو جو ان مشکل ترین آزمائشوں پر صبر کریں اور یہ کہہ دیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ہیں اور یہی لوگ ہدایت پر ہیں"

بہر حال، یہ اللہ تعالیٰ کا نظام ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو بعض اوقات اس لئے تکلیفیں دیتے ہیں تاکہ ان کے درجات بلند فرمائیں۔

ہم دوست کو تکلیف دیتے ہیں

میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ بعض اوقات بڑے وجد کے انداز میں یہ شعر پڑھا کرتے تھے کہ۔

ما پروریم دشمن و ما می کشیم دوست
کس را چوں و چرا نہ رسد در قضاء ما

یعنی بعض اوقات ہم اپنے دشمن کو پالتے ہیں اور اس کو دنیا کے اندر ترقی دیتے ہیں اور اپنے دوست کو تکلیف دیتے ہیں اور اس کو مارتے ہیں۔ ہماری قضا اور تقدیر میں کسی کو چون و چرا کی مجال نہیں۔ اس لئے کہ ہماری حکمتوں کو کون سمجھ سکتا ہے

ایک عجیب وغریب قصہ

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مواعظ میں ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک شہر میں دو آدمی

(۱) البقرۃ: ۱۵۵-۱۵۷

بسترِ مرگ پر تھے۔ مرنے کے قریب تھے۔ ایک مسلمان تھا اور ایک یہودی تھا۔ اس یہودی کے دل میں مچھلی کھانے کی خواہش پیدا ہوئی اور مچھلی قریب میں کہیں ملتی نہیں تھی۔ اور اس مسلمان کے دل میں روغنِ زیتون کھانے کی خواہش پیدا ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں کو بلایا۔ ایک فرشتے سے فرمایا کہ فلاں شہر میں ایک یہودی مرنے کے قریب ہے اور اس کا دل مچھلی کھانے کو چاہ رہا ہے۔ تم ایسا کرو کہ ایک مچھلی لے کر اس کے گھر کے تالاب میں ڈال دو تا کہ وہ مچھلی کھا کر اپنی خواہش پوری کر لے۔ دوسرے فرشتے سے فرمایا کہ فلاں شہر میں ایک مسلمان مرنے کے قریب ہے اور اس کا روغنِ زیتون کھانے کو دل چاہ رہا ہے۔ اور روغنِ زیتون اس کی الماری کے اندر موجود ہے۔ تم جاؤ اور اس کا روغن نکال کر ضائع کر دو تا کہ وہ اپنی خواہش پوری نہ کر سکے۔

چنانچہ دونوں فرشتے اپنے اپنے مشن پر چلے۔ راستے میں ان دونوں کی ملاقات ہوگئی۔ دونوں نے ایک دوسرے سے پوچھا کہ تم کس کام پر جا رہے ہو؟ ایک فرشتے نے بتایا کہ میں فلاں یہودی کو مچھلی کھلانے جا رہا ہوں۔ دوسرے فرشتے نے کہا کہ میں فلاں مسلمان کا روغن زیتون ضائع کرنے جا رہا ہوں۔ دونوں کو تعجب ہوا کہ ہم دونوں کو دو متضاد کاموں کا حکم کیوں دیا گیا؟ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم تھا اس لئے دونوں نے جا کر اپنا اپنا کام پورا کر لیا۔

جب واپس آئے تو دونوں نے عرض کیا کہ یا اللہ! ہم نے آپ کے حکم کی تعمیل تو کر لی لیکن یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ ایک مسلمان جو آپ کے حکم کو ماننے والا تھا اور اس کے پاس روغن زیتون موجود تھا، اس کے باوجود آپ نے اس کا روغن زیتون ضائع کرا دیا۔ اور دوسری طرف ایک یہودی تھا اور اس کے پاس مچھلی موجود بھی نہیں تھی، لیکن اس کے باوجود آپ نے اس کو مچھلی کھلا دی، اس لئے ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ کیا قصہ ہے؟

اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ تم کو ہمارے کاموں کی حکمتوں کا پتہ نہیں ہے، بات دراصل یہ ہے کہ ہمارا معاملہ کافروں کے ساتھ کچھ اور ہے اور مسلمانوں کے ساتھ کچھ اور ہے۔ کافروں کے ساتھ ہمارا معاملہ یہ ہے کہ چونکہ کافر بھی دنیا میں نیک اعمال کرتے رہتے ہیں، مثلاً کبھی صدقہ خیرات کر دیا، کبھی کسی فقیر کی مدد کر دی، اس کے یہ نیک اعمال اگرچہ آخرت میں ہمارے ہاں مقبول نہیں ہیں، لیکن ہم ان کے نیک اعمال کا حساب دنیا میں چکا دیتے ہیں تا کہ جب یہ آخرت میں ہمارے پاس آئیں تو ان کے نیک اعمال کا حساب چکا ہوا ہو اور ہمارے ذمے ان کی کسی نیکی کا بدلہ باقی نہ ہو۔ اور مسلمانوں کے ساتھ ہمارا معاملہ جدا ہے۔ وہ یہ کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے گناہوں کا حساب دنیا کے اندر ہی چکا دیں تا کہ جب یہ ہمارے پاس آئیں تو گناہوں سے پاک وصاف ہو کر آئیں۔

لہٰذا اس یہودی نے جتنے نیک اعمال کیے تھے ان سب کا بدلہ ہم نے دے دیا تھا، صرف ایک

نیکی کا بدلہ دینا باقی تھا۔ اور اب یہ ہمارے پاس آ رہا تھا۔ جب اس کے دل میں مچھلی کھانے کی خواہش پیدا ہوئی تو ہم نے اُس کی اِس خواہش کو پورا کرتے ہوئے اس کو مچھلی کھلادی تا کہ جب یہ ہمارے پاس آئے تو اس کی نیکیوں کا حساب چکا ہوا ہو۔ اور اس مسلمان کی بیماری کے دوران باقی سارے گناہ تو معاف ہو چکے تھے البتہ ایک گناہ اس کے سر پر باقی تھا۔ اور اب یہ ہمارے پاس آنے والا تھا۔ اگر اسی حالت میں ہمارے پاس آجاتا تو اس کا یہ گناہ اس کے نامۂ اعمال میں ہوتا۔ اس لئے ہم نے یہ چاہا کہ اس کا روغن زیتون ضائع کر کے اور اس کی خواہش کو توڑ کر اس کے دل پر ایک چوٹ اور لگائیں اور اس کے ذریعہ اس کے ایک گناہ کو بھی صاف کر دیں۔ تا کہ جب یہ ہمارے پاس آئے تو بالکل پاک و صاف ہو کر آئے۔ بہر حال، اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کا کون ادراک کر سکتا ہے۔ کیا ہماری یہ چھوٹی سی عقل ان حکمتوں کا احاطہ کر سکتی ہے؟ اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کے تحت کائنات کا یہ نظام چل رہا ہے۔ ان کی حکمتیں اس کائنات میں متصرف ہیں۔ انسان کے بس کا کام نہیں کہ وہ ان کا ادراک بھی کر سکے۔ ہمیں کیا معلوم کہ کون سے وقت میں اللہ تعالیٰ کی کون سی حکمت جاری ہے۔

یہ تکالیف اضطراری مجاہدات ہیں

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ پہلے زمانے میں لوگ جب اپنی اصلاح کرنے کے لئے کسی شیخ یا کسی بزرگ کے پاس جاتے تو وہ بزرگ اور شیخ ان سے بہت سے مجاہدات اور ریاضتیں کرایا کرتے تھے۔ یہ مجاہدات اختیاری ہوتے تھے۔ اب اس موجودہ دور میں وہ بڑے بڑے مجاہدات نہیں کرائے جاتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان بندوں کو مجاہدات سے محروم نہیں فرمایا، بلکہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے بندوں سے اضطراری اور زبردستی مجاہدہ کرایا جاتا ہے۔ اور ان اضطراری مجاہدات کے ذریعہ انسان کو جو ترقی ہوتی ہے وہ اختیاری مجاہدات کے مقابلے میں زیادہ تیز رفتاری سے ہوتی ہے، چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی میں اختیاری مجاہدات اتنے نہیں تھے۔ مثلاً ان کے یہاں یہ نہیں تھا کہ جان بوجھ کر فاقہ کیا جا رہا ہے۔ یا جان بوجھ کر تکلیف دی جا رہی ہے وغیرہ۔ لیکن ان کی زندگی میں اضطراری مجاہدات بے شمار تھے۔ چنانچہ کلمہ طیبہ پڑھنے کی پاداش میں ان کو تپتی ہوئی ریت پر لٹایا جاتا تھا، سینے پر پتھر کی سلیں رکھی جاتی تھیں، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینے کی پاداش میں ان پر نہ جانے کیسے کیسے ظلم کیے جاتے تھے، یہ سب مجاہدات اضطراری تھے۔ اور ان اضطراری مجاہدات کے نتیجے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درجات اتنے بلند ہو گئے کہ اب کوئی غیر صحابی ان کے مقام کو چھو نہیں سکتا۔ اس لئے فرمایا کہ اضطراری مجاہدات سے درجات زیادہ تیز رفتاری سے بلند ہوتے ہیں، اور انسان تیز رفتاری سے ترقی کرتا ہے۔ لہٰذا انسان کو جو تکالیف، پریشانیاں اور بیماریاں

آ رہی ہیں، یہ اضطراری مجاہدات کرائے جا رہے ہیں۔ اور جس کو ہم تکلیف سمجھ رہے ہیں، حقیقت میں وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور محبت کا عنوان ہوتی ہے۔

ان تکالیف کی تیسری مثال

مثلاً ایک چھوٹا بچہ ہے، وہ نہانے اور ہاتھ منہ دھلوانے سے گھبراتا ہے۔ اور اس کو نہانے سے تکلیف ہوتی ہے، لیکن ماں زبردستی پکڑ کر اس کو نہلا دیتی ہے۔ اور اس کا میل کچیل دور کر دیتی ہے۔ اب نہانے کے دوران وہ روتا بھی ہے، چیختا چلاتا بھی ہے، اس کے باوجود ماں اس کو نہیں چھوڑتی ہے، اب وہ بچہ تو یہ سمجھ رہا ہے کہ مجھ پر ظلم اور زیاتی ہو رہی ہے، مجھے تکلیف پہنچائی جا رہی ہے، لیکن ماں شفقت اور محبت کی وجہ سے بچے کو نہلا رہی ہے، اور اس کا میل کچیل دور کر رہی ہے، اور اس کا جسم صاف کر رہی ہے، چنانچہ جب وہ بچہ بڑا ہوگا، اس وقت اس کی سمجھ میں آئے گا کہ یہ نہلانے دھلانے کا جو کام میری ماں کرتی تھی، وہ بڑی محبت اور شفقت کا عمل تھا، جس کو میں ظلم اور زیادتی سمجھ رہا تھا۔ اگر میری ماں میرا میل کچیل دور نہ کرتی تو میں گندہ رہ جاتا۔

چوتھی مثال

یا مثلاً ایک بچے کو ماں باپ نے اسکول میں داخل کر دیا، اب روزانہ صبح کو ماں باپ زبردستی اس کو اسکول بھیج دیتے ہیں۔ اسکول جاتے وقت وہ بچہ روتا چیختا ہے، چلاتا ہے، اور سکول میں چار پانچ گھنٹے بیٹھنے کو اپنے لئے قید سمجھتا ہے۔ لیکن بچے کے ساتھ محبت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو زبردستی اسکول بھیجیں۔ چنانچہ جب وہ بچہ بڑا ہوگا تب اس کی سمجھ میں آئے گا کہ اگر بچپن میں ماں باپ زبردستی مجھے اسکول نہ بھیجتے اور مجھے نہ پڑھاتے تو آج میں پڑھے لکھوں کی صف میں شامل نہ ہوتا، بلکہ جاہل رہ جاتا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان پر جو تکالیف اور پریشانیاں آتی ہیں، وہ بھی اللہ تعالیٰ کی محبت اور شفقت کا عین تقاضا ہے۔ اور انسان کے درجات بلند کرنے کے لئے اس کو یہ تکالیف دی جا رہی ہیں۔ بشرطیکہ ان تکالیف میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی توفیق ہو جائے تو پھر سمجھ لو کہ یہ تکالیف اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت ہی رحمت ہیں۔

حضرت ایوب علیہ السلام اور تکالیف

حضرت ایوب علیہ السلام کو دیکھئے۔ کیسی سخت بیماری کے اندر مبتلا ہوئے کہ اس بیماری کے تصور

کرنے سے انسان کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، اور پھر اس بیماری کے اندر شیطان ان کے پاس آیا اور اس نے آپ کو تکلیف دینے کے لئے یہ کہنا شروع کر دیا کہ آپ کے گناہوں کی وجہ سے یہ بیماری آئی ہے اور اللہ تعالیٰ تم سے ناراض ہیں، اس لئے آپ کو اس تکلیف کے اندر مبتلا کر دیا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے غضب اور قہر کی وجہ سے آپ کو یہ تکالیف آرہی ہیں۔ اور اس پر اس نے اپنے دلائل بھی پیش کیے۔ اس موقع پر حضرت ایوب علیہ السلام نے شیطان سے مناظرہ کیا۔ بائبل کے صحیفہ ایوبی میں اب بھی اس مناظرے کے بارے میں کچھ تفصیل موجود ہے۔ چنانچہ حضرت ایوب علیہ السلام نے شیطان کے جواب میں فرمایا کہ تمہاری بات درست نہیں کہ یہ بیماری اور تکالیف میرے گناہوں کی وجہ سے اللہ کے غضب اور قہر کے طور پر آئی ہے۔ بلکہ یہ تکالیف میرے خالق اور میرے مالک کی طرف سے محبت کا عنوان ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور شفقت کی وجہ سے یہ تکالیف دے رہے ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ سے یہ دعا تو ضرور مانگتا ہوں کہ یا اللہ مجھے اس بیماری سے شفا عطا فرما دیجئے۔ لیکن مجھے اللہ تعالیٰ سے اس بیماری پر گلہ اور شکوہ نہیں ہے اور مجھے اس بیماری پر کوئی اعتراض نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ بیماری کیوں دی ہے؟ اور الحمد للہ، روزانہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہوں، اور یہ دعا کرتا ہوں:

﴿رَبِّ اِنِّی مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ﴾ (۱)

''اے اللہ! مجھے یہ تکلیف ہے، آپ ارحم الراحمین ہیں۔ اس تکلیف کو دور فرما دیجئے''

لہٰذا یہ میرا اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا بھی ان کی طرف سے عطا ہے اور جب وہ مجھے اس تکلیف کے دوران اپنی بارگاہ میں رجوع کرنے کی توفیق دے رہے ہیں تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ تکلیف بھی ان کی طرف سے رحمت اور محبت کا ایک عنوان ہے' یہ ساری باتیں ''صحیفہ ایوبی'' میں موجود ہیں۔

تکالیف کے رحمت ہونے کی علامات

اس میں حضرت ایوب علیہ السلام نے اس کی علامات بتادیں کہ کون سی تکلیف اللہ تعالیٰ کی طرف سے قہر اور عذاب ہوتی ہے اور کون سی تکلیف اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت اور انعام ہوتی ہے۔ وہ علامت یہ ہے کہ پہلی قسم کی تکلیف میں انسان اللہ تعالیٰ سے گلہ شکوہ کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر اعتراض کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع نہیں کرتا، اور دوسری قسم کی تکلیف میں اللہ تعالیٰ سے گلہ شکوہ کوئی نہیں ہوتا، لیکن دعا کرتا ہے کہ یا اللہ، میں کمزور ہوں اور اس تکلیف اور آزمائش کا متحمل نہیں ہوں، اپنی رحمت سے مجھے اس تکلیف اور آزمائش سے نکال دیجئے' لہٰذا جب کبھی صدمے کے وقت،

(۱) الانبیاء: ۸۳

تکلیف اور پریشانی کے وقت، بیماری میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی توفیق ہو جائے تو سمجھ لو کہ الحمدللہ یہ بیماری یہ پریشانی، یہ تکلیف اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت ہے، اس صورت میں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہ تکلیف بالآخر انشاء اللہ دنیا اور آخرت میں تمہارے لئے خیر کا ذریعہ بنے گی۔ بس شرط یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کی توفیق ہو جائے۔ اس لئے کہ اگر یہ تکلیف اللہ تعالیٰ کی طرف سے قہر اور غضب ہوتا تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ اس تکلیف کے اندر اپنا نام لینے اور اپنی طرف رجوع کرنے کی توفیق ہی نہ دیتے۔ جب وہ اپنی طرف رجوع کرنے کی توفیق دے رہے ہیں تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ تکلیف ان کی طرف سے رحمت ہے۔

دعا کی قبولیت کی علامت

البتہ یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ بعض اوقات جب تکلیف کے اندر اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں، اس کے باوجود وہ تکلیف اور پریشانی نہیں جاتی اور دعا قبول نہیں ہوتی، اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کرنے اور عرض معروض پیش کرنے کی توفیق مل جانا ہی اس بات کی علامت ہے کہ ہماری دعا قبول ہوگئی۔ ورنہ دعا کرنے کی بھی توفیق نہ ملتی۔ اور اب اس صورت میں تکلیف پر الگ انعام ملے گا، اور اس دعا کرنے پر الگ انعام حاصل ہوگا، اور اس دعا کے بعد دوبارہ دعا کرنے کی جو توفیق ہوگی، اس پر الگ انعام ملے گا۔ لہٰذا یہ تکلیف رفع درجات کا ذریعہ بن رہی ہے۔ اسی کے بارے میں مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"گفت آں "اللہ" تو لبیک ماست"

یعنی جس وقت تو ہمارا نام لیتا ہے اور "اللہ" کہتا ہے تو یہ تیرا "اللہ" کہنا ہی ہماری طرف سے "لبیک" کہنا ہے، اور تمہارا اللہ کہنا ہی اس بات کی علامت ہے کہ ہم نے تمہاری پکار کو سن لیا اور اس کو قبول بھی کرلیا۔ لہٰذا دعا کی توفیق ہو جانا ہی ہماری طرف سے دعا کی قبولیت کی علامت ہے۔ البتہ یہ ہماری حکمت کا تقاضا ہے کہ کب اس پریشانی کو تم سے دور کرنا ہے اور کب تک اس کو باقی رکھنا ہے۔ تم جلد باز ہو، اس لئے جلدی اس تکلیف کو دور کرانا چاہتے ہو، لیکن اگر اس تکلیف کو کچھ دیر کے بعد دور کیا جائے گا تو اس کے نتیجے میں تمہارے درجات بہت زیادہ بلند ہو جائیں گے۔ لہٰذا تکلیف میں یہ گلہ شکوہ نہیں ہونا چاہئے۔ البتہ یہ دعا ضرور کرنی چاہئے کہ یا اللہ، میں کمزور ہوں۔ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا ہے۔ مجھ سے یہ تکلیف دور فرما دیجئے۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

تکلیف مانگنے کی چیز نہیں کہ آدمی یہ دعا کرے کہ یا اللہ، مجھے تکلیف دے دیں۔ لیکن جب تکلیف آجائے تو وہ صبر کرنے کی چیز ہے۔ اور صبر کا مطلب یہ ہے کہ اس پر گلہ شکوہ نہ کرے۔ چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تکالیف سے پناہ مانگی ہے۔ ایک دعا میں آپ نے فرمایا: یا اللہ، میں آپ سے بُری بُری بیماریوں سے اور بُرے بُرے امراض سے پناہ مانگتا ہوں۔ لیکن جب کبھی تکلیف آگئی تو اس کو اپنے حق میں رحمت سمجھا، اور اس کے ازالے کی بھی دعا مانگی۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مواعظ میں یہ قصہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مجلس میں یہ مضمون بیان فرما رہے تھے کہ جتنی تکالیف ہوتی ہیں، یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت اور انعام ہوتی ہیں۔ بشرطیکہ وہ بندہ اس کی قدر پہچانے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے۔ اس بیان کے دوران ایک شخص مجلس میں آیا، جو کوڑھ کا مریض تھا، اور اس بیماری کی وجہ سے اس کا سارا جسم گلا ہوا تھا۔ مجلس میں آکر حضرت حاجی صاحب سے کہا کہ حضرت، دعا فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ میری یہ تکلیف دور فرما دے، حاضرین یہ سوچنے لگے کہ ابھی تو حضرت یہ بیان فرما رہے تھے کہ جتنی تکالیف ہوتی ہیں، وہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام اور رحمت ہوتی ہیں، اور یہ شخص اس بیماری کے ازالے کی دعا کرا رہا ہے، اب کیا حضرت حاجی صاحب یہ دعا فرمائیں گے کہ یا اللہ اس رحمت کو دور کر دیجئے؟ حضرت حاجی صاحب نے دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے اور فرمایا: یا اللہ، یہ بیماری اور تکلیف جو اس بندے کو ہے، اگرچہ یہ بھی آپ کی رحمت کا عنوان ہے، لیکن ہم اپنی کمزوری کی وجہ سے اس رحمت اور نعمت کے متحمل نہیں ہیں۔ لہٰذا اے اللہ، اس بیماری کی نعمت کو صحت کی نعمت سے تبدیل فرما دیجئے، یہ ہے دین کی فہم جو بزرگوں کی صحبت سے حاصل کی جاتی ہے۔

خلاصۂ حدیث

بہرحال، اس حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت فرماتے ہیں تو اس کو کسی آزمائش میں مبتلا فرما دیتے ہیں۔ اور یہ فرماتے ہیں کہ مجھے اس بندے کا رونا اور اس کا پکارنا، اور اس کا گریہ و زاری کرنا اچھا لگتا ہے۔ اس لئے ہم اس کو تکلیف دے رہے ہیں، تاکہ یہ اس تکلیف کے اندر ہمیں پکارے۔ اور پھر ہم اس پکار کے نتیجے میں اس کے درجات بلند کریں۔ اور اس کو اعلیٰ مقام تک پہنچائیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو بیماری اور تکلیف سے اپنی پناہ میں رکھے۔ اور اگر تکلیف آئے تو اس پر صبر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اس تکلیف میں اپنی طرف رجوع کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

تکالیف میں عاجزی کا اظہار کرنا چاہئے

بعض بزرگوں سے منقول ہے کہ وہ تکلیف میں ہائے ہائے کرتے تھے، اور اس تکلیف کا اظہار کرتے تھے۔ اب بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تکلیف پر ہائے ہائے کرنا اور اس تکلیف کا اظہار کرنا تو بے صبری ہے، اور اس تکلیف پر شکوہ ہے کہ ہمیں یہ تکلیف کیوں دی گئی اور تکلیف پر بے صبری یا شکوہ کرنا درست نہیں، اس کا جواب بھی اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو اللہ کے نیک اور مقبول بندے ہوتے ہیں وہ شکایت کی وجہ سے تکلیف کا اظہار نہیں کرتے، بلکہ وہ فرماتے ہیں کہ مجھے تکلیف اسی وجہ سے دی گئی ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی شکستگی اور بندگی کا اظہار کروں، اور اپنی عاجزی کا اظہار کروں اور اس تکلیف پر ہائے ہائے بھی کروں۔ یہ تکلیف مجھے اسی لئے دی گئی ہے کہ میری آہیں سننا مقصود ہے۔ میری گریہ وزاری سننا مقصود ہے۔ اس لئے اس موقع پر بہادری کا مظاہرہ کرنا ٹھیک نہیں ہے۔

ایک بزرگ کا واقعہ

میں نے اپنے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ ایک مرتبہ ایک بزرگ بیمار پڑ گئے، ایک دوسرے بزرگ ان کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے۔ انہوں نے جا کر دیکھا کہ وہ بیمار بزرگ ''الحمد للہ، الحمد للہ'' کا وِرد کر رہے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ آپ کا یہ عمل تو بہت اچھا ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہے ہیں، لیکن اس موقع پر تھوڑی سی ہائے ہائے بھی کرو۔ اور جب تک ہائے ہائے نہیں کرو گے، شفا نہیں ہوگی، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ تکلیف اس لئے دی ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے حضور گریہ وزاری بھی کریں اور بندگی کا تقاضا بھی یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادر نہ بنے، بلکہ شکستگی اور کمزوری کا اظہار کرے، اور یہ کہے کہ یا اللہ، میں عاجز اور کمزور ہوں، اس بیماری کا متحمل نہیں ہوں، میری یہ بیماری دور فرما دیجئے۔

میرے بڑے بھائی جناب ذکی کیفی صاحب مرحوم، بڑے اچھے شعر کہا کرتے تھے، ایک شعر میں انہوں نے اس مضمون کو بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ فرمایا کہ

اس قدر بھی ضبطِ غم اچھا نہیں
توڑنا ہے حسن کا پندار کیا

یعنی جب اللہ تعالیٰ تمہیں کوئی تکلیف دے رہے ہیں تو اس تکلیف پر اس قدر ضبط کرنا کہ آدمی کے منہ سے آہ بھی نہ نکلے اور تکلیف کا ذرہ برابر بھی اظہار نہ ہو، یہ بھی کوئی اچھی بات نہیں۔ کیا اس کے

ذریعہ اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادری دکھانا مقصود ہے کہ آپ کو جو کرنا ہے کرلیں، ہم تو ویسے کے ویسے ہی رہیں گے ۔۔۔ العیاذ باللہ ۔۔۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کا اظہار کرنا چاہئے۔

ایک عبرت آموز واقعہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ کسی حال میں ان کے منہ سے یہ جملہ نکل گیا۔ جس میں اللہ تعالیٰ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ:

لَيْسَ لِيْ فِيْ سِوَاكَ حَظٌّ

فَكَيْفَ مَا شِئْتَ فَاخْتَبِرْنِيْ

"اے اللہ! آپ کے علاوہ مجھے کسی کی ذات میں کسی کام میں کوئی مزہ نہیں ہے۔
آپ جس طرح چاہیں، مجھے آزما کر دیکھ لیں" (العیاذ باللہ)

گویا کہ اللہ تعالیٰ کو آزمانے کی دعوت دے دی، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا پیشاب بند ہوگیا، اب مثانہ پیشاب سے بھرا ہوا ہے، لیکن خارج ہونے کا راستہ نہیں۔ کئی دن اس حالت میں گزر گئے۔ بالآخر تنبہ ہوا کہ کتنی غلط بات میرے منہ سے نکل گئی تھی۔ ان بزرگ کے پاس چھوٹے چھوٹے بچے پڑھنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ اس حالت میں وہ ان بچوں سے کہتے کہ "اپنے جھوٹے چچا کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ مجھے اس بیماری سے نکال دے"۔

اس لئے کہ اس نے جھوٹا دعویٰ کردیا تھا ۔۔۔ اللہ تعالیٰ نے دکھادیا کہ تم یہ دعویٰ کرتے ہو کہ کسی چیز میں کوئی مزہ نہیں ہے۔ ارے تم کو تو پیشاب کے اندر مزہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادری نہیں چلا کرتی۔

تکالیف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ

لہٰذا نہ تو تکلیف پر شکوہ ہو، اور نہ تکلیف پر بہادری کا اظہار ہو، بلکہ دونوں کے درمیان اعتدال اور سنت کا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب مرض وفات کی تکلیف میں تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس موقع پر آپ بار بار اپنا دست مبارک پانی میں بھگوتے اور چہرے پر ملتے تھے اور اس تکلیف کا اظہار فرماتے۔ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اس موقع پر فرمایا:

"وَاكَرْبَ اَبَاه"

"میرے والد کو کتنی تکلیف ہو رہی ہے"

جواب میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَا كَرْبَ اَبِيْكَ بَعْدَ الْيَوْمِ))
"آج کے دن کے بعد تیرے باپ پر کوئی تکلیف نہیں ہوگی"(۱)
دیکھئے اس میں آپ نے اس تکلیف کا اظہار فرمایا۔ لیکن شکوہ نہیں فرمایا۔ بلکہ اگلی منزل کے راحت و آرام کی طرف اشارہ فرمادیا۔ یہ ہے سنت طریقہ۔
جب حضور اقدس ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کا انتقال ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا:
((اِنَّا بِفِرَاقِكَ يَا اِبْرَاهِيْمَ لَمَحْزُوْنُوْنَ)) (۲)
"اے ابراہیم ہمیں تمہاری جدائی پر بڑا صدمہ ہے"
آپ کی بیٹی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا بچہ آپ کی گود میں ہے۔ آپ کی گود میں اس کی جان نکل رہی ہے۔ آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ اس میں اظہارِ عبدیت اور اظہارِ بندگی ہے کہ اے اللہ! فیصلہ تو آپ کا برحق ہے، لیکن آپ نے یہ تکلیف اسی لئے دی ہے کہ میں آپ کے سامنے عاجزی کا اظہار کروں اور آنسو بہاؤں، گریہ وزاری کروں۔ (۳)
لہٰذا سنت یہ ہے کہ گلہ شکوہ بھی نہ ہو اور بہادری کا اظہار بھی نہ ہو، بلکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہو کر یہ کہے کہ یا اللہ! میری اس تکلیف کو دور فرمادے۔ یہی مسنون طریقہ ہے اور یہی اس حدیث کا مفہوم ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی صحیح فہم ہم کو عطا فرمائے۔ اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.



(۱) صحيح البخاري، كتاب المغازي، باب مرض النبي ووفاته، رقم: ٤١٠٣، سنن ابن ماجه، كتاب ما جاء في الجنائز، باب ذكر وفاته ودفنه، رقم: ١٦١٨
(۲) صحيح البخاري، كتاب الجنائز، باب قول النبي انا بك لمحزونون، رقم: ١٢٢٠، صحيح مسلم، كتاب الفضائل، باب رحمة الصبيان والعيال وتواضعه وفضل ذلك، رقم: ٤٢٧٩
(۳) سنن ابن ماجه، كتاب ما جاء في الجنائز، ما جاء في البكاء على الميت، رقم: ١٥٧٧

نفاق کی علامتیں ☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی ایک حدیث ہے:

"عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ((أَرْبَعٌ مَّنْ کُنَّ فِیْہِ کَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا وَمَنْ کَانَتْ فِیْہِ خَصْلَۃٌ مِنْھُنَّ کَانَتْ فِیْہِ خَصْلَۃٌ مِّنَ النِّفَاقِ حَتّٰی یَدَعَھَا، إِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ، وَإِذَا حَدَّثَ کَذَبَ، وَإِذَا عَاھَدَ غَدَرَ، وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ)) (۱)

''حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: چار عادتیں ایسی ہیں کہ جس شخص میں وہ چاروں جمع ہو جائیں تو وہ خالص منافق ہے، اور جس شخص میں ان چار خصلتوں میں سے کوئی ایک خصلت پائی جاتی ہو تو جب تک وہ اسے چھوڑ نہ دے گا اس وقت تک اس میں نفاق کی ایک خصلت موجود رہے گی۔ (وہ چار خصلتیں یہ ہیں کہ) جب اس کو کسی امانت کا امین بنایا جائے تو وہ خیانت کرے، اور جب باتیں کرے تو جھوٹ بولے، اور جب کوئی معاہدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے، اور جب کسی سے جھگڑا ہو تو بدزبانی پر اُتر آئے''

اس حدیث میں سرکار دو عالم ﷺ نے چار بُری خصلتیں بیان فرما کر انہیں منافق کی نشانی قرار دیا ہے، یعنی کسی مسلمان کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ ان خصلتوں کو اختیار کرے، بلکہ جو شخص ان میں مبتلا ہوگا، وہ قانونی اور لفظی اعتبار سے خواہ مسلمان کہلاتا ہو، لیکن عملی اعتبار سے وہ منافق ہے۔

☆ نشری تقریریں، ص: ۹۳-۹۶

(۱) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب علامۃ المنافق، رقم: ۳۳، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان خصال المنافق، رقم: ۸۸، سنن الترمذی، کتاب الایمان عن رسول اللہ، باب ما جاء فی علامۃ المنافق

ان میں سے پہلی خصلت امانت میں خیانت ہے۔ اس خیانت کی ایک صورت تو وہ ہے جسے سب جانتے ہیں، یعنی یہ کہ کوئی شخص اپنا کوئی مال و متاع یا سامان کسی کے پاس امانت کے طور پر رکھوائے اور وہ اس امانت کو بحفاظت واپس کرنے کے بجائے اس میں خرد برد شروع کردے، یہ تو خیانت کی واضح ترین اور بدترین صورت ہے جسے سبھی گناہ سمجھتے ہیں، لیکن اسلامی تعلیمات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خیانت صرف اسی حد تک محدود نہیں ہوتی، بلکہ خیانت کی بعض صورتیں اور بھی ہیں، مثلاً کسی شرعی عذر کے بغیر کسی شخص کا راز فاش کردینا بھی خیانت ہے۔ ایک حدیث میں رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

((اَلْمَجَالِسُ بِالْاَمَانَةِ)) (۱)

''مجلسیں امانت ہوتی ہیں''

مطلب یہ ہے کہ کسی مجلس میں جو بات کہی جاتی ہے وہ آپ کے پاس امانت ہے، اور شرکاءِ مجلس کی مرضی کے بغیر وہ بات دوسروں تک پہنچانا اس امانت میں خیانت ہے جو کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں۔

اسی طرح جب کوئی شخص کسی جگہ ملازمت کرتا ہے تو اس کی ڈیوٹی کے اوقات اس کے پاس امانت ہیں۔ اب اگر وہ ان ڈیوٹی کے اوقات کو اپنے فرائض کی ادائیگی میں صرف کرنے کے بجائے اپنے ذاتی کاموں میں صرف کرے تو شرعی اعتبار سے یہ شخص بھی امانت میں خیانت کر رہا ہے، اور اس خیانت کو عادت بنالینا کسی مسلمان کا نہیں، بلکہ منافق کا کام ہے۔

حدیث میں نفاق کی دوسری خصلت ''جھوٹ'' بیان کی گئی ہے، جس کی مذمت سے قرآن و حدیث لبریز ہیں، اور ''ایمان'' اور ''جھوٹ'' میں اس قدر زبردست تضاد ہے کہ مؤطا امام مالک میں حضرت صفوان بن سلیم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کسی نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ ''کیا مسلمان بزدل ہوسکتا ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں'' (مسلمان میں یہ کمزوری ہوسکتی ہے)۔ پھر پوچھا کہ ''کیا مسلمان بخیل ہوسکتا ہے؟'' آپ نے فرمایا: ''ہاں'' (مسلمان میں اس کمزوری کا وجود بھی ممکن ہے)۔ آخر میں پوچھا کہ ''کیا مسلمان جھوٹا ہوسکتا ہے؟'' آپ نے فرمایا: ''نہیں!'' (یعنی ایمان کے ساتھ بے باکانہ جھوٹ کی ناپاک عادت جمع نہیں ہوسکتی)۔ (۲)

پھر بعض اوقات تو انسان کے جھوٹ کا اثر اس کی اپنی ذات تک محدود رہتا ہے، اور بعض

---

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الأدب، باب فی نقل الحدیث، رقم: ٤٢٢٦، مسند أحمد، مسند جابر بن عبدالله، رقم: ١٤١٦٦

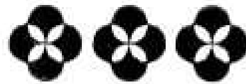
(۲) مؤطا مالك، باب ما جاء فی الصدق والکذب، ص: ١٥٧١

اوقات اس کے جھوٹ سے پورے خاندان، برادری، یا ملک وملت کو نقصان پہنچتا ہے۔ پہلی صورت میں تو یہ محض ایک گناہِ کبیرہ ہے، لیکن دوسری صورت میں بعض اوقات صرف ایک مرتبہ کا جھوٹ کئی کئی سنگین گناہوں کا مجموعہ بن جاتا ہے۔ جھوٹ تو وہ چیز ہے جسے اسلام نے مذاق میں بھی گوارا نہیں کیا، چہ جائیکہ سنجیدگی کے ساتھ اس گھناؤنے جرم کا ارتکاب کیا جائے، اور اس کے ذریعے دوسروں کو نقصان پہنچایا جائے، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے اسے منافق کی نشانی قرار دیا ہے۔

نفاق کی تیسری علامت حدیث میں ''عہد شکنی'' بیان کی گئی ہے۔ مسلمان کا امتیازی وصف یہ ہے کہ جب وہ ایک مرتبہ کوئی عہد معاہدہ کرلے تو جب تک وہ معاہدہ باقی ہے، اس وقت تک ہر قیمت پر اس کی پابندی کرتا ہے، اور اس معاملے میں بڑے سے بڑے نقصان کی بھی پروا نہیں کرتا۔ تاریخِ اسلام ایسے واقعات سے لبریز ہے جن میں مسلمانوں نے صرف اپنا عہد نبھانے کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کیا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے تو صرف عہد شکنی کے خطرے کے پیشِ نظر ایک مرتبہ اپنا ایک مفتوحہ علاقہ رومیوں کو واپس کردیا تھا۔ [1]

نفاق کی چوتھی نشانی حدیث میں یہ بتائی گئی ہے کہ جب کبھی اختلاف اور جھگڑے کی نوبت آجائے تو ایسا شخص بدزبانی اور گالم گلوچ پر اُتر آتا ہے۔ زندگی میں بہت سے لوگوں سے اختلاف پیش آتا ہے، کبھی نوبت جھگڑے تک بھی پہنچتی ہے، لیکن ایک سچے مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ اختلافات اور جھگڑوں کے موقع پر بھی شرافت واخلاق کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ اختلاف خواہ نظریاتی ہو، یا سیاسی، یا خاندانی یا تجارتی، کسی بھی حال میں بدزبانی اور دشنام طرازی مسلمان کا شیوہ نہیں، بلکہ اس حدیث کی رو سے عملی نفاق کی علامت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نفاق کی ان خصوصیات سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.



(۱) سنن الترمذی، کتاب السیر عن رسول اللّٰه، باب ما جاء فی الغدر، رقم: ١٥٠٦، سنن ابی داؤد، کتاب الجهاد، رقم: ٢٥٧٨، مسند أحمد، مسند الشاهین، رقم: ١٦٤٠

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خُطبات وتحریرات

جلد ۲

عبادات کی حقیقت اور احکام

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا مُحمّد تقی عثمانی دامت برکاتہم

اِدارۂ اِسلامیات
پبلشرز، بکسیلرز، ایکسپورٹرز

★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن، مال روڈ، لاہور ★ ۱۹۰، انارکلی، لاہور، پاکستان ★ موہن روڈ، چوک اُردو بازار، کراچی
فون ۳۷۳۲۴۴۱۲، فیکس ۳۷۳۲۴۷۸۵-۴۲-۹۲ فون ۳۷۳۵۳۲۵۵، ۳۷۲۴۳۹۹۱ فون ۳۲۷۴۴۰۰۱

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعۂ خطبات وتحریرات

جلد ۳

اسلام اور حُسنِ معاملات

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات
پبلشرز بکسیلرز ایکسپورٹرز

★ ۱۹۰ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور
فون ۳۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۴۷۸۵

★ ۱۹۰ انارکلی، لاہور پاکستان
فون ۳۷۲۴۳۹۹۱، ۳۷۳۵۳۲۵۵

★ موہن روڈ چوک اُردو بازار، کراچی
فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خُطبات وتحریرات

جلد ۴

اسلام اور حُسنِ معاشرت

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا مُحمّد تقی عثمانی دامت برکاتہم

اِدارۂ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور
فون ۳۷۳۲۴۴۱۲ ۳۷۳۲۴۷۸۵ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۴۷۸۵

★ ۱۹۰ انارکلی، لاہور پاکستان
فون ۳۷۲۲۳۹۹۱ ۳۷۳۵۳۲۵۵

★ موہن روڈ چوک اُردو بازار، کراچی
فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ "اسلام اور ہماری زندگی" انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خُطبات وتحریرات

جلد ۵

اسلام اور خاندانی نظام

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا مُحمّد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات
پبلشرز، بکسیلرز، ایکسپورٹرز

★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور
فون ۳۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۳۷۳۲۴۷۸۵-۴۲-۹۲

★ ۱۹۰، انار کلی، لاہور، پاکستان
فون ۳۷۲۴۳۹۹۱، ۳۷۳۵۳۲۵۵

★ موہن روڈ، چوک اُردو بازار، کراچی
فون ۳۲۷۲۲۴۰۱